سلسلہ اردو اکادمی نمبر ۱۹

آزادی

جان اسٹوارٹ مِل کی تصنیف "لبرٹی" کا ترجمہ

از

مولوی سعید انصاری صاحب بی۔ اے (جامعہ)

مکتبہ جامعہ ملیہ اسلامیہ
قرولباغ، دہلی ۵

فہرستِ مضامین

مقدمہ	از پروفیسر محمد مجیب صاحب، بی۔ اے (آکسن)	۱ تا ۴۶
انتساب	از مصنف	ا
باب اول:۔ دیباچہ		۱ تا ۲۵
باب دوم:۔ آزادیِ خیال و مباحثہ		۲۶ تا ۹۶
باب سوم:۔ انفرادیت بہبودِ انسانی کا ایک ذریعہ ہے۔		۹۷ تا ۱۳۱
باب چہارم:۔ فرد پر جماعت کے اختیارات کے حدود		۱۳۲ تا ۱۶۳
باب پنجم:۔ مثالیں		۱۶۴ تا ۱۹۸

مقدمہ

کچھ اپنی بے پروائی کچھ پرانی تعلیم کی وجہ سے ہم لوگون نے کبھی سیاسی معاملات اور علم سیاست کی طرف کوئی توجہ نہین کی ہو۔ اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ جب مغلیہ سلطنت کا آفتاب ڈوب گیا تو ہم اپنی زندگی مین کسی قسم کی روشنی پیدا نہ کرسکے، اور انگریزون نے ہمارے دیس پر قبضہ کرلیا تو سوائے ایک بیڈ ھنگے ہنگامہ کے ہمین اور کچھ نہ سوجھا۔ ہم موقع پر خوشامد کرنا، خطرہ کے وقت دروازہ بند کرلینا ضرور جانتے تھے، اپنی عزت و آبرو بچانے کیلئے لڑنے والے بھی پرانے زمانے مین بہت ملجاتے تھے، مگر ہم کو اپنی تاریخ مین کوئی ایسا واقعہ نہین ملتا جب ہماری قوم نے سیاسی معاملات یا حکومت مین حصہ لینے کی کوشش کی ہو، یا مجموعی حیثیت سے اپنی عزت و آبرو باقی رکھنے کا ثبوت دیا ہو۔ اپنے اور اپنے عزیزون کے فائدہ کے علاوہ کسی کو کوئی فکر نہ تھی، ہم کبھی قوم اور دیس کے کسی تصور مین نہ سمائے۔ لیکن وہ زندگی کیا ہے، جس مین ہم آفتون سے بچنے کی دعائیں مانگا کریں، وہ ملک کیا ہے جس مین ہم چورون کی طرح رہین، ڈرتے ڈرتے اور سنبھل سنبھل کر اس طرح چلین، جیسے کوئی پرائے سے آنکھ بچا کر گذرتا ہے۔ مانا کہ جسے یورپ کی قومین سیاسی زندگی کہتی ہین، ہمارے یہان ایک طرح کا جوا تھا جس کے کھیلنے کی جرأت صرف چند لوگون کو ہوسکتی تھی۔ شیر کے منہ مین کوئی ہاتھ نہین ڈالتا، سمندر کا سفر کوئی تختہ پر کرتا ہے۔ قوم کی خدمت بادشاہ کے ذریعہ ہی سے ہوسکتی تھی،

اور اوس تک پہونچنے کی جو لوگ کوشش کرتے تھے وہ عام طور سے دربار اور درباریون مین پھنس کر رہ جاتے، یا اگر خدمت شاہی مین پہونچ بھی گئے تو بادشاہ کا خوش رکھنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ جو چوکا اوس کی عزت بھی گئی اور جان بھی، پھر کیا تعجب ہی کہ سمجھدار لوگ سیاسی زندگی سے بھاگتے رہتے تھے، اور جوا کھیلنا صرف جواڑیون پر چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اگر ہماری سیاسی زندگی ایک بھنور کی سی تھی تو اوس کے ذمہ دار ہم ہی ہین۔ بادشاہ اور ان کی تنک مزاجی کچھ ازل سے ہماری قسمت مین نہین لکھی تھی، اور اگر اونھون نے ہماری زندگی کو بے مزہ کر دیا تھا تو ہمارا فرض تھا کہ ہم اون کو دور کرین۔

یورپ کی قومون کا ہم پر جو اعتراض ہے وہ واقعی صحیح ہی۔ ہم مین تنقید اور انکار کا مادّہ بالکل نہین، نہ ہماری طبیعت مین وہ خود مختاری ہی کہ زندگی کو اپنی آنکھون دیکھین اور اپنے تجربے اور فکر سے سمجھین، نہ وہ ہٹ اور ضد کہ جو دل مین ٹھان لین اوس پر قائم رہین چاہے رگون مین ایک قطرہ خون باقی نہ رہے، نہ وہ جرأت کہ اپنی کمزوریون کا اقرار کرین اور صداقت کیلئے لڑنے کا بیڑا اوٹھائین۔ جو کچھ ہونا ہے ہوگا، جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا، جو کچھ ہے اُسے رہنے دو، یہی ہمارا فلسفہ ہے۔ اچھائی اور بُرائی کا سوال ہمارے سامنے آتا بھی ہے تو ہم کترا کر کسی نہ کسی طرح نکل جاتے ہین۔ بجائے اپنے راستے سے پتھر ہٹانے کے پتھر کو دیکھ اپنا راستہ بدل لیتے ہین۔ ہم کو کبھی یہ نہ سوجھا کہ بادشاہت حکومت کرنے کا ایک طریقہ ہے اور اگر اوس سے فائدے کی بہ نسبت نقصان زیادہ ہے تو ہمّت کر کے دوسرے طریقے بھی آزمانے چاہئین۔ ہم نے یہ طے کر لیا کہ اس کے سوا اور کوئی چارہ نہین۔ بعض نے بادشاہون کے سامنے گردن جھکا لی، چاہے اوس پر تلوار پڑے چاہے پھولون کا ہار۔ بعض نے "عقلمندی" کی اور اس جھگڑے سے الگ رہے۔ ہم ہر قسم کے لگان اور محصول دیتے چلے آئے ہین،

لیکن کبھی اِس کی فکر نہ کی کہ ہمارا یہ روپیہ کیسے خرچ ہوتا ہے، اوس میں سے ہم کو کتنا واپس ملتا ہے اور کس صورت سے ہم صرف افسوس کرتے رہے اور دیتے رہے زبان سے ہماری سوائے تعریف اور شکریہ کے کبھی کچھ نہ نکلا۔ کبھی ہم نے نہ اپنی رائے کسی بات پر ظاہر کی نہ کسی چیز پر اعتراض کیا۔ اپنی حکومت تھی تب یہ حال تھا، پرایا راج ہے تب بھی وہی کیفیت ہے۔

جس قوم کیلئے سیاسی آزادی حاصل کرنا ممکن تھا، اوس کے مختلف افراد سے یہ توقع کرنا کہ وہ اپنی زندگی پر اپنی طبیعت اور خیالات کی مہر لگائیں گے یا شخصی آزادی کیلئے لڑیں گے، بالکل بے کار ہے۔ میدان جنگ میں شہید ہونا آسان ہے، وہاں ایک مرتبہ مرنا ہوتا ہے اور وہ بھی جلد۔ ایک آدرش یا نصب العین کے پیچھے تمام عزیزوں دوستوں اور پوری سماج سے مقابلہ کرنا بہت زیادہ دشوار ہے۔ اس میں ہر گھڑی لڑائی جاری رہتی ہے، اور مرنا نہیں بلکہ ہر حالت میں زندہ رہنا شرط ہے۔ مگر آزادیِ افراد دینی اور دنیاوی صحت کیلئے سیاسی آزادی سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ اسے زندگی کا نمک سمجھئے جس کے بغیر سب بے مزہ ہو جاتا ہے، اور ترقی کا ہونا یا نہ ہونا اسی پر مبنی ہے، جیسے پودوں کا بڑھنا یا مرجھانا اون کے سینچنے پر۔ اِس زمانہ میں سیاسی آزادی کی اہمیت کا اقرار عام طور سے لوگ کرتے ہیں، مگر اس کے ساتھ ہی یہ غلط فہمی بھی ہو رہی ہے کہ سیاسی آزادی کافی ہے اور سوراج ملنے پر ہماری سب امیدیں پوری ہو جائیں گی۔ مِل نے اپنی کتاب اِسی غلط فہمی کے دور کرنے کیلئے لکھی تھی، اور اس زمانہ میں مِل کے خیالات پر غور کرنا خاص طور سے ضروری ہے۔

مِل نے سیاسی آزادی پر بحث نہیں کی ہے۔ وہ یہ نہیں دکھانا چاہتا کہ ہر قوم کو اپنی حکومت خود کرنا چاہیئے۔ اِس نے یہ فرض کر لیا ہے کہ قوم آزاد اور خود مختار ہے،

جیسے کہ انگلستان کی حکومت اس زمانہ مین تھی۔ اور اس کتاب مین وہ یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ محض سیاسی آزادی کافی نہین، اور قومین اوسی وقت ترقی کر سکتی ہین جب وہ آزادی فرد کا بھی پورا خیال کرین۔ اور اگر اس معاملہ مین اونھون نے کچھ کمی کی تو بادشاہت اور جمہوریت مین کوئی فرق نہین، اور سیاسی آزادی ایک بالکل بے معنی شے ہی، تاریخ سے اگر ہم کوئی سبق سیکھ سکتے ہین تو وہ یہی ہے کہ ترقی خود بخود نہین ہوتی، بلکہ وہ چند باہمت شخصیتون کی یادگار ہے، ایک تحفہ ہے جو اونھون نے اپنی قوم کی نذر کیا ہے، ایک پودا ہے جسے اونھون نے اپنے خون سے سینچ سینچ کر پروان چڑھایا ہے۔ چنانچہ مورخون کا ایک خاص فرقہ ہے جو تاریخ کو صرف بڑی شخصیتون کی سوانح عمری قرار دیتا ہے۔ اور کچھ فلسفی بھی ایسے گذرے ہین جو ساری زندگی کو انہی شخصیتون کا دین سمجھتے ہین۔

اِن مورخون اور فلسفیون نے اپنی پسندیدہ شخصیتون کی عظمت دکھانے کیلئے واقعات کو بے شک بہت کچھ توڑا مروڑا ہے، لیکن اون کے اصل دعوی سے انکار نہین کیا جا سکتا۔ دنیا مین جو کچھ ہوا ہے وہ معمولی لوگون یا عام رائے کے ذریعہ سے نہین بلکہ زیادہ تر معمولی لوگون کے باوجود اون کی رائے کے خلاف ہوا ہے۔ جہان کارلائل اپنے ہیرو کو پوری شان و شوکت کے ساتھ تعریف اور تعجب کے لیے ہمارے سامنے پیش کرتا ہے اور نیٹشے، زردشت کو عقل کُل قرار دیکر ہم کو ہماری حماقتین سمجھاتا ہے، وہان مِل کی یہ کوشش ہے کہ ایسی شخصیتون کے استقبال کے لیے ہم کو آمادہ کرے اور اون کی آمد کے لیے راستہ صاف کرے۔ فرق اِن تینون مین صرف اتنا ہی کہ کارلائل بہ حیثیت مورخ کے جو شخصیتیں گذر چکی ہین اون کی اہمیت دکھاتا ہے اور عام لوگون کی بزدلی اور عیسائی مذہب کی مجہولیت سے عاجز آکر انسان کامل کا خواب دیکھتا ہے، اور مِل بجائے اِن

دونوں کی طرح بلند پروازی کرنے کے سماج کو اس کا قائل کرانا چاہتا ہے کہ وہ ہر شخص کو وہ آزادی دے جو اوس کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔

جو آزاد نہیں وہ انسان نہیں، جس کو ہم پوری آزادی دینے سے انکار کرتے ہین اوس کو ہم پورا انسان نہین سمجھتے، یہی مل کی کتاب اور مل کے خیالات کا جوہر ہے۔ مل کے نزدیک آزادی انسان کی ان خاصیتون مین سے ہے جن کے بغیر وہ انسان نہین ہو سکتا کیونکہ یہی اور تمام خاصیتون کو حرکت مین لاتی ہے۔ انسان کو خدا نے سمجھ دی ہے، لیکن اگر وہ اپنی سمجھ سے کام نہ لے یا دوسرے اُسے کام نہ لینے دین تو اُس مین اور دوسرے جانورون مین کوئی خاص فرق نہین رہتا۔ یہ ضرور صحیح ہے کہ اگر لوگ اپنی سمجھ پر چھوڑ دیے جائین تو ہزارون غلطیان اور حماقتین کرین گے، لیکن ہمارا فرض ہے کہ ان لوگون کو اون کے حال پر چھوڑ دین اور زبردستی اون کو راہ راست پر لانے کی کوشش نہ کرین۔ آدمی کو جانور بنا دینا دوسرون کے لئے ممکن ہے، انسان صرف اپنی ذاتی کوشش اور فطرت کی دی ہوئی قابلیت کے استعمال سے ہو سکتا ہے۔

جتنا ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہین اوتنا ہی ہم کو اس کی سچائی اور اہمیت کا اقرار کرنا ہوتا ہے۔ مسلمان عام طور سے اسکی شکایت کرتے ہین کہ آج کل لوگون مین وہ مذہبی جوش نہین رہا، جو ایک زمانہ مین تھا، اور جو ہر مسلمان مین ہونا چاہیئے۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ طالب علم اگر ایک روز ہاکی کھیلنے نہ جائے تو کسی کو خبر نہین ہوتی۔ نماز مین غیر حاضر ہو تو اُستاد خفا ہوتا ہے۔ لیکن ہاکی اور دوسرے ورزش کے کھیلون کی سب تعریف کرتے ہین، اون سے جو فائدہ ہے وہ اسے سمجھاتے ہین، لیکن نماز کے بارے مین

صرف یہ کہدینا کافی خیال کیا جاتا ہے کہ خدا کا حکم ہے، قرآن مجید مین اسکا ثبوت موجود ہے کھیل اور ورزش کی طرف رغبت ولائی جاتی ہے، لڑکے تجربہ سے معلوم کرتے ہین کہ یہ ہر لحاظ سے اون کے لیئے فائدہ مند ہی، لیکن مذہب کے معاملہ مین اون کو اپنے تجربہ پہ چھوڑنا اون کے لیئے خطرناک سمجھا جاتا ہی، دین اگر انسان کے لیئے کوئی اہمیّت، ایمان لانا کوئی معنی رکھتا ہے، تو اس مین کیسی قسم کی زبردستی کرنا غلط ہے۔ مذہب کا نام چاہیے جو کچھ ہو، سچا وہ اوسی وقت ہے جب انسان نے اپنے تجربہ سے اوسے ایسا ثابت کیا ہو۔ اس سے انکار کرنا گویا اپنے دین وایمان سے یا اپنی انسانیت سے انکار کرتا ہے۔

جہان تک کہ آزادیِ خیال اور بحث کا تعلق ہے، مِل ایسے اصول اور ایسی دلیلین پیش کرتا ہے، اور ایسے صدق دل سے اور خلوص سے کہ اس کی مخالفت کرنا ناممکن ہی۔ ہم کو بجائے اوس کی منطق مین کمزوریان اور غلطیان ڈھونڈھنے کے اوس سے اپنی آزادی اور اپنی انسانیت کی وقعت کا سبق لینا چاہیئے۔ تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے ہم کو یہ معلوم ہو جائیگا کہ ترقی اونھین کا حصّہ ہے جن کو اپنے اوپر اور اپنی عقل اور سمجھ پر کافی اعتبار ہوتا ہے۔ لیکن کیسی نہ کیسی وجہ سے آزادی لوگون کو ہمیشہ ڈراؤنی شکلون مین نظر آتی ہے۔ بچون کو مذہب کے معاملہ مین آزادی دیدی گئی تو اون کے دلون مین ذرہ برابر بھی دین وایمان باقی نہ رہے گا۔ اون کی اتنی سمجھ نہین کہ وہ راہ راست پر چل سکین، یا بھلے اور برے مین فرق کر سکین، جو ایسی دلیلین پیش کرتے ہین اُن سے اوّل تو پوچھنا چاہیئے کہ یہ ایمان کیسا ہے جس مین اتنا اثر بھی نہین۔ اور وہ ماننے والے کیسے ہین کہ نہ خود دوسرون کو عبرت دلا سکتے ہین، نہ اتنا اعتبار اپنے

مذہب پر رکھتے ہین کہ اوسے سچا ثابت ہونے کا موقع دین۔ عورتون کے آزاد ہونے سے بھی لوگ اسی طرح گھبراتے ہین، جو خامیان ان کے اخلاق اور ان کی طبیعت مین ہین، وہ عورتون پر تھوپ دی جاتی ہین، اور جہان اون کو اپنی اخلاقی صحت کا خیال کرنا چاہیے وہان وہ دوسرون کے بیمار ہونے پر اصرار کرتے ہین۔ لیکن ظاہر ہے کہ عورتون کی آزادی کے خلاف اِس قسم کی دلیلین پیش کرنا عین بداخلاقی ہے، اور کسی توجہ کے قابل نہین۔

اگر ہم نے آزادیِ خیال کی ضرورت کا اقرار کیا تو ایک حد تک آزادیِ افعال سے بھی ہم انکار نہین کرسکتے دوسرون کو نقصان نہ پہونچے، یہ تو ہمیشہ شرط رہے گی، لیکن ایک خاص دائرے کے اندر ہر شخص کو پوری آزادی ملنی چاہیے۔

مِل نے اِس مسئلہ پر بحث کرتے وقت صرف حکومت ہی کے دخل کو مد نظر نہین رکھا ہے بلکہ سماج اور برادری جو ظلم اس معاملہ مین کرتی ہین اوس پر بھی اوس نے کافی زور دیا ہے۔ ڈرنے والے آزادیِ افعال ہی سے زیادہ ڈرتے ہین اور یہین پر آزادی پسند لوگون کی زیادہ مخالفت ہوتی ہے۔ اگر محض گفتگو مین ایک مسلمان لڑکا عیسائی مذہب کی تعریف کرے تو باپ اوس سے اسقدر ناراض نہین ہوگا، لیکن اگر وہ عیسائی ہوجائے تو باپ بیٹے مین کسی قِسم کا رشتہ قایم رہنا مشکل ہے۔ ایسے معاملہ مین ریاست یا حکومت عام طور سے دخل نہین دیتی۔ یہان پر جو لڑائی ہوتی ہے وہ سماج اور فرد کے درمیان ہوتی اور یہین پر آزادیِ فرد کی حفاظت کرنا سب سے زیادہ مشکل اور ضروری کام ہوجاتا ہے۔

آزادیِ افعال کی تائید مین نئی دلیلین پیش کرنا بیکار ہے، اور جب فرد اور سماج مین مخالفت ہوتی ہے تو معاملہ بحث کے ذریعہ سے نہین بلکہ باغی افراد کی جرأت کے

مطابق سطے ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے مِل اِس قدر جوش کے ساتھ سماج کو اطمینان دلاتا ہے
کہ بجز تجربہ کے راہِ راست تلاش کرنے کا کوئی طریقہ نہین، اور لوگون کو جستجو اور
دریافت کی اجازت دینے سے کسی کا نقصان نہین ہوتا۔

اگر مِل خیالات اور افعال کی آزادی کی حمایت کرتا ہے تو اوس کا یہ مقصد
نہین ہے کہ لوگ اچھائی اور برائی مین فرق کرنا چھوڑ دین، یا بد اخلاقی اختیار کرلین اور
نہ وہ یہ چاہتا ہے کہ سماج لوگون کے ذاتی معاملات مین دلچسپی دے' یا ان کے اخلاق پر
رائے زنی نہ کرے۔ اوس نے زندگی کا خاص مقصد ہر قسم کی روحانی اور جسمانی، دینی
اور دنیاوی ترقی کو مقرر کیا ہے۔ یہ ترقی اوسی وقت ہوسکتی ہے جب سماج اپنے ارکان کو
اِس قدر آزادی دے کہ وہ تجربہ اور تخیل کے ذریعہ سے ترقی کا راستہ تلاش کرسکین۔
سماج کو چاہیئے کہ نرالے پن، کجروی، خود مختاری، بے قاعدگی کو بجائے اپنے قواعد
و قوانین کے خلاف بغاوت خیال کرنے کے اپنی بھلائی کی کوشش سمجھے۔ اپنے ان
ارکان کی جو یہ راستہ اختیار کرین، زندہ دلی اور جرأت کی داد دے۔ اوس کی التجا
یہ ہے کہ اگر سماج کی عام رائے اور معمولی قواعد کے مطابق کوئی شخص نہین چل رہا ہی،
تو سماج اپنے آپ کو سرو گیانی یا ہمہ دان قرار دے کر اس شخص پر کسی قسم کی زبردستی
نہ کرے، کیونکہ سماج کے ہر رکن کو اپنے آپ کو انسان سمجھنا اور دوسرون کے انسان
ہونے کا اعتراف بھی کرنا چاہیئے۔ تاریخ ہم کو دکھاتی ہے کہ لوگون کے خیالات بدلتے
ہین، اون کے علم اور تجربہ کا دائرہ بڑھتا رہتا ہے، اور انسان کی فطرت کا تقاضا
بھی یہی ہو، اسلیئے ہم کو اپنی ریت رسم اور خیالات و افعال کو لوہے کا ڈھانچا

نہ بنالینا چاہیے جس میں سے سماج کے تمام افراد ایک طرح کے ڈھلے ہوئے نکلیں، بلکہ تجربہ اور عقل سے امتحان لیتے رہنا اور ضرورت کے مطابق انھیں بدلتے رہنا چاہیے۔

علم سیاست پر بہت سے فلسفیوں، مدبروں اور سائنس دانوں نے بحث کی ہے لیکن اصل اہمیت اس علم کو صرف چند شخصیتوں نے دی ہے جنھیں نہ فلسفی کہا جاسکتا ہے، نہ مدبر و سائنس داں۔ ان کے پاس نہ ایک پُر درد دل کے سوا کوئی سرمایہ تھا نہ ایک پُرجوش محبت کے علاوہ ان کا کوئی سفارشی۔ اگرچہ سیاسیات میں اس قسم کے مصنفوں کا بہترین نمونہ روسو ہے، اور اگرچہ مِل ایک زبردست عالم اور فلسفی بھی تھا، پھر بھی جس اثر میں یہ کتاب لکھی گئی تھی وہ دل کا ہے دماغ کا نہیں۔ جس شخص کو اپنے ہمجنسوں سے محبت ہے، جس کو اپنی روحانی اور باطنی زندگی کی فکر ہے، جس کے دل میں اپنی قوم کی فلاح و بہبود کی سچی خواہش ہے، وہ اس کتاب کی عزت کریگا اور اس کی خامیوں کے باوجود بھی اس سے محبت کرتا رہے گا۔

مِل ۲۰ مئی ۱۸۰۶ء کو لندن میں پیدا ہوا، اور ۸ مئی ۱۸۷۳ء میں جنوبی فرانس کے شہر آوی نیون میں اس کا انتقال ہوا۔ اُس کی زندگی میں وہ سارا زمانہ آجاتا ہے جس کے علمی، سیاسی اور ادبی کارنامے انیسویں صدی کو ایک خاص اہمیت دیتے ہیں، اور مِل کی شخصیت ایسی تھی اور اس کی تعلیم اس طور پر ہوئی تھی کہ وہ ہر قسم کی تحریکوں میں پورا حصہ لے سکا۔

جس زمانہ میں بچے کھیل کود میں مشغول رہتے ہیں، مِل نے یونانی اور روسی زبان سیکھ لی تھی۔ لڑکپن میں اُس نے قدیم ادب سے پوری واقفیت حاصل کرلی، اور

بیس برس کی عمر تک اُس کی معلومات جدید علوم میں بھی اس قدر ہو گئی تھی کہ وہ بخوبی ان مسائل میں بھی رائے دے سکتا تھا جو اس زمانہ کے روشن خیال اور قوم پرست لوگوں میں زیر بحث تھے۔ اس کی تعلیم اس کے باپ جیمز مل نے اپنے ذمہ لے لی تھی اور شروع سے مل کو علمی، سیاسی اور معاشی نظریوں اور ان کو عمل میں لانے کے طریقوں سے صرف سچی دلچسپی ہی نہیں بلکہ ان کو اپنی دریافت کے ذریعہ سے ترقی دینے کی قابلیت بھی اس میں پیدا ہو گئی تھی۔ جیمز مل علاوہ عالم ہونے کے سیاسیات، اخلاقیات اور معاشیات میں اپنے ذاتی عقیدے بھی رکھتا تھا اور مل کی پرورش انھیں عقیدوں میں ہوئی، باوجودیکہ جیمز مل کی یہ خواہش تھی کہ اس کے خیالات کا پرچار اس کے لڑکے کے ذریعہ سے ہو مگر وہ یہ کسی طرح سے نہیں چاہتا تھا کہ مل انھیں بغیر سوچے سمجھے یاد کرلے۔ اس کا ہر وقت اس پر اصرار رہتا تھا کہ مل اپنے عقیدوں کے نئے نئے ثبوت دریافت کرتا رہے اور اپنی تعلیم کو تنگ نظری یا تعصب کی وجہ سے ناپسند یا بے کار نہ بنا دے۔

اسی وجہ سے کہ بچپن اور جوانی میں اس کا تعلق جیمز مل، ریکارڈو اور بنتھم سے تھا، مل کو وہ حیثیت مل گئی جو بہت کم کو نصیب ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنے زمانہ کے خیالات اور تحریکوں سے واقف ہی نہیں تھا بلکہ اپنے سے ایک قرن پہلے کے خیالات کا بھی خزانہ اپنے دماغ میں رکھتا تھا۔ ایڈم سمتھ اور ریکارڈو کی معاشی تعلیم، بنتھم کی افادیت، اٹھارھویں صدی کے آخری حصہ کی دینیات، فلسفہ، منطق سب مل کے ہاتھوں میں تکمیل پاتی ہیں، اور وہ صورت اختیار کر رہی ہیں جو اس زمانہ کے تخیل کے لیے مخصوص ہے۔ مل ان تمام لوگوں کا جیسے بڑھاپے میں نمائندہ تھا، ویسے ہی اب بھی ہے۔ اگر ہمیں

اس زمانہ کے تخیل کی کسی شاخ سے واقفیت پیدا کرنی ہو تو ہمیں مل کی کتابیں پڑھنا ضروری ہوں گی کیونکہ مل ہی نے اس تخیل کو ترتیب دیا' اور پچاس برس کے تجربہ کے بعد جو کاٹ چھانٹ ضروری تھی وہ بھی اسی کے ذریعہ سے ہوئی۔

مل نے اپنی آنکھوں کے سامنے زندگی کی صورت بدلتی دیکھی۔نئی مشکلات، نئے سوالات پیش ہو رہے تھے، تجربہ ہر طرف نئے سبق سکھا رہا تھا۔ جب مل نے اپنی تعلیم مکمل کرکے علمی دنیا میں قدم رکھا' اس وقت فرانسیسی انقلاب میدان جنگ میں شکست کھا کر یورپ کی سیاست پر رفتہ رفتہ اپنا اثر ڈالنے لگا تھا' یورپ کے تمام ملکوں میں آزادی پسند لوگوں کی تعداد بڑھ رہی تھی، جمہوری حکومت کی خواہش ہر جگہ پیدا ہو رہی تھی۔ جس زمانہ میں مل نے سیاسی معاملات پر اپنی کتاب "آزادی" لکھی اس وقت بالکل دوسری حالت تھی۔ انگلستان میں ۱۸۳۲ء کے "قانون اصلاحات" نے سیاسی مسائل کو بالکل دوسری صورت دیدی تھی اور جہاں شروع میں لوگ پارلیمنٹ کو چند رؤسا اور زمینداران کے قبضہ سے نکالنے کی فکر میں تھے، مل کو ۱۸۵۹ء میں یہ اندیشہ ہو رہا تھا کہ کہیں جمہوریت کے راج میں شخصیت نہ تباہ ہو جائے۔ یورپ میں انقلابی جوش بہت پیدا ہو گیا تھا اور جہاں ۱۸۱۵ء کی ویانا کی کانگریس میں تمام ریاستوں میں انقلاب اور انقلابی اصولوں کی مخالفت کا بیڑا اٹھایا تھا وہاں ۱۸۴۸ء میں انقلاب کے طوفان نے قریب قریب ہر ریاست کی کشتی کو ڈبو دیا تھا۔

جس دنیا کی ضرورتوں کے لحاظ سے مل کو معاشیات کی تعلیم دی گئی تھی وہ بھی مل کے بڑھاپے میں بدل گئی تھی۔ صنعت و حرفت کے انقلاب کے شروع میں تجارت اور تاجروں کو آزادی کی ضرورت تھی، سرمایہ دار اور مزدور کے تعلقات، اگرچہ وہ

اچھے کبھی نہیں تھے پھر بھی اس زمانہ میں وہ سماجی اور سیاسی اہمیت نہیں رکھتے تھے جو بعد کو انھیں حاصل ہوئی۔

اخلاقیات میں مل اپنی تعلیم کے لحاظ سے افادی تھا۔ بنتھم کے افادی اصول جبتک کہ انگلستان میں قانونی سدھار کی گنجائش رہی اپنی سچائی اور فائدہ مندی کا ثبوت دیتے رہے جب مل نے افادیت پر اپنی کتاب لکھی قانونی سدھار کی تکمیل ہوچکی تھی۔ پارلیمنٹ نے بھی اپنے دروازے کھول دئے تھے۔ افادیت کو اب یا تو آثار قدیمہ میں شامل کرنا، یا اسے ایک مستقل اخلاقی اصول ثابت کرنا تھا۔

مل میں نہ عقیدہ کی کمزوری تھی کہ وہ ایسے اصولوں کو جنھیں اس نے زندگی بھر صحیح اور سچا سمجھا تھا لوگوں کے اعتراض کی وجہ سے چھوڑ دے، اور نہ اتنا تنگ نظر یا متعصب تھا کہ جو خامیاں اسے اپنے عقیدہ میں نظر آئیں ان کا اقرار نہ کرے یا ان کو دور نہ کرے۔ لیکن وہ خیالات اور عقیدے جن میں اس نے پرورش پائی تھی، اُسے ناکافی معلوم ہوتے رہے اور اگر ہم اس کی تصانیف کا ان مضامین سے مقابلہ کریں جو اس نے جوانی میں لکھے تھے تو ہم پر ظاہر ہو جائے گا کہ اس کے خیالات میں کیسی تبدیلیاں ہوتی رہیں لیکن مجموعی حیثیت سے مل اسی زمانہ کا نمائندہ رہا جس میں اس کی پرورش ہوئی تھی، اور ہمارے لئے یہی اسکی خاص اہمیت ہے۔ اسکا تخیل ایک کڑی ہے جو زمانوں کے خیالات کو جوڑتی ہے، ایک بلندی ہے جس پر سے ہمیں نئی اور پرانی دنیا دونوں نظر آتی ہیں۔ مل نے ایک عمر کے خیالات جذب کر کے دوسری پشت کو سمجھائے اور جو تبدیلیاں زمانہ نے پیدا کر دی تھیں ان کی پوری داد دی۔

اوپر عرض کیا گیا ہے کہ بنتھم کی افادیت کے لئے جب "قانون کے سدھار" کی

تکمیل ہو چکی، اس وقت علمی دنیا میں کوئی خاص کام باقی نہیں رہ گیا، اور اس پر ہر طرف سے اعتراض ہونے لگے، کیونکہ اس کے حامیوں نے اس کے ایک دائمی اخلاقی اور سیاسی اصول ہونے کا دعویٰ کیا، افادیت کو جو خالص بنیادی رنگ بنتھم اور اس کے ہم خیال لوگوں نے دیا تھا اس کی وجہ سے وہ کسی طرح ایک اخلاقی اصول نہیں بن سکتا تھا،[لہ] اور ہم دیکھتے ہیں کہ اپنی "افادیت" میں اور ایک دو جگہ "آزادی" میں بھی مل افادیت کو اس قدر مادی نہیں بناتا۔" ایک غیر مطمئن سقراط ایک مطمئن بیوقوف سے اچھا ہے"۔ اس ایک جملہ میں اس نے تمام اعتراضات کو تسلیم کر لیا جو افادیت پر کیے گئے تھے، لیکن افادیت کا وہ پھر بھی قائل رہتا ہے جیسا کہ "آزادی" میں اس نے لکھا ہے کہ "اخلاقیات کے تمام مسائل میں میں افادہ کو سب سے آخری معیار سمجھتا ہوں" یعنی "اخلاقی تعلیم میں میں ہمیشہ اس کا خیال رکھوں گا کہ لوگوں کو اس سے فائدہ بھی پہنچتا ہے یا نہیں، اور اگر ہے تو کتنوں کو"۔ افادیت آج کل ایک پرانی خیالی عمارتوں میں شمار کی جاتی ہے لیکن لوگ اس کی تاریخی اہمیت اور اس کی خدمات کا اقرار بھی کرتے ہیں اور اس کی بڑی وجہ مل کی شخصیت ہے۔

ہم اگر ایک اور مثال کے طور پر ایڈم اسمتھ کے چند نظریے لیں تو مل کا اثر اور اس کی

لہ افادیت کی ساری تعلیم بنتھم کے اس مشہور جملہ میں موجود ہے "زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ بھلائی" لیکن ہر شخص اپنی بھلائی کی تعریف اپنے طور پر کرتا ہے اور جس سے ایک کو فائدہ ہوتا ہے دوسرے کو نقصان پہنچ سکتا ہے، مگر افادیت کے حامیوں کی رائے میں یہ معلوم کرنا ممکن تھا کہ کس چیز سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ آسائش ہوتی ہے۔ انھوں نے اس سلسلہ میں آسائشوں کی ایک فہرست بھی تیار کی تھی جو Hedonistic Calculus کے نام سے مشہور ہے

حیثیت علوم کی تاریخ میں ہمیں اور صاف نظر آنے لگے گی۔ ایڈم اسمتھ "آزاد تجارت" کا بڑا حامی تھا، اور اس کے خیال میں ریاست کے لئے سب سے مناسب پالیسی یہ تھی کہ وہ معاشی معاملات میں دخل نہ دے، لیکن پارلیمنٹ نے ۱۸۱۵ء سے یہ کوشش کی کہ قانون کے ذریعہ سے اناج کا بھاؤ اونچا رکھے۔ صرف اس وجہ سے کہ پارلیمنٹ پر زمینداروں کا بہت اثر تھا اور اس طرح سے ملک میں کئی سال تک ایک مصنوعی قحط رہا۔ اس حرکت نے "آزاد تجارت" کے حامیوں کو اپنے عقیدے میں اور مضبوط کر دیا، اور بجائے حکومت کی چند حرکتوں کی مخالفت کرنے کے روشن خیال لوگ عام طور سے حکومت کی مداخلت ہی کے دشمن ہو گئے اور جو تحریک چند معاشی قوانین کی مخالفت کے لئے شروع ہوئی تھی اس نے ایک سیاسی نظریہ کی حیثیت اختیار کر لی جو ۱۸۵۰ء سے کوئی پندرہ برس کے عرصہ میں ایک عام عقیدہ بن گئی اور جو اب بھی ایک حد تک قائم ہے۔ اس تحریک کی بنیاد دراصل حکومت کی طرف سے بدگمانی تھی، پارلیمنٹ پر چند با اثر لوگوں کا قبضہ تھا جو اپنی اغراض اور اپنے فائدے کے مطابق قانون پاس کراتے تھے۔ انہی "خود غرضانہ مفاد" کی مخالفت بنتھم کو بھی کرنی پڑی تھی، یہی لوگ باوجود قوم کی کوششوں کے تجارت کی آزادی پر راضی نہیں ہوئے تھے، یہی لوگ مزدوروں کی خراب حالت دیکھ کر بھی ان کو زبردستی اسی مزدوری کے نرخ پر مجبور کرنا چاہتے تھے اور انہی لوگوں نے ٹریڈ یونین وغیرہ کو خلاف قانون قرار دیا تھا تاکہ مزدوروں کے پاس مزدوری بڑھانے کا کوئی ذریعہ باقی نہ رہے۔ ان سب باتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا لیکن رفتہ رفتہ پارلیمنٹ ان لوگوں کے اثر سے نکل رہی تھی۔ حکومت کی بنیاد قوم کی رضامندی قرار پائی اور اس کا مقصد قوم کی فلاح وبہبود تھا۔ تجربہ نے یہ دکھا دیا تھا کہ بہت سے معاملات

بغیر حکومت کی مداخلت کے نہیں طے ہو سکتے۔ سیاسی زندگی کے بہت سے فرائض تھے جو صرف حکومت پورے کر سکتی تھی اور اس لئے اس کی طرف سے بدگمانی رکھنا اپنے آپ کو نقصان پہنچانا تھا اس مسئلہ میں بھی مل گذشتہ موجودہ اور آیندہ کو پیوستہ رکھتا ہے۔ اس کے زمانہ کا عام رجحان، اگر ہم ہربرٹ اسپنسر کے نظریوں کو انفرادیت کی انتہا قرار دیں، جیسا کہ واقعہ ہے، انفرادیت کی طرف تھا۔ اس سے پہلے یا تو سیاسی معاملات کی طرف سے بے توجہی تھی یا حکومت قوم کو بھلائی پہنچانے کا ایک تنہا ذریعہ سمجھی جاتی تھی ۱۸۷۵ء کے بعد سے ہم دیکھتے ہیں کہ حکومت کے اثر کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے، قوم اور حکومت میں کسی قسم کی بدگمانی باقی نہیں رہتی، اور بجائے حکومت کی مداخلت پر اعتراض کرنے کے قوم اس کی اور مدد کرتی ہے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مل خود انفرادیت کا قائل تھا، لیکن اس میں اور اس کے زمانہ کے سیاسی فلسفیوں میں بڑا فرق ہے۔ اسپنسر ریاست کو محض قوم یا سماج کے جان و مال کی حفاظت کا کام سپرد کرتا ہے۔ اس کی رائے میں بڑی خدمت جو وہ سماج کی کر سکتی ہے، یہ ہے کہ اسے اپنے حال پر چھوڑ دے اور سماج کو چاہیئے کہ جہاں باہر کے چوروں اور ڈاکوؤں سے اپنی حفاظت کا انتظام کرتی ہے وہاں اس گھر کے چور پر بھی نظر رکھے، یعنی ریاست کو اپنے معاملات میں دخل دینے سے اور اپنی آزادی کے محدود کرنے سے روکے۔ یہ سب کچھ کہنے کی خاص وجہ یہ ہے کہ اسپنسر ریاست کو ضروری نہیں سمجھتا اور زندگی کا مرکز اور اس کی چلانے والی طاقت اس کے نزدیک مختلف افراد ہیں، انفرادیت اس کا مذہب ہے، فرد کی عقل اور سمجھ کے علاوہ وہ زندگی میں اسے اور کوئی روشنی نظر آتی نہیں۔ انسان کی وقعت اور اہمیت پر زور دینا بہت قابل تعریف بات ہے لیکن اسپنسر

جس انسان کے لیے میدان جنگ میں آتا ہے وہ انسانیت کا کوئی اچھا نمونہ نہیں، اسپنسر کا فرضی انسان، جس کو وہ "سیدھا آدمی" کہتا ہے، محض ایک تاجر ہے، جس کا نقطۂ نظر خالص بیوپاریوں کا ہے، یعنی اسے تمدن، تہذیب، اور ان دلچسپیوں سے جن کو عام رائے نے اس زمانہ تک انسانیت کا خاص حصہ سمجھا ہے، کوئی مطلب نہیں۔ سماجی، سیاسی، ادبی زندگی کو وہ اگر حقارت نہیں تو بے قدری اور بے پروائی کی نظر سے ضرور دیکھتا ہے۔ ریاست اس کے نزدیک ایک نظام ہے جو دشمنوں سے لڑنے اور چوروں اور ڈاکوؤں سے حفاظت کے لئے بنایا گیا ہے۔ اگرچہ وہ ان خدمات کا شکریہ ادا کرنے پر تیار ہے، پھر بھی وہ یہ نہیں چاہتا کہ ریاست اس کے معاملات میں کسی قسم کا دخل دے، کیونکہ ریاست اس کے معاملات کو اس سے بہتر نہ سمجھ سکتی ہے نہ انجام دے سکتی ہے۔

مل ان تمام غلطیوں سے بچا ہوا ہے۔ یہ بے شک صحیح ہے کہ سماجی زندگی کو وہ اہمیت نہیں دیتا جو دراصل دینا چاہیے، لیکن انسانیت کو وہ اس کے بدلہ میں بہت اعلیٰ مرتبہ دیتا ہے۔ اسپنسر کے تخیل پر سائنس نے ایسا قبضہ کر رکھا ہے اور اس میں اتنی بھاپ بڑھ گئی ہے کہ وہ پٹریوں پر چلنے پر بھی راضی نہیں۔ مل سائنس کو انسان کے بہترین مشاغل میں شمار کرتا ہے، لیکن اس کی نظر سائنس کے دھویں میں گم نہیں ہو جاتی۔ اسپنسر نے ریاست اور حکومت کا فرق بھول کر دونوں کو اپنے "سیدھے" آدمی کا دشمن دکھانے کی کوشش کی ہے۔ مل اگر ریاست اور حکومت کی مداخلت کا قائل نہیں[1]

---

[1] معاشی معاملات کے علاوہ ریاست کی مداخلت کے بارے میں مل کا جو خیال ہے (دیکھو صفحہ ۱۷)

پھر بھی اوس کی انفرادیت محض ایک ادنٰے بیوپاری کی خودغرضی کا بنایا ہوا اصول نہین اور نہ اوس کے نزدیک اسپنسر کا "سیدھا" آدمی انسانیت کا بہترین نمونہ ہے۔ انسان کی آزادی کا خیال اوس کے دل مین ایک سچّا جوش پیدا کرتا ہے، اور آزادی کے اوس نے بہت وسیع معنی لیئے ہین۔

اپنے زمانہ مین تو اسپنسر کا اثر بیشک زیادہ تھا، کیونکہ اس نے اپنے نظریون کو سائنس کے بھیس مین پیش کیا تھا، اور سائنس کا اوس وقت لوگون کے دلون پر بہت رنگ چھایا ہوا تھا۔ آجکل سائنس کا جو سیاسیات مین دخل ہے اوسے لوگ بہتر سمجھتے ہین، یا یہ کہیئے کہ علاوہ نفسیّات کے اور کسی سائنس کو سیاسیات مین دخل نہین ہا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) وہ اس بحث سے بخوبی ظاہر ہوتا ہے جو وہ ریاست اور تعلیم پر کرتا ہے۔ مفت اور جبری تعلیم کا وہ حامی ہے، اسپنسر کی طرح وہ اسے ضروری نہین سمجھتا کہ ریاست کو اس معاملہ سے بھی دور رکھنا چاہیئے۔ ریاست کی طرف سے تعلیم دلانے کے خلاف اگر کچھ کہا جاتا ہے تو اسکا یہ مقصد نہین کہ ریاست سے تعلیم لازمی نہ کر دی جائے بلکہ یہ مطلب ہے کہ ریاست کو اپنے اغراض کے مطابق تعلیم دینے سے روکا جائے اور یہ بالکل دوسری شے ہے۔ بڑے پیمانہ پر تعلیم کا انتظام صرف ریاست ہی کیلئے ممکن ہے لیکن مِل نہین چاہتا کہ تمام تعلیمی نظام اور اسکول وغیرہ ریاست کے قبضہ مین آجائین، کیونکہ اس کا اثر برا ہوگا۔ عام ریاست کی طرف سے تعلیم صرف ہر شخص کو دوسرے جیسا بنانے کی ایک ترکیب ہے، پرائیویٹ اسکولون کے ساتھ ریاست کی طرف سے اسکولون وغیرہ کا ہونا یا ریاست کی طرف سے پرائیویٹ اسکولون کو مالی امداد دینا کوئی قابل اعتراض بات نہین تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ عام تعلیم افراد پر نہین چھوڑی جاسکتی، اور اگر اس زمانہ مین ریاست یا اسقدر بیدخل نہین ہے جتنا کہ مِل چاہتا ہے لیکن پھر بھی اسپنسر سے اسکی رائے واقعات کے نقطۂ نظر سے زیادہ صحیح ثابت ہوئی

لہ اسپنسر کا یہ خیال تھا کہ سیاسی مسائل کو ہمین نیچرل سائنس، خاص طور سے حیاتیات (بایولوجی) کے اصول اور قوانین کے مطابق حل کرنا چاہیئے۔

اور اسپنسر کے نظریون کی کوئی وقعت نہین رہی، مگر ل کی قدر اوتنی ہی ہوتی ہی۔ ریاست کے معاملہ مین لوگون کی رائے بدل گئی ہو، لیکن انسان اور انسانیت کی وقعت نہین گھٹی، اور زندگی کے آدرش یا نصب العین جو ل نے قرار دیئے تھے اگرچہ اون مین کچھ خامیان بھی ہین، لیکن وہ ہمیشہ زندہ رہین گے

حکومت کی خرابیون اور اوس فرقہ[۱] کے خیالات نے جس مین اسپنسر کی پرورش ہوئی تھی اوسے ریاست کا دشمن اور انفرادیت کا حامی بنا دیا تھا، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا ہے جب سے حکومت پر جمہور کا اثر پڑنے لگا، حکومت کی طرف سے بدگمانی جاتی رہی اور اوسی کے ساتھ اسپنسر کے نظریئے بھی۔ اور اگرچہ اب بھی بہت سے ایسے اہل فکر موجود ہین جو انفرادیت کو سیاسی اکسیر سمجھتے ہین لیکن ریاست کی پالیسی، عام رائے اور وقت کا تقاضا بالکل دوسرا ہی۔ اسپنسر ایک خاص زمانہ کے خیالات کو ظاہر کرتا ہے، اگر ہم اوس کا مقابلہ اوس سے پہلے کے خیالات سے کرین تو ل کی انفرادیت ایک کڑی ہے جو دونو کو جوڑتی ہے، اور اگر ۱۸۷۰ء کے بعد کی اجتماعیت سے کرین تب بھی ل کی حیثیت وہی رہتی ہو۔ اوس نے اپنے سے پہلے کے خیالات جذب کرلئے تھے، اور اوس کے زمانے کے جو خیالات تھے وہ بھی، لیکن اوس نے اپنے تخیل کو ایسی وسعت دی تھی کہ آیندہ تحریکون سے بھی اوس کا گہرا تعلق رہا، کیونکہ اگرچہ موجودہ زمانہ کی سخت گیر تنقید کے سامنے انفرادیت سیاسی

---

[۱] اسپنسر پیدایشی مذہب کے لحاظ سے اس فرقہ مین شامل تھا جو انگلستان کے ریاستی کلیسا کے عقاید کا قایل نہ تھا، یہ فرقہ کئی صدیون سے ریاست اور کلیسا دونو کی مخالفت کے باوجود ابھی تک قایم ہو، اگرچہ اسے بہت سی تکلیفین اوٹھانی پڑی ہین، ایسی صورت مین ظاہر ہو کہ مخالف کلیسا کیلئے ریاست کا دوست ہونا ناممکن تھا۔

پالیسی کی صورت میں نہیں ٹھہر سکتی تاہم مل نے آزادی کے جو معنی قرار دیئے ہیں اور اصلی آزادی سے اوس نے انفرادیت کا جو تعلق دکھایا ہے وہ کبھی کسی تنقید کے ذریعہ سے غلط ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

مل کی "آزادی" کوئی خالص علمی کتاب نہیں ہے یعنی وہ کسی ایسے عالم کی لکھی ہوئی نہیں ہے جسے بجز اپنے علم کے کوئی اور دلچسپی نہیں ہم اگر اسے علم سیاست میں ایک بڑا درجہ دیتے ہیں تو اس وجہ سے کہ مل نے اس کتاب میں ان مسائل پر بحث کی ہے جو سیاسی زندگی کی بنیاد ہیں۔ لیکن مل نے جو طریقہ اختیار کیا ہو اوس میں ایک نکتہ چین بہت سی خامیاں اور غلطیاں نکال سکتا ہے۔ اس کا انداز بیان ایک جج کا سا نہیں جو معاملہ میں صحیح فیصلہ کرنا چاہتا ہے بلکہ ایک وکیل کا سا ہے جو بڑے جوش و خروش سے فیصلہ کو اپنی رائے کے مطابق کرانا چاہتا ہے۔ اس نے "آزادی" میں نہ ہر طرف سے معلومات حاصل کر کے جمع کیے ہیں، نہ یہ کوشش کی ہے کہ غیر جانبدارانہ سیاست کے مسائل پر غور کرے۔ پڑھنے والے کو معلوم ہوتا ہے کہ مل نے صرف اپنے دل سے ایک بات پوچھی اور اوس کا جواب لکھ دیا۔ یہ کتاب کی اگر بڑی خوبی ہے تو علمی نقطۂ نظر سے کمزوری بھی ہے۔

مل نے سماج کی کوئی شکل و صورت یا خاص حیثیت قرار نہیں دی۔ ریاست کی اوس نے تعریف تک نہیں کی۔ سماجی اور سیاسی زندگی کے اصل مقصد پر نہ اپنی رائے ظاہر کی نہ کوئی نظریے قائم کیے اور آزادی پر بغیر ان مسائل کو حل کیے بحث کرنا گویا بے ملک کے باشندے بنانا ہے۔ مگر مل نے جس نقطۂ نظر سے بحث کی ہے وہ

ہم کو معلوم ہے، اور جو رائے اوس کے ہمخیال لوگوں کی تھی اُس سے بھی ہم ناواقف نہین اسلیئے ہم یہ اعتراض کرنے کے بعد بھی "آزادی" کے نظریون سے جو نتیجے نکلتے ہیں اون پر بحث کر سکتے ہیں۔

عہد وسطیٰ کے تخیّل نے دنیا کے لیئے ایک ایسا نظام بنا دیا تھا جس مین فرد کی کوئی حیثیت نہین تھی۔ اوس زمانہ مین اگر کوئی سر اُٹھاتا تھا تو ساری دنیا کے خلاف اگر کوئی نظریئے پیش کیئے جاتے تھے تو وہ بھی تمام مخلوق کیلیئے، چاہے وہ سیاسی ہوں یا مذہبی۔ عہد جدید کے شروع مین سدھار کی تحریک نے اِس دنیا اور اس تخیّل کو نیست و نابود کر دیا۔ اب سیاسی نظریون کا تعلق بجائے ساری دنیا کے مختلف ریاستون سے ہو گیا۔ اگرچہ ان میں جو عام اصول تھے وہ ہر جگہ استعمال کیئے جا سکتے تھے، مثلاً عہد وسطیٰ مین شہنشاہ اور پوپ مین جو جھگڑے ہوئے اون مین بحث اس پر تھی کہ خدا یا حضرت عیسیٰؑ نے دنیا کی حکومت پوپ کے سپرد کی ہے یا شہنشاہ کے، اور اگر ان دونون مین اختلاف ہو تو قوم کو کس کے حکم کے مطابق چلنا چاہیئے۔ جو نظریئے اِس سلسلہ مین پیش کیئے گیئے اون سے ہم کو یہاں کوئی مطلب نہیں۔ ہم کو صرف یہ یاد رکھنا ہے کہ اس بحث مین ساری دنیا کی قسمت طے پاتی تھی، برخلاف اسکے عہد جدید کے شروع کو دیکھیئے، مذہبی اختلاف نے پوپ اور شہنشاہ دونون کو اون کے شاندار خوابون سے جگا دیا ہے، پرانی دنیا کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گیئے ہیں، اب اگر کسی کو فکر ہے تو اوسی ٹکڑے کی جس مین وہ رہتا ہے اور اونھین مسائل کی جو وہان زیر بحث ہیں۔ دو پلیسی مور نے اپنی کتاب Vindicae Contra Tyrannos مین یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مشرک یا لبے دین بادشاہوں کے

خلاف بغاوت کرنا جائز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حکومت کی بنیاد دو معاہدون پر قایم ہے، ایک بادشاہ اور خدا کے درمیان، جس کے مطابق خدا اس کا وعدہ کرتا ہی کہ وہ بادشاہ کو فتح مند اور رعایا کو خوش حال رکھے گا، بشرطیکہ وہ سچے دین سے نہ ہٹین، اور خدا کے احکام کی پابندی کرتے رہین۔ دوسرا معاہدہ بادشاہ اور اوس کی رعایا کے درمیان ہوتا ہے، جس مین رعایا اطاعت کا عہد کرتی ہے اِس شرط پر کہ بادشاہ راہِ راست پر چلے۔ ہمارے لیئے اِن نظریون مین دو باتین قابل غور ہین، پہلے تو یہ کہ لکھنے والا صرف مختلف ریاستون کا ذکر کرتا ہے، اور بجائے شہنشاہ اور پوپ کے ہر ریاست کے سردار کا براہ راست خدا سے تعلق پیدا کر دیتا ہے ثبوت کیلئے تو وہ انجیل پیش کرتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے لوگ عہد وسطیٰ مین کیا کرتے تھے، لیکن اوس زمانہ کا جس بات پر اصرار تھا۔ یعنی یہ کہ ساری دنیا ایک ریاست ہی، اور اس کا ایک ہی بادشاہ ہو سکتا ہی، وہ اب لوگ بھول جاتے ہین۔ دوسری بات جس پر ہمین غور کرنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ بے دین بادشاہون کے خلاف بغاوت کرنے کا حق کسی شخص کو نہین دیا جاتا بلکہ صرف خاص جماعتون کو دیا جاتا یعنی عہد وسطیٰ کی دنیا جا چکی ہے، لیکن آل کی انفرادیت ابھی بہت دور ہے۔

سیاست کے نقطۂ نظر سے یورپ مین کوئی زمانہ اتنا مردم خیز نہین ہوا جتنا مذہبی لڑائیون کا، لیکن فرد کا کہین کبھی ذکر نہین آتا۔ اِس کی وجہ ایک تو یہ ہے کہ بحث اور جنگ مین جتنے فریق تھے سب دراصل آزادی کے دشمن تھے۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ لوگ آزادی پسند بھی ہوتے تو انفرادیت ایک انتہا ہے، جس تک پہونچنا ان کے لئے بہت مشکل تھا اس وجہ سے کہ اس حد تک پہونچنے کے لئے انھین

ان سب باتون سے انکار کرنا ہوتا جو انھین ہمیشہ عزیز رہی تھین۔ ایک عالم، ایک مذہب، ایک خدا کی جگہ پر ہزارون آزاد اور خود مختار ہستیون کا تصور کرنا اوسی وقت ممکن تھا جب نہ عالم باقی رہا ہو نہ مذہب نہ خدا۔

علم سیاسیات مین فرد صرف اٹھارھوین صدی مین پیدا ہوتا ہے، اور روسو کا یہ نعرہ کہ "انسان آزاد پیدا ہوا تھا اور مین اوسے ہر طرف زنجیرون مین جکڑا دیکھتا ہون"، انفرادیت کو علم سیاست مین داخل کرتا ہے، لیکن فرد کی ذاتی شخصیت اور اوس کے حقوق کا دعویٰ کرنا ایسی جرأت کا کام تھا کہ روسو بھی صرف نعرہ ہی لگا کر رہ گیا۔ عقد اجتماعی جسکی ابتدا ان الفاظ کے ساتھ ہوتی ہے، بعد کو اسی کا اولٹا ثابت کرتی ہے۔ انسان کو آزادی تو ضرور دی جاتی ہے، لیکن روسو کی ریاست مین انسان کو ایک فرد بننے اور انفرادیت کے سلسلہ مین اپنے حقوق کا ذکر کرنے کا کوئی موقع نہین دیا جاتا۔ انفرادیت کے قائل وہی لوگ ہو سکتے تھے جن مین اتنا تخیل نہ ہو کہ وہ اس کے تمام نتائج کا ایک ساتھ خیال کر سکتے ہون اور جن مین خودی کا جوش اسقدر ہو کہ وہ اس عالم بے پایان مین بھی اپنی ہستی کو ایک خاص اہمیت دے سکین۔

یہ خاصیتین صرف انگریزون مین پائی جاتی ہین، اور انفرادیت اسی لئے انگریزون کا حصہ رہی ہے لیکن انگلستان مین بھی انفرادیت اُسی وقت رائج ہوئی جب تجربہ نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ زندگی کے بعض معاملات مین اگر انسان کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو اسے نقصان نہین ہوگا۔

جیسا کہ گذشتہ صفحات مین لکھا گیا ہے، انفرادیت کی اصل بنیاد معاشی ضرورت

بھٹین۔ ہر نئی دریافت انسان مین ایک جوش پیدا کر دیتی ہے جس کی وجہ سے وہ اس کی اہمیت کو بہت بڑھا دیتا ہے "آزاد تجارت" اور انفرادیت دونو اپنی جگہ پہ قابل غور اصول ہین، لیکن اگر انفرادیت معاشی معاملات مین ایک اچھا یا فائدہ مند اصول ثابت کی جا سکتی ہے[1]، تو اس سے یہ نتیجہ نہین نکلتا کہ سیاسی، مذہبی، یا اخلاقی دنیا مین بھی اسے اختیار کر لینا چاہیئے۔

مِل نے جس طریقہ سے بحث کی ہے اوس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرد بذات خود بھی کوئی چیز ہے اور سماج اور ریاست سے الگ بھی اوسکی اپنی خاص زندگی ہے یا ہو سکتی ہے۔ ممکن ہے کہ یہ صحیح ہو، لیکن مِل نے اسے ثابت نہین کیا، اور ......

...... ارباب فکر کی ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ انسان کے لیئے سماج اور ریاست دونو آب و ہوا اور غذا کی طرح ضروری ہین۔ ارسطو کا یہ قول کہ "انسان ایک سماجی جانور ہے" اب تک درست مانا گیا ہے اور ہمارے زمانہ کی جدید سے جدید مدبرات نے اسی کو دوسرے طریقہ سے ثابت کیا ہے۔ مِل کی انفرادیت کی اصل وجوہ دو معلوم ہوتی ہین، اور انھین پہ ہمین غور کرنا چاہیئے:۔

(۱) اُسے اِس کا یقین نہین ہے کہ مجموعی حیثیت سے سماج مین کافی حق پرستی اور حرکت پیدا کی جا سکتی ہے، اور اس لیئے ضروری ہے کہ ہر فرد کو دریافت اور

[1] معاشی زندگی مین بھی انفرادیت کے قائل صرف انگریز رہے ہین۔ ان پہ یورپ کی اور قومین اعتراض کرتی ہین کہ اونھون نے خود غرضی کو بنا سنوار کر ایک علم کی صورت دیدی ہے، اور اپنے فائدہ کے لیئے اس کا پرچار کرتے ہین، یہ تو ضرور صحیح ہے "آزاد تجارت" سے یا تو صرف انگلستان کو فائدہ پہونچ سکتا ہے یا دوسری قومین اسوقت تک اپنے پیرون پہ کلہاڑی مارتی رہی ہین

جستجو کی اجازت دی جائے۔

(۲) جستجو اور دریافت کی اصل وقعت اوسی وقت ہوتی ہے جب انسان کے ذاتی تجربہ سے صحیح ثابت ہوجائے، خاص طور سے مذہبی اور اخلاقی معاملات مین۔

(۱) ہم اس سے انکار نہین کرسکتے کہ ہر سماج مین زیادہ تعداد اون لوگون کی ہوتی ہے جو سُستی یا بزدلی کی وجہ سے جسے قدامت پسندی بھی کہتے ہین، ہر نئی چیز کے خلاف ہوتے ہین۔ اپنی حالت پر قایم رہنے کے لیئے وہ ہر قسم کی سختی اور زبردستی کو جائز سمجھتے ہین۔ ارسطو اور افلاطون جو انسان کو بذات خود بالکل بے بس اور بیکار قرار دیتے ہین اِسی وجہ سے اس پر خاص زور دیتے ہین کہ ہر ریاست اور ہر سماج کو اپنے آدرش، یا نصب العین مقرر کرلینے چاہئین اور اپنی تعلیم کو اِس ڈھنگ کا بنانا چاہیئے کہ ہر بچّہ مین اپنے فرائض ادا کرنے کی خواہش پیدا ہو، اور وہ اوس راستہ پر استقلال سے چلتا رہے، جو سماج نے اپنے لئے مقرر کیا ہو۔ افلاطون نے اپنی ریاست کو عدل پر مبنی کیا، اور "عدل" کرنا اوس نے اپنے سیاسی اخلاق کا سب سے بڑا فرض ثابت کیا۔ ارسطو نے افلاطون کی طرح کوئی خیالی ریاست نہیں بنائی لیکن اخلاقی ترقی اور انسانی فطرت کی پوری نشو ونما اوسکے نزدیک بھی ریاست اور سماجی زندگی کی روح تھین۔ جس ریاست نے اپنے لیئے یہ آدرش مقرر کیا ہو، وہ ریاست نہین، اور جو انسان اِس فرض سے غافل ہو وہ انسان نہین۔

عہد وسطی مین، جیسا کہ عرض کیا گیا ہے، فرد کی کوئی حیثیت نہین تھی۔ سماج کا سب سے چھوٹا جزو برادری یا ہم پیشہ لوگون کی جماعت مانی جاتی تھی، اور

سماج خود ان برادریوں کا مجموعہ تھی۔ بذات خود ایک فرد کوئی ہستی نہیں رکھتا تھا اگر تھا کچھ تو اپنی برادری کے ایک جزو کی حیثیت سے۔ زندگی کے ہر پہلو پر برادری کی حکومت تھی۔ تعلیم، اخلاق، پیشہ سب برادری طے کرتی تھی، قانون بھی ان معاملات مین وہی بناتی تھی، مجرم بھی اوسی کے سامنے پیش ہوتے تھے۔ اس مین انکو کامیابی چاہے نہ ہوئی ہو لیکن اس زمانہ کے لوگون نے اپنی سماج اور اپنی سماجی زندگی کیلئے بہت سے بلند آدرش بھی مقرر کئے تھے۔ حضرت عیسیٰؑ کی تعلیم کی پیروی کرنا اور انھی کی طرح رہنا، یہ ذاتی زندگی کا بہترین طریقہ سمجھا جاتا تھا، اور دنیا مین اونھون نے وہی نظام قایم کرنے کی کوشش کی جو اون کے خیال مین جنت مین تھا، اور دنیاوی زندگی کو وہ اوسی قدر پاک وصاف بنانا چاہتے تھے، جیسے آسمان پر فرشتون کی زندگی تھی۔ اس لحاظ سے بھی انفرادیت اصولاً ممکن تھی۔ جو دنیا چھوڑتا اوسے اپنی ذات کو ویسے بھی خدا کی ذات مین غرق کردینا ہوتا۔ جو دنیا مین رہتا اُس کا اخلاقی فرض تھا کہ سماج کی خدمت مین اپنی ذات کو بھول جائے۔ رفتہ رفتہ یہ آدرش دھندھلے پڑ گئے اور سارا نظام کمزور ہو گیا لوگ اس کے خلاف علانیہ بغاوت کرنے لگے۔ اب سے کوئی ایک سو برس پہلے صنعت وحرفت مین انقلاب پیدا ہوا، اس نے ہر چیز کو اس پیمانہ پر پہونچا دیا کہ زندگی کے بالکل قابو سے نکل جانے کا ڈر پیدا ہو گیا۔ بغیر خود اس کا احساس کئے ہوئے انیسوین صدی مین جو لوگ سیاسی مسائل پر غور کر رہے تھے، چاہے وہ عالم رہے ہون یا مدبر، دراصل اسی معاملہ کو طے کر رہے تھے کہ سماج اور ریاست اپنی بڑھتی ہوئی آبادی اور پھیلتی ہوئی زندگی مین کسی قسم کا نظام قایم کر سکتی ہین یا نہین؟

اٹھارھوین صدی کے انقلاب نے فرانس مین ایک مضبوط ریاست قایم کردی تھی۔ مرکزی حکومت مین انقلاب ہوتے رہے، لیکن اِن کے باوجود ریاست کے دخل کا دائرہ بڑھتا رہا۔ تعلیم، مقامی حکومت وغیرہ سب قوم نے اپنی مرضی سے اس کے سپرد کردی۔ جرمنی مین نپولین کی زیادتیون نے قومیت کا احساس پیدا کردیا جسے بعد مین بسمارک نے صحیح طریقہ سے استعمال کرکے جرمن سامراج قایم کیا۔ کانٹ اور ہیگل کے سیاسی نظریون کا ہم اگر مقابلہ کرین تو جرمن قوم کے خیالات مین جو تبدیلی ہوئی ہے وہ ہم پر صاف طور سے ظاہر ہوجائیگی، اور جو صورت ریاست کے تخیل نے جرمنی مین اختیار کی ہے وہ بھی ہم کو معلوم ہوجائے گی۔ کانٹ نے جس زمانہ مین اپنی تصانیف لکھین اُسوقت جرمنی مین کوئی ایسی ریاست نہ تھی جو لوگون کے تصور پر اثر کرتی یا جو خدمات ریاست قوم کی کرسکتی ہے اون کا نمونہ پیش کرتی۔ اِس وجہ سے کانٹ ریاست کو زندگی مین زیادہ اہمیت نہین دیتا، اور اسکی طرف سے کچھ بدگمانی سی ظاہر کرتا ہے۔ اوس کے خیال مین سماجی زندگی انسان کے لیئے ضروری ہے، لیکن ریاست سے بہت ممکن ہو کہ فائدے کی بہ نسبت نقصان زیادہ پہونچے۔ ہیگل کی آنکھون کے سامنے پروشا کی ریاست موجود تھی اور جو اخلاقی اور دنیاوی فائدے پروشا نے جرمن قوم کو پہونچائے تھے، اِن سب سے بھی وہ واقف تھا۔ اِسی لیئے وہ ریاست کو ایک بہت بلند درجہ دیتا ہے، اوس کے نزدیک جب تک سماج ریاست کی شکل نہ پائے اُسوقت تک اوس مین اور ریاست مین وہی فرق ہے جو انسان اور مردہ گوشت پوست مین ہے۔ سماج کو ایک ذات، خصوصیت، مقصد یہ سب چیزین اوسی وقت میسر ہوتی ہین جب وہ ایک ریاست

بنجائے۔ ریاست گویا ایک اعلیٰ شخصیت ہے، جو قوم کے آدرش یا نصب العین کو اپنی ذات مین رکھتی ہے اور جس کے بغیر قوم ایک گمنام اور بے معنی پریشانیون کا مجموعہ ہے۔

ریاست کی تمام خصوصیتین ہیگل کے خیال مین لڑائی کے وقت نمایان ہوتی ہین۔ سماج اور مختلف افراد جنگ کے زمانہ مین اسی طرح غائب ہوجاتے ہین۔ جیسے سپاہی کا بدن زرہ بکتر یا وردی مین۔ ریاست ایک شخص، ایک خیال اور ایک مقصد بنجاتی ہے۔ اس وقت ہم کہہ سکتے ہین کہ ہزارون لاکھون ہستیان ایک دل مین دھڑک رہی ہین۔

جرمن ریاست کو صدیون کی آرزوون نے بنایا۔ یہ کوئی تعجب نہین ہے اگر ہیگل نے اوسے اس قدر اہمیت عطا کی۔ انگریزی مصنفون مین ہوبز کے علاوہ کوئی ایسا شخص ہم کو نہین ملتا جس نے ریاست کو ہیگل کی طرح "ہمہ اوست" کا درجہ دیا ہو۔ اسی مین ہم دیکھ سکتے ہین کہ سیاسی نظریئے، سیاسی ضرورتون کے کس قدر پابند ہین۔ انگلستان ایک ایسا ملک ہے جسے دشمنون کے حملے سے کوئی ڈر نہین، جس مین ایک زبان، ایک نسل کی قومین ہین، جسے قدرت نے تجارت کے لیے خاص موقع عطا کیا ہے، اور اس لیے انگریزون کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ ریاست کو اپنے معاملات مین دخل دینے سے روکین۔ یورپ کے ارباب فکر کا عام طور سے یہ بھی خیال ہے کہ انگریزون کے تخیل مین اتنی بلند پروازی اور اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اپنے تجارتی جھگڑون سے چھٹ کر ریاست کی نازک اور اعلیٰ ہستی کو سمجھ سکین، برخلاف اس کے جرمنی مین تخیل کی کوئی کمزوری نہین

رہی ہے، لیکن دشمنون نے اوس کو بہت پامال کیا، اور جرمن قوم مین آپس کا بیر بھی بہت رہا ہے۔ اسی لئے ایک ایسی ریاست جو دشمن سے مقابلہ کر سکے اور جس مین شامل ہونے سے جرمن قوم کے تمام فرق مٹ جائین، ہر صاحب دل کی آرزو تھی، اور جب اوس کے آنے کا چرچا ہوا تو اِس جوش وخروش سے اوس کا استقبال کیا گیا۔

ہیگل کے سیاسی خیالات، جن کو "ریاست کا فلسفیانہ نظریہ" بھی کہتے ہین، دراصل وہی ہین جو افلاطون اور ارسطو کے خیالات تھے۔ فرق جو ذرا سا ہو گیا ہے وہ اُصول کا نہین ہے۔ دنیا کی صورت بدل گئی ہے، ریاست کی وسعت مین بہت اضافہ ہو گیا ہے، سماج کی ضروریات زیادہ ہو گئی ہین۔ مل اور عام طور سے انفرادیت کے حامی ہی صرف ایسے ہین جو اس خیال کے خلاف ہین اور جو ریاست کو یہ حقوق اور یہ حیثیت دینا قوم کے افراد یعنی خود قوم کیلئے مضر سمجھتے ہین۔ ہم کو دیکھنا ہے کہ اون کی یہ رائے کہانتک صحیح ہے۔

انفرادیت کی بحث چھیڑنا ہی ایک طرح سے اِس بات کا دعویٰ کرنا ہے کہ فرد اور قوم کے اغراض مین اختلاف ہے، یعنی جس مین ایک کا فائدہ ہے اوس مین دوسرے کا نقصان ہو سکتا ہے۔ علاوہ اسکے یہ بھی کہ انسان سماج سے الگ بھی کوئی ہستی رکھتا ہے۔ اوس کے کچھ حقوق ہین جو فطرت نے اوسے عطا کئے ہین، اور جو اوسکی دینی، اخلاقی اور دنیاوی بہبود کے لیئے ازبس ضروری ہین۔ اگر ہم مختلف زمانون مین اِس خیال کا پتہ لگائین تو ہم کو معلوم ہوگا کہ اس کی اصل بنیاد کیا ہے، یہ

لوگون مین کیسے پیدا ہوا، اور یہ کہان تک صحیح ہے۔

سولہوین صدی مین مذہبی اور سیاسی اختلاف کو جائز ثابت کرنے کیلئے یہ نظریہ پیش کیا گیا تھا کہ سماج اور ریاست کی بنیاد چند معاہدون پر ہے، جو قوم اور بادشاہ یا قوم اور خدا، یا خدا اور بادشاہ کے درمیان قایم ہین، اور سیاسی فرایض قوم اسی وقت تک ادا کرنے پر مجبور ہے جب تک کہ دوسرا فریق اوس کی شرطین پورا کرتا رہے۔ سترھوین صدی مین اِس معاہدہ کو ایک اور صورت دی گئی، ہوبز اور اسپینوزا نے مختلف ارادون سے یہ دکھانا چاہا کہ سماج اور ریاست، قوم نے آپس مین معاہدہ کرکے بنائی تھی، اور اِس معاہدہ سے پہلے ہر شخص آزاد تھا اور ایک فطری نیچرل حالت مین رہتا تھا۔ اِس حالت مین اپنی خواہشون کو پورا کرنے کے لیئے قدرت نے اوسے طاقت بخشی تھی۔ جو کچھ وہ اپنی طاقت، جرأت یا سمجھ سے حاصل کرسکتا تھا وہ اوسکا گویا حق تھا۔ لیکن یہ زندگی سب کے لئے موزون نہ تھی، اور اس لئے سب نے ملکر سماج اور ریاست قایم کی جس مین سب کے حقوق برابر تھے، اور اس مین جان اور مال کی حفاظت پوری طرح سے ہوسکتی تھی۔ اٹھارھوین صدی مین روسو کی تصانیف نے اِنسان کی اِس فطری حالت کو ایک نہایت شاعرانہ رنگ روپ دیدیا۔ اگرچہ اوس کتاب مین جو اوس کی سب سے بڑی سیاسی تصنیف مانی جاتی ہے اوس نے سماجی اور سیاسی زندگی کو فطری زندگی سے بہتر بتایا ہے، اِس وجہ سے کہ اخلاقی احساس اور اخلاقی ترقی صرف سماجی اور سیاسی زندگی ہی مین ممکن ہے، لیکن پھر بھی فطری حالت اور فطری حقوق کا ڈھنڈورا اسی طرح سے

پٹتا رہا۔ سترھوین صدی کے آخری حصہ مین دو زبردست انقلاب ہوئے جنمین
سے ایک امریکہ کا انگریزون کے خلاف تھا اور دوسرا فرانسیسی انقلاب۔
ان دونومین انسان کے قدرتی حقوق کا بڑے زور وشور سے اعلان کیا گیا۔
ان دونو انقلابون کو اس خیال کے پرچار کا عروج کہا جا سکتا ہے۔

قومون کو آزادی حاصل کرنی تھی اور اوس کے لیئے اونھون نے بہانے نکالے
تھے۔ جب آزادی مل گئی اور ان سیاسی عقیدون پر ٹھنڈے دل سے غور کیا گیا
اُسوقت معلوم ہوا کہ یہ سب عقائد بڑی حد تک غلط تھے۔ اس سے یہ مطلب نہین کہ
آزادی کے لیئے جن لوگون نے جان دی وہ سب جھوٹے اور مکار تھے، اور نہ یہ کہ
آزادی حاصل کرنے کا اونھین حق نہین تھا، بلکہ ہمین جو کچھ کہنا ہے وہ ان سیاسی
نظریون کے متعلق کہنا ہے۔

تاریخ سے یہ تو ضرور ثابت ہو سکتا ہے کہ انسان ایک زمانہ مین بالکل وحشی
تھے، لیکن نہ تو یہ زندگی بہت اچھی تھی، نہ اون کے کوئی "حقوق" تھے "حق" کا ذکر
جیسا کہ گرین نے لکھا ہے، اوسی وقت ہو سکتا ہی جب قانون ہو، اور قانون صرف
ریاست یا سماج بنا سکتی ہے۔ معاہدہ اوسی وقت ہو سکتا ہے، اور اوس کی
پابندی پر لوگ مجبور اسی حالت میں کیئے جاتے ہین جب ایک سماج
یا ریاست موجود ہو اور اوس نے قانون کے ذریعہ اسے لازم کر دیا ہو، اسلیئے
تاریخ یا منطق سے فطری حالت یا فطری حقوق کو ثابت کرنا ناممکن ہے۔

اس زمانہ کے علم الانسان کی تحقیقات نے تو بلکہ یہ دکھایا ہے کہ انسان فطری
حالت مین رسوم وقوانین کے اندر بالکل جکڑا ہوتا ہے، اور وہ آزادی جو

جو لوگوں نے اوسے فطری حالت مین دی تھی اسے وہ در اصل رفتہ رفتہ حاصل کرتا ہے۔ جیسے جیسے اوس کے علم کا دائرہ بڑھتا ہی ویسے ویسے وہ اپنی سمجھ سے کام لینے کے قابل ہوتا جاتا ہے۔

انیسوین صدی اور اس زمانہ کے لوگ جو انفرادیت کے حامی ہین، وہ اس فطری حالت یا فطری حقوق کا کہین ذکر نہین کرتے اور نہ اونھین ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہین۔ ہربرٹ اسپنسر کو یہ یقین ہے کہ انسان کو قدرت نے جو قابلیت دی ہے وہ دنیا مین جتنے نظام کی ضرورت ہے، اُسے قایم رکھنے کے لیئے کافی ہے۔ اُسے صرف جان و مال کی حفاظت چاہیئے، وہ بھی تعلیم اور تہذیب رفتہ رفتہ پیدا کرین گی، یعنی ریاستون مین لڑائیان نہین ہوا کرینگی، اور تعلیم کی وجہ سے چوری وغیرہ بھی معدوم ہو جائینگی۔ ہل ریاست کو اسقدر حقارت سے نہین دیکھتا جیسے اسپنسر دیکھتا ہے، لیکن سماجی زندگی کا مرکز اوسکے نزدیک بھی مختلف افراد اور ان کی دلچسپیان ہیں۔ ریاست کو حکومت کے ایک خاص دائرے کے باہر اثر ڈالنا، سماج کا ایک تخیل سے زیادہ ہونا، یہ وہ صرف فرد کی آزادی کے لیئے نہین بلکہ اوس کی ترقی کیلیئے بھی خطرناک ہین۔ چنانچہ گیرلزم کے اصولون مین سے ایک زمانہ تک یہ بھی رہا ہے کہ ریاست کی بیجا مداخلت سے فرد کو بچانا چاہیئے، حالانکہ جس فرد کو وہ بچانا چاہتی تھی وہ بالکل فرضی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ وہ شئے جسے لوگ فرد کہتے ہین بالکل فرضی ہے۔ تاریخ کے لحاظ سے اور نفسیات کے اعتبار سے بھی ہر بچہ جو پیدا ہوتا ہے اپنے ماں باپ کی

کچھ خاصیتین لیکر آتا ہے۔ زندگی کے پندرہ بیس برس وہ اپنی سمجھ سے پوری طرح کام نہین لے سکتا، اسوجہ سے نہین کہ ریاست یا سماج اُسے منع کرتی ہے بلکہ اسوجہ سے کہ خود اُس کی سمجھ کا کافی نشوونما نہین ہوا ہے۔ اِس زمانہ مین اوس کے گرد و پیش جو لوگ ہوتے ہین، اون کا اور اُن کے خیالات کا اثر خود بخود پڑتا رہتا ہی، یعنی اگر ریاست و سماج اِس کی کوشش بھی کرین کہ ہر فرد آزاد ہو اور اُس کی ترقی مین کسی طرح کی رکاوٹ نہ ہونے پائے، تب بھی ہر فرد ویسا ہی رہے گا جیسا اب ہی۔ مادّی اور نفسی نقطۂ نظر سے انسان چند طبعی خاصیتون کا مجموعہ ہے۔ سماج اون پر صرف ایک حد تک اثر ڈال سکتی ہے۔ مِل چاہتا ہے کہ ہر شخص کو اپنے راستہ پر چلنے کی، ہر طبیعت کو اپنی خواہش کے مطابق نشوونما پانے کی اجازت ہو۔ لیکن انسان مین نقل کا مادّہ موجود ہے، وہ بغیر کسی کے حکم کے خود دوسرون کی پیروی کرتا، دوسرو کا رنگ ڈھنگ اختیار کرتا ہے۔ یکرنگی ریاست یا ریاست کی تعلیم سے پیدا نہین ہوتی بلکہ اِس وجہ سے کہ ہر شخص دوسرے کی نقل کرتا ہے۔ دوسری مثال لیجیئے، مِل نے خیالات کی آزادی پر زور دیا ہی، اور کہتا ہے کہ خیالات کے اختلاف کی وجہ سے لوگون کو ایک دوسرے پر سختی نہ کرنی چاہیئے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ لوگ خود اختلاف سے ڈرتے ہین۔ قدامت پسند لوگ جو عام طور سے تمام سختیون کے ذمہ دار ہوتے ہین، اِس سے ڈرتے ہین کہ جس خیال مین وہ زندگی بسر کر رہے ہیں وہ غلط ثابت ہو جائیگا، اور اون کی روحانی تسکین کا ایک سہارا جاتا رہے گا جو لوگ اون کی سختیون سے ڈر جاتے ہین، اون کو خود اپنے اوپر اعتماد نہین ہوتا اور وہ اکیلے رہ جانے سے گھبراتے ہین، یعنی جس بات کو مِل سماج کا ظلم سمجھتا ہے،

وہ دراصل انسان کی فطرت کا ایک جزو ہے، جسے بحث اور دلیل دور نہین کر سکتی ہے۔ انفرادیت کا سارا تخیل جس غلط فہمی پر مبنی ہے وہ یہ ہے کہ افراد اور سماج مین فرق کیا جا سکتا ہے، اِس سے پہلے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی تھی کہ یہ نظریہ کیونکر پیدا ہوا، اور اس نے تاریخ مین کِس کِس طرح سے مختلف صورتین اختیار کین۔ یہ بھی دکھا دیا گیا تھا کہ یہ دعوی کہ ریاست اور سماج ایک معاہدے کا نتیجہ ہین، بالکل غلط ہے۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ ریاست اور سماج بنائی ہوئی چیزین نہین ہین بلکہ رفتہ رفتہ بنی ہین، اور اسکے سوا اور کوئی نظریہ ممکن نہین، تو یہ بھی ظاہر ہو جائے گا کہ افراد اور سماج مین فرق کرنا اسی طرح غلط ہے جس طرح ایک درخت اور اوس کے پھول پتے اور تنے مین فرق و امتیاز کرنا غلطی ہے۔ مِل کی یہ خواہش کہ سماج کی عام رائے، یا اُن چند لوگون کے خیالات جو سماج پر راج کر رہے ہون، ہر شخص کو دو اکی طرح نہ پلائے جائین، نہایت قابل تعریف ہے اور ایک دردمند دل اور روشن دماغ کی دلیل ہے لیکن اسے سیاست کا نظریہ قرار دینا مشکل ہے، اور جب تک کہ انسان کی طبیعت جیسی ہے، ویسی ہی رہے گی اس وقت تک یہ بحث بیکار بھی ہے — انسان کو کسی نے کمزور نہین بنایا۔ اپنی خامیون اور کمزوریون کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ مِل نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:-

"غیر معمولی ذہانت کے اشخاص صرف آزادی ہی کی فضا مین سانس لے سکتے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا کا عام میلان یہ رہا ہے کہ متوسط درجہ کے اشخاص کو لوگون پر امتیاز اور تفوق دیا جائے"

ممکن ہے یہ بالکل صحیح ہو مگر اس کا علاج کیا ہو سکتا ہے؟ دوسری جگہ وہ لکھتا ہے:-

ملوگوں کو فرد کی آزادیٔ فعل میں انفرادی حیثیت سے ہو یا اجتماعی حیثیت سے،
دخل دینے کی صرف ایک صورت ہوسکتی ہے اور وہ آپ اپنی حفاظت کے خیال سے ہو۔
..... خود اس فرد کی جسمانی یا اخلاقی بہبود کا عذر کافی دلیل نہیں ہوسکتا جن
معاملات کا تعلق صرف اسکی ذات سے ہے، اس میں وہ کامل خود مختار ہے،،

مِل کا خیال ہے کہ اگر سماج اپنی تنگ نظر آنکھیں بند کرلے، اپنے گندے دماغ سے کام نہ لے تو انسان اور انسانیت دونوں فائدے میں رہیں گے، لیکن جس صورت میں اوس نے یہ نظریہ پیش کیا ہے اوس پر بہت سے اعتراضات ہوسکتے ہیں۔

(۱) سماج کو کسی فرد کے معاملات میں دخل دینے کا حق صرف اپنی ہی حفاظت کی بنا پر ہوسکتا ہے، لیکن اگر ہم انسان کو محض ایک زندہ جسم سے کچھ زیادہ سمجھیں تو حفاظت کے معنی ہم کو بہت وسیع کرنے ہونگے، یعنی ہمیں سماج کو اپنی روحانی حفاظت کا حق بھی دینا ہوگا۔ دنیا میں لوگوں پر اون کے خیالات کی وجہ سے جو سختیاں کی گئی ہیں، اور جن کا ثبوت ہمیں تاریخ کے ہر ہر صفحہ پر ملتا ہے، وہ دنیاوی یا ذاتی ہی اغراض کے سلسلہ میں نہیں کی گئی ہیں، رومن کیتھولک کلیسا مشرکوں اور ملحدوں کو صرف اپنی آمدنی کو بچانے کے خیال سے آگ میں نہیں جلاتا تھا۔ ممکن ہے یہ غرض بھی شامل رہی ہو لیکن اصل وجہ یہ تھی کہ جتنے باغی تھے وہ سب ایک نظام کی مخالفت کر رہے تھے، وہ اوسے جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دینا چاہتے تھے۔ یہ نظام صدیوں سے قائم تھا، ہزاروں کو اس سے دنیاوی فائدے اور روحانی تسلی مل رہی تھی۔ رومن کیتھولک کلیسا نے جو سزا اپنے باغیوں کیلئے مقرر کی تھی وہ نہایت وحشیانہ تھی۔ اسی لئے سزا کا جو مقصد تھا وہ پورا نہیں ہوسکا، لیکن اس وجہ سے ہم یہ نہیں کہہ سکتے ہیں کہ

رومن کیتھولک کلیسا کو اپنے نظام اور اپنے تخیل کی حفاظت کرنے کا حق ہی نہیں تھا۔

(۲) جن افعال کا تعلق سماج سے نہیں اُن میں فرد کو آزاد ہونے کا حق دینا چاہیئے۔ یہاں مِل نے اپنے اوپر ایک بہت بڑی ذمہ داری لے لی ہے کسی فعل کے متعلق یہ ثابت کرنا کہ اوس کا تعلق صرف ایک فرد سے ہے سماج سے نہیں، تقریبًا ناممکن ہی۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ کوئی فرد ایسا فعل نہیں کرسکتا جس کا سماج سے براہ راست کوئی تعلق نہ ہو، بشرطیکہ وہ کسی سماج میں اپنے آپ کو شامل سمجھتا ہے۔ مِل کے ذہن میں اگر یہ خیال نہ بیٹھ گیا ہوتا کہ سماج اور افراد کے مقاصد و اغراض میں بنیادی مخالفت ہے تو وہ ہرگز اس قسم کی رائے ظاہر نہ کرتا۔

(۳) جستجو اور دریافت کی اصل وقعت اوسی وقت ہوتی ہی جب وہ انسان کے ذاتی تجربہ سے صحیح ثابت ہوں، خاص طور سے مذہبی اور اخلاقی معاملات میں مِل کے اس خیال کی مخالفت کوئی سمجھدار شخص نہیں کرسکتا۔ جتنا ہم اسپر غور کرتے ہیں اتنا ہی ہم اس کے اور قائل ہوتے جاتے ہیں۔ اگر کوئی کمی ہم محسوس کرتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ مِل نے بغیر کوئی دلیل پیش کیے یہ طے کر دیا ہے کہ کوئی فرد اپنے ذاتی تجربہ سے ان اُمور و رشتوں کو صحیح نہیں پائے گا جو سماج نے اپنے لئے مقرر کئے ہوں۔ یہ غلطی مِل کی ذاتی نہیں ہے بلکہ مغربی تہذیب کی عام کمزوری ہے۔ عہد وسطیٰ کے تباہ ہو جانے پر یورپ میں کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی کہ تمام سماج کے لئے کوئی بلند آدرش قائم کیا جائے۔ رومن کیتھولک کلیسا کے ساتھ عیسائی مذہب میں جو تھوڑا بہت عقیدہ لوگوں کو تھا وہ جاتا رہا۔ اِس کا ذمہ دار بڑی حد تک رومن کلیسا تھا

پھر بھی ہم یورپ کے علما اور قوم پرست لوگون کو الزام سے بری نہین سمجھ سکتے۔
ہر شخص کو اپنے عقیدے اپنے ذاتی تجربے سے ثابت کرنے چاہئین، لیکن نہ مِل
نے یہ محسوس کیا اور نہ مغربی تہذیب نے اِس کا کافی خیال رکھا۔ سماجی زندگی بغیر
مذہب اور عقیدہ کے بے معنی اور بے مقصد ہو جاتی ہے۔ جہان مِل نے ہر شخص کو
خود مختار بننے کی تعلیم دی ہے وہان اوسے یہ بھی چاہئیے تھا کہ اِس خود مختاری کا
کوئی انجام بھی قرار دیتا۔ وہ لکھتا ہے کہ سب سے اعلیٰ اور اہم اصول جس کے لئے
دلائل اِن صفات میں بیان کئے گئے ہین، وہ یہ ہے کہ ”انسانی ترقی کیلئے ہر قسم کے اختلافات
کو جائز رکھنا نہایت ضروری اور اہم ہے،، اِس کی تائید ہم بڑی خوشی سے کرتے ہیں
لیکن اگر ہم کو یہ بھی بتا دیا جاتا کہ چلنے والے کو کہاں جانا چاہیئے تو ہم بہت
زیادہ شکر گزار ہوتے۔

اگر ہم اون تمام کوششون کو جو دنیا مین لوگون نے اپنی ترقی وبہبود کے
لیئے کی ہین، ایک فقرہ مین بیان کرنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہین کہ تمام کوششین
ازادی حاصل کرنے کے لیئے کی گئی ہین، لوگون نے اِس کے نام الگ الگ رکھ لئے ہین
اکثر ظاہر طور پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزادی کے دشمن ہین، لیکن جو پردے اِس پر ڈالے
گئے ہین اگر ہم انھین ہٹا کر دیکھین تو ہمین سوائے آزادی کی کوشش کے اور کچھ نہ
نظر آئے گا۔ ہندوستان جیسے ملک مین بھی، جہان ہلنا ڈولنا بھی لوگون کو کھلتا ہے،
ہر طرف آزادی کی کوشش جاری ہے۔ فرق اگر ہے تو یہ کہ ہمارے یہان سیاسی
آزادی کو اتنی اہمیت نہین دی جاتی، ہماری توجہ مذہب کی طرف زیادہ ہے، اگرچہ مذہب
کے جو معنی لئے گئے ہین اُس مین بہت کچھ اختلاف کی گنجایش ہی۔ آجکل مسلمانون مین

آزادی حاصل کرنا یا تو اپنی طبیعت مین ایسا اعتدال یا اتنی قناعت پیدا کرنا ہے کہ دنیاوی لذّتون کی کشمکش سے نجات ملجائے، یا پھر دنیا کو ایسا چھوڑ دینا کہ وہ اپنے پھندون مین نہ پھنسا سکے۔ ہندؤن نے بھی آزادی کے معنی تقریبًا یہی سمجھے ہین لیکن اونھون نے فلسفہ اور تخیل سے زیادہ کام لیا ہے۔ اون کے یہان کوئی ایسا خدا نہین ہے، جس کے احکام کی پابندی اِنھین آزادی دلا سکے، نہ کوئی یوم حساب ہے جسمین تمام گناہ معاف ہوجائین جب تک انسان آزاد نہ ہو وہ دنیا اور زندگی کی تمام مصیبتین جھیلتا رہیگا، اوسے آنند اوسی وقت مل سکتا ہی جب وہ ہستی کی تمام پہیلیان بوجھ لے، اور اِس جال سے جس مین وہ پھنسا ہوا مچھلی کی طرح تڑپ رہا ہی نکلکر آزاد ہوجائے۔

یورپ مین آزادی کے بالکل دوسرے معنی لئے گئے ہین۔ اس مسئلہ مین اگر کوئی مشابہت ایشیائی اور یورپی تخیل مین پائی جاتی ہے تو ایک حد تک عہدِ وسطیٰ مین ہے۔ آزادی کو اوس زمانہ مین وہ تنگ سیاسی جامہ نہین پہنایا گیا تھا جس مین ہم اوسے بعد کے زمانہ مین دیکھتے ہین۔ مذہب اخلاق اور فلسفہ کو اوس مین بہت زیادہ دخل تھا۔ جو شخص راہب بن کر اپنے آپ کو ایک خانقاہ مین بند کر لیتا تھا اوسے بھی یقین تھا کہ اوسے اسی سے اصل آزادی حاصل ہوگی۔

یورپ کے عہد جدید میں جس آزادی پر بحث ہوتی ہی وہ بالکل دوسری چیز ہے۔ اوس کا آغاز دوسرے طریقہ سے ہوا، اور مقصد بالکل جداگانہ تھا۔

عہدِ وسطیٰ مین قانون پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ ہر بات کا ثبوت، ہر فعل کا جائز یا ناجائز ہونا کسی قانون کے مطابق طے پاتا۔ ہر شخص علاوہ اپنے جسم و جان کے ایک قانونی ہستی بھی رکھتا تھا، جس کے مطابق اوسے چلنا ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے اوس پر

جہان بہت سے فرائض اور قیود عاید تھے وہان بہت سی چیزون کی اجازت بھی تھی۔ جن باتون کی روسے اجازت تھی، جو حقوق اوسے سماج یا ریاست یا رسم ورواج نے دیئے تھے وہ اوس کی "آزادیان" کہلاتی تھین۔ یہ حقوق مملوکہ اشیا کی طرح "چھینے" "چرائے" اور لئے دیے جا سکتے تھے۔ اِس کی مثال تو شاید ہی ملے کہ کسی ایک شخص کو خاص "آزادیان" دی گئی ہون، کیونکہ عہد وسطیٰ کے تخیل مین فرد کوئی حیثیت نہین رکھتا تھا، لیکن جماعت یا ایک برادری کے رکن کی حیثیت سے ہر شخص کی اپنی "آزادیان" تھیں۔ زیادہ تر جنکا ذکر تاریخ مین آتا ہے وہ شہرون اور میونسپلٹیون کی ہین، لیکن اوس زمانہ کے بہت سے کاغذات موجود ہین، جن سے عام لوگون کی آزادیون کا ثبوت بھی مل سکتا ہے۔ عہد وسطیٰ کی آزادی اوس زمانہ کے نظام کے ساتھ رخصت ہوگئی۔ صلیبی جنگون نے اِس ضرورت کو ثابت کر دیا کہ آزادی کو کوئی اور صورت دینی چاہیئے، کیونکہ اِس زمانہ کے تخیل مین شک، بحث اور اختلاف کے برداشت کرنے کی طاقت نہین تھی۔ یورپ کی موجودہ آزادی ان مذہبی جنگون کا براہ راست نتیجہ نہین کہی جا سکتی، لیکن اِن لڑائیون نے موجودہ زمانہ کے خیالات کا راستہ بہت کچھ صاف کیا ہے، اور افراد کی آزادی کو ممکن بنا دیا ہے۔

انگریزی سیاسی خیالات مین ہم آزادی کے تخیل کا نشو ونما بہت اچھی طرح سے دیکھ سکتے ہین۔ سترھوین صدی کے شروع مین سرایڈورڈ کوک آزادی کو ایک قانونی حق سمجھتا ہے، اور جیمز اوّل اور پارلیمنٹ کے درمیان جو جھگڑے ہوتے ہین اون مین وہ "قانون عام"[1] کو پارلیمنٹ کے دعوون کے ثبوت مین پیش کرتا ہے، بادشاہ اور رعایا

[1] انگریزی قانون کے، انیسوین صدی کے قانونی سدھار تک دو حصے تھے (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

مین اب تک قانونی بحث کبھی نہین ہوئی تھی۔ بحث جب شروع ہوئی تو لوگون نے محسوس کیا کہ عہد وسطی کا تخیل اِسقدر لچکدار اور مبہم ہے - اِس کے مطابق کیسی قسم کا فیصلہ کرنا نا ممکن تھا اور لڑائی کے سوا اون کے لیے اور کوئی چارہ باقی نہ رہا، علاوہ سیاسی جھگڑون کے فساد کا ایک اور ذریعہ پیدا ہوگیا، اور وہ مذہبی اختلاف تھا۔ چنانچہ جن لوگون نے بادشاہ کو قتل کرکے اپنی جمہوریت قایم کی تھی، اونھون نے دراصل اپنے مذہب کو بچانے کے لیے تلوار اُٹھائی تھی۔ چارلس کی حکومت عیاشی مین گذر گئی، یہ زمانہ خاص سیاسی تنزل کا تھا، اور وہی لوگ جن کے باپ دادا اُن نے آزادی کے لیے جان دی تھی، دربار داری اور خوشامد مین ڈوب گئے - علاوہ اِن لوگون کے نکمے پن کے چارلس دوم کی چالاکی بھی اِس کی ایک بڑی حد تک ذمہ دار ہے، کیونکہ اوس نے طے کر لیا تھا کہ اپنی زندگی بھر کوئی ایسی حرکت نہ کریگا جس سے مخالفت پیدا ہو- اوس نے دربار کو عیاشی مین پھنسا دیا، اور ملک مین سیاسی معاملات کی طرف سے عام بے توجہی پھیلا دی، لیکن اوس کا بھائی، جو اوس کے بعد تخت پر بیٹھا، بالکل دوسری طبیعت کا آدمی تھا- وہی قوم جو بیس برس سے سو رہی تھی یکبارگی جاگ اُٹھی، بادشاہ کو ایک سرے سے بھاگنا پڑا، اور بغیر ایک قطرہ خون گرائے ہوئے اوسکی جگہ پر ولیم سوم تخت نشین ہوگیا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) ایک قانون غیر موضوعہ یا قانون عام اور دوسرا قانون موضوعہ۔ قانون عام وہ رسوم و قواعد ہیں جو قوم مین پہلے سے چلے آتے تھے اور جنھین انگلستان کے ججون نے رفتہ رفتہ بہت وسیع اور مفید بنا دیا ہے۔ قانون موضوعہ انگریزی قانون کا وہ حصہ تھا جو پارلیمنٹ نے ملک کی ضرورتون کو دیکھ کر خاص طور سے بنایا تھا- پارلیمنٹ نے قانون بنانا سولہوین صدی مین شروع کیا، اس سے پہلے قانون عام کے مطابق فیصلہ ہوتا تھا۔

اِن واقعات سے ہمین چندان بحث نہین اِس زمانہ مین، اُس جماعت کی طرف سے جس نے انقلاب کرایا تھا "کتاب الحکومت" کے نام سے ایک کتاب شایع کرائی گئی، جس کا انگلستان کے باہر بھی بہت اثر رہا۔ اس کتاب کے مصنف لوک نے بادشاہ کی معزولی کو جائز ثابت کرنیکے لئے معاہدے کا نظریہ پیش کیا، اور یہ دعوی کیا کہ حکومت کی اطاعت رعایا پر اُسی وقت تک لازم ہے جب تک کہ حکومت قابل برداشت رہے، اور بادشاہ اوس معاہدہ کو نہ توڑے جو اوس کے اور قوم کے درمیان شروع مین ہوا تھا۔

اِس سے پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ معاہدے کا نظریہ بالکل غلط ہے، لیکن لوک کی کتاب انگلستان مین سب سے بڑی سیاسی جماعت "وگز" کے لیئے بہت عرصہ تک ایک سیاسی انجیل کا کام دیتی رہی۔ جب تک کہ یہ ثابت نہو کہ معاہدہ کا نظریہ واقعات اور عقل کے خلاف ہے اس خیال نے ہر آزادی پسند انگریز کے دل مین جگہ کر لی تھی۔

اِس کے ساتھ ہی قانون دانون کے سیاسی نظریئے بھی اثر کرتے رہے۔ آزادیِ فرد کی حفاظت کرنے اور پارلیمنٹ کی عزّت رکھنے کے لئے انگلستان کا قانون عام پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد پارلیمنٹ نے ۱۶۷۹ء مین "قانون تحقیقات محبوس"[1] جاری کر کے اِس خیال کو اور مضبوط کر دیا کہ انگریزون کی آزادی اِن کے ملک کے قوانین کا ایک حصہ ہے، اور اس لئے کوئی انگریز نہ غلام ہو سکتا ہے، نہ کسی اور طرح اپنی آزادی کھو سکتا ہے، "آزادی میرا پیدائشی حق ہے" اِس نظریہ کا دعوی اسی پر مبنی ہے۔ انگریزی قانون مین افراد کو حکومت کی زبردستی اور ظلم سے بچانے کیلیے

---

[1] ایک قانون ہو جس کے مطابق کوئی قیدی بغیر قانونی تفتیش و تحقیق کے جیل مین ایک خاص مدت سے زیادہ نہیں رکھا جا سکتا۔

بھی خاص انتظام ہے، اور چونکہ قانون کے وہ حصے جن کی امداد انگلستان کا ہر باشندہ اپنی آزادی کی حفاظت کے لیئے طلب کر سکتا ہے، پارلیمنٹ کے بنائے ہوئے نہین، بلکہ "قانون عام" مین پہلے سے موجود ہین، اس لئے یہ خیال اور زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے ۱۶۸۸ء کے انقلاب کے بعد سے حکومت مین کوئی ایسی خرابی باقی نہین رہی تھی جس سے قوم کو کوئی خاص تکلیف پہونچتی، لیکن مذہبی اختلاف ہمیشہ باقی رہا اور انگریزی کلیسا کے خلاف برابر بغاوتین ہوتی رہین۔ چونکہ کلیسا کے سردارون اور عام طور سے خود قوم مین اتنی روشن خیالی نہ تھی کہ اختلاف کو جائز سمجھین اور باغیون کے ساتھ بہت اچھا برتاؤ کرین اِس وجہ سے انگلستان مین ہمیشہ ایک نہ ایک فرقہ موجود رہا، جسے حکومت سے شکایت رہی۔ ہربرٹ اسپنسر اگر حکومت سے اور سرکاری ملازمون سے خفا ہے تو اسی لئے کہ اوس کی پیدائش ایک ایسے خاندان مین ہوئی تھی جس کی حکومت اور کلیسا سے پرانی عداوت تھی۔

اگر اس تاریخی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو مِل اور اسپنسر کی انفرادیت اور ان دونون کا آزادی کا تخیل بہت آسانی سے سمجھ مین آسکتا ہے۔ ذاتی آزادی کی لوگون کو عادت پڑ گئی تھی، قانون اور تاریخ نے اِس خیال کو دِل مین اور بٹھا دیا تھا۔ مِل کے زمانہ مین ریاست اور حکومت مین وہ روشن خیالی نہین پیدا ہوئی تھی جو اوس وقت کی علمی ترقی کا تقاضا تھا، اور چونکہ وہ آزادی جس کی اُسے خواہش تھی، ایسی نہ تھی جو کوئی حکومت دے سکے، لیکن ایسی تھی کہ ہر حکومت اسے چھین سکے اس لئے وہ آزادی اسی میں سمجھتا تھا کہ حکومت اور سماج ہر فرد کو اسکے حال پر چھوڑ دیں،

انگلستان کے علاوہ آزادی کو یہ قانونی صورت کہین نہین دی گئی ہے۔انفرادیت کے حامی بھی انگلستان کے باہر مشکل سے ملتے ہین۔اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ آزادی کا یہ تخیل کس قدر وقعت رکھتا ہے۔

تخیل تو دراصل اسے کہنا نہ چاہیئے، کیونکہ اس کے بنانے مین تخیل سے بالکل کام نہین لیا گیا۔ یہ ایک پودا ہے جو خود بخود پیدا ہو گیا اور بعد مین لوگون نے اوسکے پھل اور پھول کو پسند کیا۔اگر ہم اس کا آزادی کے دوسرے نظریون سے مقابلہ کرین تو اس کی سب سے بڑی کمزوری یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کی حمایت مین کوئی فلسفیانہ دلیل نہین پیش کی جاسکتی۔محض عملی نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو اس کے فائدے بہت ہین۔ اورانگریز اپنی آزادی پر فخر اسی وجہ سے کرتے ہین کہ اوس کے فائدے گن گن کر بتانا ناممکن ہے۔لیکن کامیابی ہی کسی چیز کی خوبی کی پوری دلیل نہین ہے جسے یہ خاص قسم کی آزادی ناپسند ہو وہ کہہ سکتا ہی کہ یہ بالکل بے کار چیز ہے، اور اس مین وہ زیادہ غلطی پر نہ ہوگا۔

ارسطو کہتا ہے "ہر ریاست کسی نہ کسی قسم کی جماعت ہوتی ہی، اور ہر جماعت کسی خاص فائدے کے لئے بنائی جاتی ہی . . . لیکن اگر ہر جماعت کا مقصد کوئی بھلائی ہوتا ہے تو ریاست، یا سیاسی جماعت کو جو سب سے اعلیٰ درجہ رکھتی ہے اور جس مین اور سب جماعتین شامل ہین، سب سے زیادہ بلند مقصد رکھنا چاہیے"، ریاست کا فلسفیانہ نظریہ جس کے بانی ارسطو اور افلاطون ہین اور عہد جدید کے بڑے حامی فرانس مین روسو، جرمنی مین ہیگل اور ایک حد تک کانٹ اور انگلستان مین گرین اور بوسانکے ہین، آزادی کی اصل اور اوس کے مقصد کو سمجھتا ہے، یعنی اوس کے نزدیک وہ

شخص جسے ریاست کے ظلم سے کوئی ڈر نہ ہو اس وقت تک ہرگز آزاد نہین جبتک
وہ سیاسی اور سماجی زندگی کے اصل مقصد سے غافل ہے اور صرف اپنی فکر مین پڑا
ہے۔ آزادی اوسے اُسی وقت مل سکتی ہے جب وہ اپنے فرائض سے پوری طرح
واقف ہو اور اون کے ادا کرنے مین اپنی بھلائی سمجھے۔ مل نے فرد کو آزادی اسی
وجہ سے دلائی ہے تاکہ وہ پوری طرح سے ترقی کر سکے، لیکن اوس نے ہر فرد کو اسقدر
خودمختار بنا دیا کہ اوس کی آزادی کا کوئی عام مقصد نہین رہتا۔ مل اس کے جواب
مین کہتا ہے کہ "کوئی پروا نہین، بلکہ یہ بہت اچھا ہے۔ اس طرح سے سماج کو اس کا
موقع نہین ملے گا کہ وہ لوگون کو اپنے خیالات پر ایمان لانے کے لئے مجبور کرے"۔ مل کا
یہ جواب بظاہر بہت خوشنما اور صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن اس مین دو غلطیان ہین:
مل نے بغیر اس بات کو ثابت کئے ہوئے یہ پہلے سے فرض کر لیا ہے کہ انسان کو اگر آزادی
دیدی جائے تو اوسے وہ خود بہترین طور پر استعمال کر سکے گا، اور اس کے لئے اوسے
سماج یا ریاست کی کسی قسم کی امداد کی ضرورت نہین۔ دوسرے یہ کہ اگر سماج یا ریاست
اپنے لئے کوئی آدرش یا نصب العین مقرر کرے تو وہ خود بخود ظلم اور زبردستی کا ذریعہ
بنجائیگا، اور اسلئے انھین بالکل خاموش الگ کھڑے رہنا چاہیئے۔

ارسطو کہتا ہے اس بات کا ثبوت کہ ریاست ایک فطری چیز ہے اور فرد پر سبقت
رکھتی ہے یہ ہے کہ انسان، اگر وہ بالکل اکیلا رہے تو اپنی ضروریات پوری نہین کر سکتا،
اور اپنے لئے وہ کافی نہین، اس واسطے اوس کا اور سماج کا تعلق جزو اور کل کا ہے۔
لیکن جو سماج مین نہین رہ سکتا جسے اپنی جسمانی اور روحانی ضروریات پوری
کرنے کے لئے کسی دوسرے کی ضرورت نہین، وہ یا تو جانور ہے یا ایک دیوتا۔ ریاست کا

وہ جز و نہین بن سکتا، ہر شخص مین سماجی زندگی کی خواہش موجود ہے۔ یہ محض پرانے زمانہ کی منطق نہین بلکہ آجکل نفسیات نے دریافت کیا ہے کہ انسان کی طبیعت مین اپنے ہم جنس کے ساتھ رہنے کی خاص ضرورت پائی جاتی ہے۔ یہی خواہش شہرون کو ضرورت سے زیادہ باشندون سے بھر دیتی ہے، یہی لوگون کو شام کے وقت سیر کرنے کو لیجاتی ہے، اِسی ضرورت کے پورا کرنے کیلئے ریاست بنی تھی، اور اسی وجہ سے وہ ریاستین بھی جن مین ظلم ہوتا ہے قایم رہتی ہین۔ انسان کسی چیز سے اتنا نہین ڈرتا جتنا تنہائی سے۔ مگر جب انسان اپنی ضرورت سے سماج مین شریک ہوتا ہے اور اوس مین شامل رہتا ہے تو اوسے ایسی خاص آزادی مانگنے کا کیا حق ہے؟

اور اگر یہ آزادی اوسے مِل بھی گئی تو کیا وہ اوسے بہترین طور پر استعمال کر سکے گا اگر سماج کوئی ظلم یا زبردستی نہ بھی کرے۔ کیا یہ کسی کی ہمّت کا کافی امتحان نہین ہے کہ اوس کے چارون طرف جو لوگ ہین، جن سے مِل جل کر رہنا اوسکی ایک ذاتی ضرورت ہے، اوس کی رائے کے خلاف ہین؟ اوس کی حرکتون سے اونھین خفگی نہ ہوئی تو تکلیف تو پہونچے گی۔ مِل کی دلی خواہش یہ ہے کہ سچائی کی جستجو ہمیشہ جاری رہے۔

اِس سے بھی انکار کرنا ناممکن ہے کہ شخصیت کا ترقی سے بہت گہرا تعلق ہے، اور وہی قوم نشو و نما پاسکتی ہے جسے شخصیت کا اور اپنے افراد کی آزادی کا خاص خیال ہو۔ تاریخ سے اِس کا ثبوت ضرور ملتا ہے کہ عام رائے اور سماج اکثر شخصیتون کی دشمن رہی ہین، لیکن اِس کے ساتھ ہمین یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دنیا کی جو عظیم الشان شخصیتین مانی جاتی ہین اونھین اپنی سماج سے بہت مدد بھی ملتی ہے، اور اون کے کارنامون مین ایک بہت بڑا حصّہ اون کی سماج کا ہے۔ جو کچھ اونھون نے کیا،

وہ اون کی سماج کی چھپی ہوئی آرزو تھی۔ جو کچھ اونھون نے کہا اوس کے سننے کے لوگ پہلے سے مشتاق تھے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ضرور ہوا ہے کہ سماج نے، یا اون لوگون نے جو سماج پر راج کر رہے تھے، اپنے یہان شخصیتون کے پیدا ہونے کا موقع نہین دیا، یا اگر کوئی شخصیت پیدا ہو گئی تو اوسے اپنا اثر ڈالنے سے روکا، لیکن ایسا نسبتہً کم ہوا ہے۔ رومن کلیسا اپنی تنگ نظری اور ظلم کے لیے مشہور رہا ہے، مگر اوس مین بہت سی شخصیتین پیدا ہوئین جن کے سامنے اوس نے اپنا سر جھکایا، اور جن کی ہستی سے اوس نے پورا فائدہ اُٹھایا۔ سختی وہ اُسی وقت کرتا تھا جب اوسے اپنا مذہبی اور کلیسائی نظام خطرہ مین نظر آتا تھا، اور اس معاملہ مین اوس کے مخالف جتنے یورپ مین پیدا ہوئے کچھ کم نہ تھے۔ ہم اگر اس زمانہ کی آزادی دیکھ کر رومن کلیسا کے افعال سے ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہین تو ہمین یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ اس وقت کے خیالات کے مطابق چل رہا تھا، اور جو خامیان اوس مین تھین وہ عام طور سے اوس زمانہ کی سماج مین اور شخصیتون مین بھی تھین۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ معلوم ہو گا کہ یورپ کو چھوڑ کر دنیا کے اور حصون مین سماج نے اپنے لیے ایک آدرش یا نصب العین مقرر کر لیا ہے، اور جو شخصیتین اُسے اِس خاص راستہ پر چلنے مین مدد دیتی ہین، اون کی وہ پوری عزّت کرتی ہے۔ جن شخصیتون کی کوشش ہوتی ہے کہ پُرانی دنیا کے بجائے ایک نئی دنیا اپنے دل کی آرزوؤن کے مطابق بنائین، اون کی سخت مخالفت ہوتی ہے، اور اون پر اکثر ظلم بھی کیا جاتا ہے۔ مسلمانون مین صوفیا نے بہت سے ایسے عقائد کا پرچار کیا ہے جنھین قرآن مجید کی تعلیم مین شمار کرنا مشکل ہو گا، لیکن اون پر عام طور سے قوم مہربان رہی۔

صوفیا کے علاوہ مسلمانون مین بہت سے فرقے پیدا ہوئے جن کی تعلیم سے اسلام کو
کسی قسم کا نقصان نہین پہونچ سکتا تھا، لیکن اون کے ساتھ بہت ظالمانہ برتاؤ
کیا گیا، صرف اِس وجہ سے کہ بجائے مسلمانون کی رہبری کرنے کے انھون نے اِسلام
کی بیجا نکتہ چینی اور اسکے اصول مین بیجا اضافہ کرنا چاہا۔

بِل تخیل کو سماج اور فرد، عام انسان اور خاص شخصیتون مین جو بنیادی، اور ایک
حد تک لاعلاج مخالفت اور عداوت نظر آتی ہے وہ زیادہ تر "مایا" ہے۔ سماج کو
زندہ رہنے اور اپنی زندگی کو سرسبز و شاداب رکھنے کیلئے شخصیتون کی ضرورت ہے،
شخصیتین سماج کے آدرشون کو اوس کی نظر کے سامنے وضاحت کے ساتھ صاف
رکھنے، سماج کی دنیاوی اور روحانی ترقی پر مہر لگانے، اور اسے سماجی
تہذیب کا جزو بنانے کیلئے ضروری ہین۔ سرسری نظر ڈالنے سے تاریخ کچھ بھی کہے،
تمدن اور تہذیب کا راز اسی مین ہے کہ سماج شخصیتون سے محبت کرے اور شخصیتین
سماج کی خدمت کرین۔

محمد مجیب۔ بی، اے (آکسن)

انتساب

(از مصنّف)

میں اِس کتاب کو اُس ذات کی عزیز اور الم افزا یاد سے معنون کرتا ہوں جو میری تمام بہترین تصنیفات کی محرّک بلکہ ایک حد تک مصنّف تھی، یعنی میری محبوب بیوی جس کا اعلیٰ جذبۂ حق و صداقت میرے تمام کاموں کا سب سے بڑا محرّک ہوتا تھا اور جس کا اظہار پسندیدگی میرے لیے سب سے بڑا انعام۔ ان تمام تصانیف کی طرح جو میں برسوں سے لکھتا رہا ہوں، میری یہ کتاب بھی اسی قدر اُس ذات سے تعلّق رکھتی ہے جس قدر کہ مجھ سے لیکن بصورتِ موجودہ اس کتاب کو اُس ذات کی نظر ثانی کا بہت کم موقع نصیب ہوا ہے۔ اِس کے بعض اجزاء مزید توجہ اور غور کے ساتھ دیکھنے کیلئے رکھ چھوڑے گئے تھے جس کا افسوس ہے کہ اب کبھی موقع میسّر نہیں آسکتا۔ اے کاش! میں اِس قابل ہوتا کہ اُن اعلیٰ خیالات اور شریفانہ جذبات کی نصف ترجمانی بھی کر سکتا، جو اسکے ساتھ قبر میں مدفون ہیں، تو میں اس سے کہیں زیادہ نفع کا موجب ہوتا جو میری کسی ایسی تحریر سے ممکن ہے جس میں اس کی بے مثل فہم و ذکا کی کوئی امداد و اعانت شامل نہ ہو

باب اوّل

دیباچہ

اِس مقالہ کا موضوعِ بحث وہ مسئلہ نہین ہی جسے آزادیِ ارادہ (مسئلہٴ قدر) کہتے ہین اور جو بدقسمتی سے اس کا مخالف سمجھا جاتا ہی جسے غلط طور پر مسئلہٴ جبر کے نام سے موسوم کیا جاتا ہی بلکہ اس کا اصل موضوع سِول یا جماعتی آزادی ہے، یعنی یہ کہ جماعت کو افراد پر جائز طور سے کس قسم کے اور کہان تک اختیارات حاصل ہین۔ یہ ایک ایسا سوال ہی جس کا ذکر عام الفاظ مین کبھی شاذ ونادر ہی آتا ہی اور اس تفصیل کے ساتھ بحث تو کبھی شکل ہی سے کیگئی ہوگی لیکن ہمارے زمانہ کے تمام مسائل متنازعہ فیہ پر اسکا بہت گہرا اثر ہی اور گمان غالب ہی کہ آیندہ چلکر یہ ایک بہت ہی اہم مسئلہ بنجائیگا۔ یہ کوئی جدید مسئلہ نہیں ہی جو اسی زمانہ مین پیدا ہو گیا ہو بلکہ یہ قدیم زمانہ سے چلا آتا ہی اور ہمیشہ سے لوگون مین اس پر کسی نہ کسی صورت مین اختلاف رائے رہا ہے، لیکن ترقی وتہذیب کے اس موجودہ دور مین جسمین بعض متمدن قومون نے ابھی قدم رکھا ہے، یہ مسئلہ نئی نئی صورتین بدلکر سامنے آرہا ہی اور ضرورت ہی کہ اس پر دوسرے طریقہ سے اور ذرا گہرائی کے ساتھ نظر ڈالی جائے

آزادی اور قوت کی یہ جنگ تاریخ کے ان تمام حصّون مین جن سے ہم سب سے پہلے

واقف ہوتے ہیں ایک ممتاز حیثیت رکھتی ہے، بالخصوص یونان، روما اور انگلستان کی تاریخ
مین۔ لیکن قدیم زمانہ مین یہ جنگ رعایا یا رعایا کے بعض طبقون اور حکومت کے درمیان
تھی۔ اس وقت آزادی سے مراد یہ لیجاتی تھی کہ لوگون کو سیاسی حکمرانون کے ظلم وستم سے
بچایا جائے۔ (بہ استثنائے یونان کی بعض جمہوری حکومتون کے) حکمرانون کے متعلق عام
طور سے یہ خیال کیا جاتا تھا کہ وہ ان لوگون سے لازمی طور پر ایک مخالفانہ حیثیت رکھتے
ہیں جن پر وہ حکومت کرتے ہین۔ حکمران یا تو ایک شخص ہوتا تھا یا ایک قبیلہ یا جماعت،
جسے یہ حکومت یا تو وراثتہً ملتی یا غلبہ کے ذریعہ سے۔ اِس حکومت کو وہ کسی صورت مین
محکومون کی مرضی سے نہین رکھتے اور ان کے تغلب کے چھیننے کی لوگ نہ تو جرأت کرتے
اور نہ غالباً خواہش رکھتے تھے، خواہ اِس اختیار کے ناجائز استعمال کے خلاف اور کوئی
تدابیر کیون نہ کیجاتین۔ ان کی اِس قوت کو بہت ضروری خیال کیا جاتا تھا، لیکن اسی قدر
اُسے خطرناک بھی سمجھا جاتا تھا۔ یہ گویا ان کے ہاتھون مین ایک ایسا حربہ تھا جسے وہ اپنی
رعایا کے خلاف اسیطرح استعمال کر سکتے تھے جس طرح کسی بیرونی دشمن کے خلاف۔ جماعت کے ضعیف
افراد کو ان بے شمار عقابون سے محفوظ رکھنے کے لیۓ ضرورت تھی کہ ایک ایسا شکاری جانور
بھی ہو جو ان سب سے زیادہ قوی اور مضبوط ہو اور ان پر اپنا پورا قابو رکھ سکے۔ لیکن چونکہ
شاہ عقاب بھی چڑیون کے شکار کرنے کا دوسرے چھوٹے چھوٹے عقابون سے کچھ کم خواہان
نہو گا، اِس لئے یہ ضروری تھا کہ اس کے چونچ اور پنجون سے محفوظ رہنے کیلیئے ایک مستقل
مدافعانہ پہلو اختیار کیا جائے۔ لہذا بہی خواہان قوم نے یہ کوشش کی کہ اس اختیار اور قوت
کو جو حکمران شخص کو جماعت پر حاصل ہے محدود کر دیا جائے اور اسی تعیین حدود کو وہ آزادی
کے لفظ سے مراد لیتے تھے۔ یہ (تعیین حدود) دو طریقون سے عمل مین لائی گئی جن مین سے ایک

تو یہ تھا کہ بعض چیزین حکمران شخص کی دست اندازی سے بالکل مستثنیٰ کرائی گئین جنھین سیاسی حقوق کے نام سے تعبیر کرتے تھے اور جن کا خیال نہ رکھنا حکمران شخص کی کوتاہی فرائض سمجھی جاتی تھی اور اگر ان حقوق کو وہ پامال کر دیتا تو کسی خاص صورت مین مزاحمت کرنا یا عام بغاوت کیلئے اٹھ کھڑا ہونا حق بجانب تسلیم کیا جاتا تھا۔ دوسرا طریقہ اور جو بعد مین اختیار کیا گیا، وہ حکمران شخص پر آئینی پابندیون کے عاید کرنے کا تھا جس کے ذریعہ سے حکمران طاقت کے بعض اہم افعال پر یہ شرط لگا دی گئی کہ وہ ان معاملات مین قوم کی یا قوم کی کسی جماعت کی جو اسکے مفاد کی نمایندہ خیال کیجاتی ہو، مرضی حاصل کرے۔ ان دو نو مین سے پہلے طریقہ پر تو اکثر یورپی ممالک کی حکمران طاقتون کو کم وبیش مجبور کیا گیا کہ وہ اس طریقہ کو اختیار کرین۔ لیکن دوسرے طریقہ کو تسلیم کرانے کیلئے یہ ممکن نہ تھا اور اس طریقہ کو تسلیم کرانا یا جہان یہ کسیقدر رائج تھا، اسے پورے طور پر منوانا ہر جگہ محبان آزادی کا خاص مقصد بنگیا۔ اور جب تک کہ لوگ ایک دشمن کو دوسرے دشمن کے خلاف لڑانے اور اپنے اوپر ایک آقا کی حکومت اس شرط کے ساتھ رکھنے پر راضی تھے کہ وہ کم وبیش اس کے ظلم سے محفوظ رہین گے، اسوقت تک انھون نے اپنی خواہشات کو اس سے آگے نہین بڑھنے دیا۔

لیکن معاملات انسانی کی ترقی مین ایک زمانہ ایسا آیا جبکہ لوگون نے یہ خیال ترک کر دیا کہ حکمرانون کیلئے یہ کوئی ضروری شے ہے کہ وہ اپنی جگہ پر خود مختار ہون اور مفاد کے اعتبار سے ان کے مخالف رہین۔ انھین زیادہ بہتر یہ معلوم ہوا کہ ریاست کے تمام حکام ان کے کارپرداز یا مندوب ہون جو ان کی مرضی کے مطابق جب ضرورت ہو معزول کیئے جاسکین۔ صرف اسی ایک صورت مین انھین پورے طور پر اطمینان ہو سکتا تھا کہ حکومت کے اختیارات ان کے مفاد کے خلاف کبھی استعمال نہین کیئے جائین گے۔ رفتہ رفتہ انتخابی اور غیر مستقل حکمرانون کے

رکھنے کا یہ جدید مطالبہ جمہوری فرقہ کی کوششوں کا جہان کہین بھی ایسی کوئی جماعت تھی، خاص مقصد بنگیا اور ایک بڑی حد تک اس مطالبہ نے ان پہلی کوششون کی جگہ لے لی جو حکمرانون کے اختیارات کو معین کر دینے کیلئے کیجارہی تھین۔ جسوقت کہ عارضی انتخاب کے ذریعہ حکمرانی کی قوت پیدا کرنیکی کوشش کیجارہی تھی، بعض لوگون کو یہ خیال ہونے لگا کہ خود تعیین اختیارات کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دیدی گئی ہے۔ بعض یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ تو ان حکمرانون کے خلاف ایک تدبیر تھی جن کے مفاد عام طور سے لوگون کے مفاد کے مخالف ہوتے تھے۔ اب جس چیز کی ضرورت تھی وہ یہ کہ حاکم اور رعایا دونوں ایک ہونے چاہئیں حکام کا مفاد اور ان کی مرضی خود رعایا کا مفاد اور اس کی مرضی ہونا چاہئیے۔ قوم کو خود اپنی مرضی کے خلاف محفوظ رکھنے کی ضرورت نہین ہے۔ اس بات کا کوئی اندیشہ نہیں کہ وہ آپ اپنے اوپر ظلم کرنے لگے گی۔ چاہیئے یہ کہ حکام پورے طور پر قوم کے جوابدہ ہون۔ قوم جب چاہے انھین معزول کر سکے اور اسے حق ہو کہ وہ انھین خود اختیارات تفویض کرے اور جن کے استعمال کرنے کا طریقہ وہ خود انھین بتائے۔ حکام کی قوت خود قوم کی قوت ہے، جو ایک جگہ اور ایک ایسی شکل مین جمع کر دی گئی ہے جس سے اسکے استعمال مین آسانی ہو۔ اس قسم کا خیال یا جذبہ یورپ کے آزادی پسند لوگون کی گزشتہ نسل مین بہت عام تھا۔ اور انگلستان کے علاوہ یورپ کے اس قسم کے ایک طبقہ مین یہ خیال اب بھی بہت نمایان طور پر موجود ہے۔ جن لوگون کا یہ خیال ہے کہ حکومت کے تمام افعال پر بہ استثنا ایسی حکومتون کے جن کا وجود ہی ان کے خیال مین نہونا چاہیئے، ہر قسم کی پابندیان عاید کرنی چاہئیں، وہ اس وقت براعظم یورپ کے سیاسی مفکرین مین چند مستثنیٰ ہستیاں ہین۔ اس قسم کا خیال خود ہمارے ملک انگلستان میں بھی اس وقت تک خوب پھیلتا رہتا،

اگر وہی حالات جو اس کے رواج دینے مین ایک عرصہ تک معاون ہوئے بدستور قایم رہتے۔ لیکن سیاسی اور فلسفیانہ نظریون اور اشخاص کے معاملہ مین کامیابی اُن تمام خامیون اور کمزوریون کو بالکل آشکارا کردیتی ہے جو ناکامی کی صورت مین نظرون سے پوشیدہ رہجاتین جب جمہوری حکومت ایک ایسی چیز تھی جس کا لوگ بس خواب دیکھتے یا جسکے متعلق کتابون مین پڑھتے تھے کہ وہ کبھی قدیم زمانہ مین موجود تھی، تو اس صورت مین یہ خیال کہ لوگون کو اسبات کی کوئی ضرورت نہین ہے کہ اپنے اختیارات کو خود اپنے اوپر محدود کرین، ایک بالکل بدیہی امر معلوم ہوتا ہوگا اس خیال مین انقلاب فرانس جیسے عارضی واقعات سے بھی کچھ رکاوٹ پیدا نہین ہوئی، جن کا تاگوار پہلو چند افرادِ غاصب کے افعال کا نتیجہ تھا اور جو کسی طرح جمہوری ادارون کی مستقل کارفرمائی کے نتایج نہ تھے، بلکہ اس اتفاقیہ اور ناگہانی ہنگامہ سے متعلق تھے جو بادشاہ اور امراء کے استبداد کے خلاف پیدا ہوا تھا لیکن ایک زمانہ آیا جبکہ جمہوری حکومت روئے زمین کے ایک بڑے حصہ پر قایم ہوگئی اور اقوام کی مجلس مین سب سے طاقتور عنصر محسوس کیجانے لگی اور انتخابی اور ذمہ دارانہ طرز کی حکومت اُس تمام تنقید وتبصرہ کا موضوع بنگئی جو کسی عظیم الشان واقعہ کا حصہ ہوتا ہے۔ اب یہ معلوم ہونے لگا کہ "حکومت خود اختیاری" اور "لوگون کے خود اپنے اوپر اختیارات" اِس قسم کے الفاظ صحیح مفہوم کو نہین ادا کرتے ہین۔ وہ "لوگ" جو اِن اختیارات سے کام لیتے ہین ہمیشہ وہی لوگ نہین ہوا کرتے جن پر کہ یہ اختیارات استعمال کیے جاتے ہین اور جس "حکومت خود اختیاری" کا ذکر کیا جاتا ہے وہ "وہ حکومت نہین ہے جو ہر شخص اپنے اوپر کرتا ہے بلکہ وہ حکومت ہے جو باقی لوگ اسپر کرتے ہین۔ علاوہ اسکے عوام کی مرضی کے معنی عملاً عوام کی سب سے زیادہ تعداد یا سب سے زیادہ بااثر حصہ کی مرضی کے ہین یعنی اکثریت کی

یا ان کی جو اپنے کو اکثریت تسلیم کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ بہت ممکن ہے کہ "لوگ" اپنے کسی حصہ پر ظلم کرنا چاہیں اسلئے اِس کے خلاف بھی تدابیر اختیار کرنا اسی قدر ضروری ہے جس قدر کسی اور قوت کے بیجا استعمال کے خلاف۔ لہذا افراد پر حکومت کے اختیارات کو محدود کرنے کی اہمیت میں اسوقت بھی کسی طرح کمی نہیں آتی، جب صاحبِ اختیار جماعت قوم یعنی اس کی سب سے قوی جماعت کے سامنے جوابدہ ہو۔ یہ نقطۂ خیال یورپ کے مفکرین اور ان جماعتوں کے رجحانات کے موافق پڑا جن کے حقیقی یا فرضی مفاد کے متعلق یہ خیال تھا کہ جمہوریت اسکے خلاف پڑتی ہے اسلیئے اسکے قائم ہونے میں کوئی دشواری پیش نہ آئی اور سیاسی خیالات میں "اکثریت کے ظلم" کو آج بالعموم ان برائیوں میں شمار کیا جاتا ہے جن سے بچنے کیلئے جماعت کو ہمیشہ تیار رہنا چاہیئے۔

دوسرے قسم کے مظالم کی طرح اکثریت کا ظلم بھی پہلے پہل بہت خطرناک خیال کیا جاتا تھا اور اب بھی سمجھا جاتا ہے، بالخصوص جب کہ یہ حکام کے ہاتھوں سے ظہور میں آتا ہے۔ لیکن اہل نظر نے سوچا کہ جب جماعت خود ہی ظالم ہے یعنی یہ کہ بہ حیثیت مجموعی وہ اپنے ان افراد پر جن سے کہ وہ مرکّب ہے، خود ہی ظلم کرتی ہے تو اس صورت میں اِس کے ظلم کرنے کے طریقے صرف ان افعال تک محدود نہیں رہتے جو اِس کے سیاسی عمّال کے ہاتھوں سے انجام پاتے ہیں۔ جماعت خود اپنے احکام نافذ کر سکتی ہے اور کرتی ہے اور اگر یہ صحیح احکام کی بجائے غلط احکام نافذ کرے یا ایسے امور کے متعلق احکام نافذ کرے جن میں اسے کوئی دخل نہ دینا چاہیئے تو یہ ایک جماعتی ظلم کرتی ہے جو اکثر سیاسی مظالم سے کہیں زیادہ سخت ہے کیونکہ ہر چند اسکے ان احکام پر عموماً کوئی سخت سزا نہیں ہوتی ہیں تاہم وہ اِن سے بچنے کے بہت کم ذرائع باقی رکھتی ہے اور زندگی کے ادنیٰ سے ادنیٰ شعبوں میں بھی دخل دینے

لگتی ہو اور انسان کی روح تک کو اپنا غلام بنا لیتی ہو۔ لہٰذا صرف حاکم ہی کے ظلم سے بچنا کافی نہین ہو بلکہ مروجہ آرا اور خیالات کے ظلم سے بھی بچنے کی ضرورت ہو اور جماعت کے اِس رجحان سے کہ وہ قانونی سزاؤن کے علاوہ اور دوسرے طریقون سے اپنے خیالات اور اعمال کو اُن لوگون پر بطور قوانین زندگی کے عاید کرنا چاہتی ہے جو ان خیالات و اعمال ہو اختلاف رکھتے ہین، وہ تمام ترقی کو یک لخت مسدود کر دینا چاہتی ہے اور اگر ممکن ہو تو وہ ہر اُس انفرادیت کی تعمیر کو بھی روک دے جو اس کے طریقون سے مطابقت نہین رکھتی، اور تمام لوگون کو چاہتی ہے کہ وہ اپنے اخلاق و عادات اس کے نمونے کے مطابق بنائین۔ جماعت کی رائے کی انفرادی آزادی مین مداخلت کرنے کی ایک حد ہوتی ہو۔ اور اس حد کو معلوم کرنا اور اُسے بیجا مداخلت کے مقابل مین برقرار رکھنا انسانی فلاح و بہبود کے لیے ویسا ہی ناگزیر ہے جیسا سیاسی استبداد کے خلاف تحفظ۔

لیکن اگرچہ عام طور پر اس مسئلہ کی زیادہ مخالفت کا احتمال نہین، تاہم یہ عملی سوال کہ یہ حد کہان مقرر کیجائے اور انفرادی آزادی اور جماعت کے اختیارات مین کس طرح مطابقت پیدا کیجائے ایک ایسا موضوع ہے جس کے متعلق ابھی تقریبًا سب کچھ کرنا باقی ہو۔ تمام وہ باتین جو انسان کے وجود کو اس کیلئے قابل قدر بناتی ہین، ان سب کا انحصار صرف اِس امر پر ہے کہ دوسرے لوگون کے افعال پر قیود عاید کی جائین لہٰذا چند ایسے قواعد و ضوابط ضرور مقرر کرنے چاہئین، جو پہلے تو قانون کے ذریعہ سے عمل مین لائے جائین اور جن اُمور مین قانون کا دخل دینا مناسب نہو ان مین رائے عامہ کے ذریعہ سے مقرر کیئے جائین۔ یہ قواعد کس قسم کے ہون، معاملات انسانی مین یہی سب سے بڑا سوال ہے۔ لیکن اگر ہم بعض بہت ہی بدیہی اُمور کو مستثنیٰ کردیں تو پھر یہ ان سوالوں میں سے ہو جاتا ہے

جن کے حل کرنے مین سب سے کم ترقی کی گئی ہی۔ کبھی دو زمانون اور شاذ ہی کبھی دو ملکون مین اِس کا فیصلہ یکسان کیا گیا ہی اور ایک زمانہ یا ملک کا فیصلہ دوسرے زمانہ یا ملک کیلیئے ہمیشہ حیرت و استعجاب کا باعث رہا ہی۔ پھر بھی کسی ایک خاص زمانہ یا ملک کے لوگ اِس مین کوئی دشواری نہین سمجھتے اور یہ خیال کرتے ہین کہ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس پر تمام بنی نوع انسان کا ہمیشہ اتفاق تھا۔ جو رسوم و قواعد ان مین رائج ہوتے ہین، انھین وہ بالکل بدیہی اور حق بجانب سمجھتے ہین۔ یہ عالمگیر فریبِ نظر رسم و رواج کے طلسمی اثر کی ایک مثال ہی، جو نہ صرف بمصداق ضرب المثل ایک فطرت ثانیہ ہوجاتی ہے بلکہ ہمیشہ غلطی سے فطرت اولی سمجھ لیجاتی ہی۔ رسم و رواج کا یہ اثر کہ وہ انسانی قواعد کے متعلق کوئی بے اعتباری نہ پیدا ہونے دے، اِس خیال کی بنا پر اور مکمل ہوجاتا ہی کہ یہ ایک ایسا موضوع ہی جس پر عموماً یہ ضروری نہین سمجھا جاتا کہ ایک شخص دوسرے کے سامنے یا خود اپنے لیئے وجوہ اور دلائل بھی پیش کرے۔ لوگ یہ یقین کرنے کے اکثر عادی ہوتے ہین اور بعض ایسے لوگون نے جو خود فلسفی بننا چاہتے ہین، انھین اِس بات کا عادی بنادیا ہے کہ اِس قسم کے موضوع پر انکے جذبات ان کے دلائل سے زیادہ بہتر ہین ان کے سامنے دلائل کی کوئی ضرورت نہین ہی۔ لیکن جو عملی اصول کہ انسانی اخلاق و عادات کے بنانے مین ان کے خیالات کی رہنمائی کرتا ہی، وہ یہ جذبہ ہے جو ہر ایک کے دل مین موجود ہوتا ہی کہ ہر شخص کو اسی کے مطابق عمل کرنا چاہیئے جیسا کہ وہ خود چاہتا ہے، یا وہ لوگ جن سے اسے ہمدردی ہے، پسند کرتے ہین۔ اِس مین شبہ نہین کہ کوئی شخص خود اپنے سے یہ اقرار نہین کرتا کہ اس کا معیار فیصلہ اس کی ذاتی پسند ہی بلکہ اخلاق و عادات کے متعلق کوئی رائے پر دلائل نہ پیش کیئے گیئے ہون صرف ایک ہی شخص کی پسند کہی

جا سکتی ہے اور اگر یہ دلائل بھی محض دوسرے لوگوں کی پسند ہوں تو پھر اس صورت میں بھی ایک کی بجائے بہت سے لوگوں کی خواہش ہوگی۔ بہرحال ایک معمولی شخص کے لیئے خود اسکی پسند نہ صرف یہ کہ پورے طور پر قابل اطمینان دلیل ہے بلکہ یہی ایک واحد دلیل ہے جو وہ اخلاق، ذوق، صحت و عدم صحت اُن سب چیزوں کے متعلق رکھتا ہے جو اس کے مذہبی معتقدات میں صاف صاف نہیں لکھے ہیں بلکہ خود ان معتقدات کے سمجھنے میں بھی یہی شے اس کی سب سے بڑی رہبر ہوتی ہے۔ چنانچہ مستحسن اور غیر مستحسن چیزوں کے متعلق لوگوں کی رایوں پر تمام ان مختلف النوع اسباب کا اثر پڑتا ہے جن سے دوسروں کے اخلاق و عادات کے متعلق ان کی خواہشات اثر پذیر ہوتی ہیں اور یہ اسباب اسی قدر کثرت سے ہوتے ہیں جسقدر کہ وہ جو کسی دوسری بات میں ان لوگوں کی خواہشات پر اثر ڈالتے ہیں۔ یہ اسباب بعض وقت خود ان کی عقل و فہم، کبھی ان کے تعصبات و توہمات، اکثر ان کے معاشرتی تعلقات اور کبھی ان کے رشک و حسد یا نخوت و داری وغیرہ اور نفرت و حقارت کے جذبات ہوتے ہیں لیکن ان سب سے زیادہ ان کا اپنا جذبۂ خوف و خواہش اور جائز و ناجائز خودغرضی کا جذبہ ہوتا ہے۔ جہاں کہیں کوئی غالب طبقہ ہوتا ہے وہاں اس ملک کے اخلاق کا بیشتر حصہ اس طبقہ کے اپنے مفاد یا جماعتی تفوق کے جذبات سے ماخوذ ہوتا ہے اہل اسپارٹا[1] اور ہیلیٹ میں

[1] سپارٹا قدیم یونان کا ایک صوبہ تھا جہاں بعد میں ایک نہایت مضبوط سلطنت قائم ہوگئی، یہاں کے باشندے نہایت قوی، مضبوط اور بہادر ہوتے تھے اسلیئے کہ انھیں ہمیشہ اپنی ماتحت رعایا ہیلوٹ سے خطرہ لگا رہتا تھا۔ ابتدا ہی سے اسپارٹا والوں کی تعلیم و تربیت اس قسم کی کیجاتی تھی جس سے ان میں جنگی جذبہ اور فوجی صلاحیت پیدا ہو۔ سات ہی سال کی عمر سے بچہ ماں کی گود سے جدا کر لیا جاتا تھا اور خاص طریقہ پر اس کی تعلیم و تربیت ہوتی تھی۔ انھیں ہر طرح کی تکلیف برداشت کرنے کا عادی بنایا جاتا تھا۔ انھیں کھانے کو معمولی غذا میں اور پہننے کو (بقیہ صفحہ آیندہ پر)

یورپ کے مالکان کاشت اور افریقہ کے حبشیوں کے درمیان، حاکم و رعایا کے درمیان، اُمرا و غربا کے درمیان، مردوں اور عورتوں کے درمیان جو اخلاق رائج ہیں وہ زیادہ تر انہی طبقہ وارانہ مفاد و جذبات کے نتائج ہیں اور جو جذبات اِس طرح پیدا ہوتے ہیں، وہ اخلاقی اعتبار سے اس اعلیٰ جماعت کے لوگوں پر ان کے آپس کے تعلقات میں اپنا بہت اثر ڈالتے ہیں۔ برعکس اس کے جہاں کسی با اقتدار طبقہ کا اقتدار زائل ہو گیا ہو، یا جہاں اس کا

(بقیہ مضمون صفحہ گذشتہ) موٹے جھوٹے کپڑے اور سونے کو صرف ایک کھردری چٹائی دیجاتی تھی۔ انھیں ننگے پاؤں چلنے سخت سے سخت سزائیں برداشت کرنے اور اپنے حکام اور افسروں کی بیچون و چرا فرمانبرداری کرنی پڑتی تھی۔ بیس سال کی عمر سے فوجی خدمت ان کے سپرد کر دیجاتی تھی۔ لڑکیوں کی تعلیم و تربیت بھی کم و بیش اسی طرح پر ہوتی تھی اور ورزشی کھیلوں اور فوجی قواعد میں انھیں لڑکوں کے دوش بدوش شریک ہونا پڑتا تھا۔ انھیں یہ تعلیم دیجاتی تھی کہ وہ اپنے بیٹوں اور شوہروں کو اپنی نہیں بلکہ ریاست کی ملک سمجھیں۔ گھر میں جب کوئی کمزور یا لاغر بچہ پیدا ہوتا تھا تو ماں اُسے لیکر ایک ویران اور غیر آباد پہاڑ پر چھوڑ آتی تھی تاکہ آیندہ نسل کمزور نہ ہو۔

یہ سب کچھ اسلیئے تھا کہ انھیں ہمیشہ اپنی ماتحت رعایا ہیلوٹ سے خطرہ لگا رہتا تھا جو ملک کے اصلی باشندے تھے اور تعداد میں ان سے کہیں زیادہ تھے یہ لوگ غلاموں کی طرح سے رکھے جاتے تھے اور انھیں کسی قسم کی آزادی یا ملکی حقوق حاصل نہ تھے ان کا پیشہ زیادہ تر زراعت و کاشتکاری تھا جسکی نصف پیداوار انھیں اپنے آقاؤں کو دیدینا پڑتا تھا یہ زمین ہی کے ساتھ وابستہ رہتے تھے۔ جنگ کے زمانے میں انھیں اپنے آقاؤں کی فوجی خدمت بجالانی ہوتی تھی اور امن کے زمانے میں بھی وہ ہر طرح کی ان کی خدمات انجام دیتے تھے۔ لیکن اسکے عوض انھیں ملکی و سیاسی معاملات میں کسی قسم کے حقوق حاصل نہ تھے بلکہ غلاموں کی طرح وہ دن و رات ان کے جوے کے نیچے رہتے تھے۔ اہل اسپارٹا ان پر ہر طرح کی سختی اور تشدد کرنے کی کوشش کرتے تھے اور وہ ان کے نیچے سے نکلنے کی فکر میں رہا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آئے دن انکی طرف سے شورشیں اور بغاوتیں ہوتی رہتی تھیں جس سے اہل اسپارٹا کو ہمیشہ خطرہ لگا رہتا تھا۔

اقتدار لوگون مین غیر مقبول ہوگیا ہو وہان کے عام اخلاقی جذبات مین اس اقتدار سے ایک سخت قسم کی نفرت پائی جاتی ہو عمل اور اجتناب دونون صورتون مین ان اعمال زندگی کے تعیّن کا جو قانون کے ذریعہ یا رائے عامہ کے وسیلہ سے رواج پاگئے ہین، ایک اور بڑا اُصول یہ بھی ہو کہ لوگ اپنے دنیوی حاکمون یا اپنے دیوتاؤن کی فرضی رغبتون اور کراہیتون کی غلامی کرتے ہین۔ یہ غلامی بالکل خودغرضی پر مبنی ہوتی ہے لیکن ریاکارانہ نہین ہوتی۔ اِس سے نفرت کے نہایت سخت جذبات پیدا ہوتے ہین۔ اِسی کی وجہ سے لوگون نے ساحرون اور منکرون کو زندہ آگ مین جلایا۔ جذباتِ اخلاق کے بنانے مین منجملہ بہت سے ادنیٰ اثرات کے جماعت کے عام اور ظاہر مفاد کا بلاشبہ ایک بہت بڑا حصہ ہو اور یہ حصہ عقل پر اور خود اِس مفاد پر مبنی نہین بلکہ اس ہمدردی و عداوت کا نتیجہ ہو، جو ان سے پیدا ہوتی ہو۔ اِس کے علاوہ اِس ہمدردی و عداوت کے جذبات کا بھی جنکو جماعت کے مفاد سے کچھ بھی تعلق تھا، ان اخلاق کے بنانے مین ایسا ہی قوی اثر رہا ہے۔

جماعت یا اس کے کسی با اقتدار حصہ کی پسندیدگی و عدم پسندیدگی ایک ایسی چیز ہے جس سے عملاً وہ تمام عام اصول و قواعد بنے ہین جو قانون یا رائے عامہ کی سزا کے خوف سے عمل مین آتے ہین اور عام طور پر جو لوگ خیالات و جذبات کے لحاظ سے جماعت سے آگے بڑھے ہین، انھون نے اُصولاً اِس چیز کو جون کا تون رہنے دیا ہے، خواہ اِس کے بعض فروع مین انھین کسی قدر اختلاف بھی کیون نہ رہا ہو۔ بجائے اِسکے کہ وہ یہ معلوم کرتے کہ آیا جماعت کی پسندکردہ و ناپسندکردہ چیزون کو افراد کے لیئے قانون بنانا چاہیئے یا نہین، انھون نے زیادہ تر اپنی توجہ اِس امر کے دریافت کرنے مین صرف کی ہو کہ جماعت کو کون کون سی چیزین پسند کرنی چاہئین اور کون کون سی ناپسند۔ انھون نے ان مخصوص اُمور

کے متعلق جن پر انھیں خود اختلاف تھا لوگوں کے جذبات بدلنے کی زیادہ کوشش کی بجائے
اس کے کہ آزادی کی حمایت میں وہ عام مخالفین کا ساتھ دیتے۔ ایک دو افراد سے قطع نظر
اگر لوگوں نے کہیں اُصول کا ساتھ دیا ہو اور استقلال کے ساتھ اسے برقرار بھی رکھا ہے، تو
وہ مذہبی اعتقاد کا معاملہ ہے، یہ بات بہت سی حیثیتوں سے سبق آموز ہے، اور سب سے
بڑھکر اس لحاظ سے کہ یہ اُس شے کے جسے اخلاقی احساس کہتے ہیں غلطی پذیر ہونے کی ایک
نہایت بین مثال ہے۔ اِس لئے کہ ایک مخلص متعصب شخص میں دوسروں کے معتقدات سے جو
مذہبی نفرت ہوتا ہے، وہ اخلاقی شعور کی ایک نہایت صاف اور بین مثال ہے۔ عیسائیوں میں
جن لوگوں نے سب سے پہلے اس فرقہ کا جوا اپنے کندھوں سے اُتارا جو اپنے کو کلیسائے
عالمگیر کہتا تھا، وہ عام طور پر خود بھی مذہبی معاملات میں اختلاف رائے کے لئے اتنے ہی
کم آمادہ تھے جتنا کہ خود وہ فرقہ کلیسا ہی۔ لیکن کشمکش و تصادم کی سرگرمیاں ختم ہو گئیں اور
دونوں میں سے کسی فریق کو کامل فتح حاصل نہ ہوئی ادھر کلیسا یا فرقہ نے اپنی اپنی امیدوں کا
دائرہ اس حد تک محدود کر لیا کہ صرف اسی حیثیت کو باقی رکھے جو اسے اُس وقت حاصل
تھی۔ قلیل التعداد جماعتوں نے جب یہ دیکھا کہ انھیں اکثریت نصیب ہونے کا کوئی
موقع نہیں ہے تو انھیں ان لوگوں سے جن کو وہ اپنے مسلک پر نہ لا سکے تھے، یہ کہنا پڑا کہ وہ انھیں
کم از کم اختلاف ہی کرنیکی اجازت دیں۔ چنانچہ یہی وہ واحد میدان جنگ ہے کہ جہاں پر
اُصولی حیثیت سے افراد کے حقوق کو جماعت سے منوانے کی کوشش کی گئی اور مخالفین پر
جماعت کے دعوائے تحکم کی علانیہ مخالفت کی گئی۔ تمام بڑے بڑے اہل قلم نے جن کی کہ دنیا
اپنی تھوڑی سی بہت مذہبی آزادی کے لئے رہین منت ہے، اکثر یہ دعویٰ کیا ہے
کہ آزادی ضمیر ایک ناقابل انکار حق ہے اور انھوں نے اس بات سے قطعاً انکار

کیا ہو کہ کوئی شخص اپنے مذہبی اعتقاد کیلئے دوسروں کا جوابدہ ہو۔ تاہم جن باتوں کا لوگوں کو واقعی خیال ہوتا ہے ان میں عدم رواداری کا اظہار انسان کے لئے کچھ ایسا قدرتی ہے کہ اب تک مذہبی آزادی پورے طور پر کہیں مشکل ہی سے حاصل ہوئی ہے، سوائے ایسی جگہوں کے جہاں مذہب سے بے اعتنائی نے جو اپنے امن و امان میں مذہبی جھگڑوں کی وجہ سے خلل پیدا کرنا نہیں چاہتی، ترازو کے اس پلڑے میں اپنا سارا وزن ڈالدیا ہو۔ تقریباً تمام مذہبی اشخاص کے دلوں میں حتیٰ کہ ان ملکوں میں بھی جہاں بہت زیادہ رواداری برتی جاتی ہے، رواداری برتنے کا یہ فرض بہت سی احتیاطوں کے ساتھ تسلیم کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کلیسا کے نظم و نسق کے معاملہ میں اختلاف کو گوارا کر سکتا ہے لیکن مذہبی اعتقادات کے معاملہ میں وہ اسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتا۔ ایک شخص ہر ایک کے ساتھ نباہ کر سکتا ہے لیکن اگر نہیں کر سکتا تو ایک پیپسٹ[۱] یا یونی ٹیرین[۲] کے ساتھ۔ ایک شخص صرف ایسے لوگوں کو گوارا کر سکتا ہے جو الہامی مذہب کے ماننے والے ہوں۔ بعض لوگ اس سے ذرا اور آگے بڑھتے ہیں لیکن خدا اور آخرت کے اعتقاد پر جا کر رک جاتے ہیں۔ جہاں کہیں اکثریت کے جذبات زیادہ حقیقی اور سخت رہے ہیں وہاں اکثر دیکھا گیا ہے کہ اس نے اپنے اس مطالبہ میں بہت کم کمی کی ہے کہ (خیالات میں) اس کی اتباع کیجائے۔

انگلستان میں ہماری سیاسی تاریخ کے بعض عجیب و غریب حالات کی وجہ سے رائے عامہ کا جوا یورپ کے اکثر ممالک کے مقابلہ میں غالباً زیادہ بھاری اور قانون کا

---

[۱] پیپسٹ ان عیسائیوں کو کہتے ہیں جو کلیسائے روم کے پیرو ہیں اور جو اسکے تمام معتقدات پر ایمان رکھتے ہیں۔ [۲] یونی ٹیرین ان عیسائیوں کو کہتے ہیں جو تثلیث کے قائل نہیں ہیں بلکہ ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں اور حضرت مسیح کو محض ایک پیغمبر اور مصلح کی حیثیت سے مانتے ہیں۔

نسبتہً ہلکا رہا ہے۔ اور یہاں مجالس تقننہ یا مجالس تنفیذیہ کی طرف سے افراد کے نجی معاملات مین براہِ راست دخل دینے پر بہت زیادہ ناراضگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور یہ اظہار ناراضگی انفرادی آزادی کے خیال سے اتنا نہیں کیا جاتا جتنا کہ اس خیال کی بنا پر جو ابتک قایم ہے کہ حکومت مفاد عامہ کے مخالف مفاد کی ترجمان ہوتی ہے۔ اب تک یہان کی اکثریت نے یہ محسوس کرنا شروع نہیں کیا ہے کہ حکومت کی قوت خود اپنی قوت ہے اور اس کی رائے خود اپنی رائے ہے۔ جب وہ ایسا محسوس کرنے لگے گی تو اُس وقت انفرادی آزادی حکومت کی زد مین بھی اسی قدر آجائیگی جسقدر کہ وہ آج رائے عامہ کی زد مین ہے لیکن اس وقت تک ملک مین اِس قسم کے جذبات بہت کافی موجود ہین جو قانون کی کسی ایسی مداخلت کے خلاف فوراً اُبھارے جاسکتے ہین جو افراد کے ان معاملات مین کیجائے جن مین کہ وہ اب تک قانون کی حکومت کے عادی نہیں رہے ہین۔ اور اِس معاملہ مین اِس قسم کا فرق بہت کم کیا جاتا ہے کہ آیا یہ معاملہ قانون کی حکومت کے جائز دایرہ حدود مین ہے یا نہیں؟ اور یہ جذبہ یہان تک پایا جاتا ہے کہ باوجودیکہ بہ حیثیت مجموعی یہ بہت ہی مفید ہے لیکن اِس کا استعمال اکثر جتنی جگہ صحیح بنیاد پر ہوتا ہے اتنی ہی جگہ غلط مواقع پر بھی کیا جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ کوئی ایسا مسلمہ رسمی اُصول نہیں ہے جس سے حکومت کے دست اندازی کی صحت یا عدم صحت مین تمیز کی جاسکے۔ لوگ زیادہ تر اپنے ذاتی رجحانات کے لحاظ سے فیصلہ کرتے ہین۔ بعض لوگ جس وقت دیکھتے ہین کہ حکومت کی مداخلت سے اچھا کام ہوسکتا ہے یا کوئی برائی رفع کی جاسکتی ہے تو وہ نہایت خوشی سے حکومت کو اس کام کے لیئے آمادہ کرتے ہین اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہین کہ خواہ کتنا ہی معاشرتی نقصان ہورہا ہو وہ اِس نقصان کو گوارا کرلین گے، لیکن

مفاد انسانی کے اِن شعبوں مین جو حکومت کے زیر اثر ہین ایک کا اور اضافہ کرنا کسی طرح گوارا نہ کرینگے۔ اور لوگ اپنے جذبات کے اِس عام میلان کی بنا پر یا اس کام مین اپنی دلچسپی کی مقدار کے لحاظ سے جسے وہ حکومت سے کرانا چاہتے ہین، یا اپنے اِس عقیدہ کی بنا پر جو وہ حکومت کی طرف سے رکھتے ہین کہ وہ ان کی خواہش کے مطابق کرے گی یا نہین، وہ ہر ایک ایسے معاملہ مین ایک نہ ایک طرف ہو جاتے ہین۔ لیکن کسی ایسی رائے کی بنا پر ایسا بہت کم کرتے ہین جس پر وہ استقلال کے ساتھ قایم ہون کہ کونسی چیزین حکومت کے کرنے کی ہین۔ میرے نزدیک کوئی قاعدہ یا اُصول نہونے کی وجہ سے ہر ایک فریق اِس وقت اِسی قدر غلطی پر ہے جس قدر دوسرا ہے۔ حکومت کی مداخلت کی جتنی مرتبہ نہایت بیجا طور سے خواہش ظاہر کی جاتی ہے اُتنی ہی دفعہ نہایت بیجا طور سے اس سے نفرت کا اظہار بھی کیا جاتا ہے۔

اِس مقالہ کی غرض یہ ہے کہ ایک نہایت سیدھا سادہ ایسا اُصول پیش کیا جائے جو جبر او رقابو کے معاملہ مین جماعت اور افراد کے تعلقات پر پورے طور سے کارفرمائی کرے، خواہ اس کے ذریعے قانونی سزاؤن کی صورت مین مادّی قوت سے کام لینا ہو یا رائے عامہ کی شکل مین اخلاقی دباؤ ہو۔ وہ اُصول یہ ہے کہ جس مقصد کی بنا پر انسان کو انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے دوسرون کی آزادیِ عمل مین دخل دینے کا اختیار دیا گیا ہے، وہ مقصد صرف یہ ہے کہ انسان اپنی ذات کی آپ حفاظت کرے۔ جس غرض سے کہ کسی متمدن جماعت کے رکن پر بجا طور سے اس کی مرضی کے خلاف قوت کا استعمال کیا جا سکتا ہے وہ یہ ہو کہ دوسرون کو اس کے ضرر سے محفوظ رکھا جائے۔ خود اس کا نفع خواہ وہ جسمانی ہو یا اخلاقی، اس استعمالِ قوت کی کوئی کافی وجہ نہین ہو سکتا۔ اسے

کسی کام کے کرنے یا کسی چیز کے برداشت کرنے کے لیۓ اِس بنا پر مجبور نہین کیا جا سکتا کہ یہ اس کی فلاح و بہبود، یا اس کی مسرت و خوشی کا باعث ہوگا، یا اسلیئے کہ دوسرون کی رائے مین ایسا کرنا دانشمندی یا صحیح ہوگا۔ یہ باتین اس سے شکوہ و شکایت اور بحث و تکرار کرنے یا اسے ترغیب دلانے اور درخواست کرنے کے لیۓ مناسب وجوہ ہو سکتی ہین۔ لیکن اسے مجبور کرنے کے لیۓ یا بصورت عدم تعمیل کوئی نقصان پہونچانے کیلئے ہرگز مناسب نہین۔ اِس بات کو حق بجانب قرار دینے کے لیۓ ضرورت ہے کہ جس فعل سے اسے روکنا منظور ہو اسکے متعلق یہ اندازہ کر لیا جاۓ کہ اس سے کسی اور کو ضرور نقصان پہونچے گا۔ کسی شخص کے افعال کا وہ حصہ جس کے لیۓ وہ جماعت کا جوابدہ ہے، صرف اسی قدر ہے جس کا تعلق دوسرون سے ہو۔ لیکن وہ حصہ جس کا تعلق صرف اس کی ذات اور اسکی آزادی سے ہو، اس مین کوئی مداخلت اور کسی قسم کی دست اندازی ہی نہین ہو سکتی۔ ہر فرد اپنی ذات اور اپنے جسم کا حاکم مطلق ہے۔

اِس امر کے بیان کرنیکی غالباً ضرورت نہیں کہ اِس اُصول کا استعمال صرف اِن لوگون پر ہو سکتا ہے جن کے قوا پورے طور پر نشوونما پا چکے ہین۔ ہم یہان پر بچون کا یا ایسے نوعمر لوگون کا ذکر نہین کر رہے ہین جو ابھی قانون کی رو سے سن بلوغ کو نہین پہونچے ہین۔ جو لوگ ابھی اِس حالت مین ہین کہ ان کی دیکھ بھال اور نگرانی دوسرون کو کرنی پڑتی ہے، اِن کی حفاظت تو خود ان کے اعمال سے بھی اسی طرح کرنے کی ضرورت ہے جس طرح خارجی نقصانات سے۔ اِسی اُصول کی بنا پر ہم جماعت کی ان ریاستون کو بھی خارج از بحث کر سکتے ہین کہ جنکی قومین ابھی اپنے عہد طفولیت مین خیال کی جاتی ہون ان کے اپنی آپ ترقی کرنے کی راہ مین ابتداءً اِتنی دشواریان پیش آتی ہین کہ ان پر قابو پانے کے لیۓ مشکل ہی سے کوئی

ذرائع سمجھ مین آتے ہین اور ہر اس حکمران کو جس کا قلب ترقی کے جوش سے لبریز ہے، اختیار رہے کہ وہ اِس مقصد کے حصول کے لیئے جو تدابیر چاہے اختیار کرے اور جو غالباً بصورت دیگر نا قابل حصول ہو گا۔ غیر متمدن قومون پر حکومت کرنے کے لیئے شخصی حکومت ایک مناسب طریقہ ہے بشرطیکہ اصل مقصد ان کی بہبود و ترقی ہو اور اس مقصد کیلئے جو ذرائع استعمال کیئے جائین وہ اسے واقعاً حاصل کر کے اپنے کو حق بجانب ثابت کرین۔ اس حالت سے قبل کہ انسان آزادانہ اور مساویانہ مباحثہ کے ذریعہ ترقی کرنے کے قابل نہو جائے آزادی کا بحیثیت ایک اُصول کے اطلاق نہین ہو سکتا اُس وقت تک ایسے لوگون کے لیئے بجز ایک اکبر یا شارلیمین[۱۵] کی بے چون و چرا اطاعت کے اور کچھ نہیں ہے بشرطیکہ خوش قسمتی سے ان کے جیسے حکمران انھین ملجائین لیکن جب لوگون میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ اپنی سمجھ سے یا دوسروں کے ترغیب دلانے سے اپنی

---

[۱۵] شارلیمین یا چارلس اعظم (۷۴۲ء تا ۸۱۴ء) سلطنت روم کا ایک بہت مشہور شہنشاہ گزرا ہے۔ یہ پہلے صرف فرانس کا بادشاہ تھا لیکن رفتہ رفتہ اس کا اثر پھیلتا گیا، یہان تک کہ جب لیو ثالث روم کا پوپ ہوا تو اس نے اس کے روز افزوں اثر و اقتدار سے مرعوب ہو کر نہ صرف یہ کیا کہ علم اور دوسرے علامات شاہی عطا کیں بلکہ مشرقی سلطنت کا تخت بھی اُسے بخش دیا، جس کا پایۂ تخت قسطنطنیہ تھا۔ اس وقت سے شارلیمین سلطنت روم کا مسلمہ شاہنشاہ ہو گیا اور اٹلی آسٹریا ہنگری اسپین، فرانس، انگلستان سب نے ایک ایک کر کے اسکے اقتدار کو تسلیم کیا۔ یورپ میں اپنا اثر و اقتدار قائم کرنے کے بعد اس نے ایشیا کی طرف رُخ کیا۔ مشرقی عیسائیوں کی حفاظت کے خیال سے اس نے خلیفہ بغداد ہارون الرشید سے خط و کتابت کی جسکے جواب میں خلیفہ کی طرف سے ایک سفارت بھیجی گئی، اور اُسی سال حاکم فلسطین نے اسے بیت المقدس کی کلیدیں حوالہ کر دی۔

ترقی کی طرف قدم بڑھا سکین (اور یہ حالت ایک زمانہ سے ان تمام قومون کی ہے جن سے ہمین یہاں سروکار ہے) تو اس حالت مین ان پر جبر کرنا خواہ وہ براہ راست ہو یا بصورت عدم تعمیل ایذا و سزا کی شکل مین ہو خود ان کی فلاح وبہبود کے لئے بھی جائز نہین اور صرف دوسرون کی حفاظت ہی کے خیال سے حق بجانب کہا جاسکتا ہے۔

یہ بیان کردینا مناسب ہوگا کہ مین حقِ مطلق کے تصور سے (بہ حیثیت ایک ایسی چیز کے جو افادہ سے بالکل بے تعلق ہو) اپنے استدلال مین کوئی فائدہ اُٹھانا نہین چاہتا مین افادیت[1] کو تمام اخلاقی مسائل کی سب سے آخری بنیاد قرار دیتا ہون لیکن یہ افادیت وسیع ترین معنون مین افادیت ہونی چاہیئے جس کی بنا ایک ترقی کرنے والے ذی روح کی حیثیت سے انسان کے مستقل مفاد پر ہو۔ میرا دعویٰ ہے کہ انہی مفاد کی بنا پر انفرادی آزادی کو فرد کے صرف ایسے اعمال مین خارجی اقتدار کے ماتحت ہونا چاہیئے جن کا تعلق دوسرے لوگون کے مفاد سے ہے۔ اگر ایک شخص کوئی ایسا فعل کرتا ہے جو دوسرون کے لیئے مضر ہے تو اس صورت مین اسکو قانون کے ذریعہ یا جہان قانونی سزائین کام نہ دین، عام اظہار نفرت کے ذریعہ سزا دینے کی ایک کھلی وجہ موجود ہے دوسروں کے نفع کے لیئے بہت سے ایسے مستقل کام بھی ہین جن کے کرنے کے لیئے وہ بجا طور پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً کسی عدالت مین جاکر شہادت دینا، مشترکہ مدافعت مین یا کسی اور ایسے مشترکہ کام مین حصہ لینا جو اِس جماعت کے مفاد کے لئے جس کی حفاظت مین وہ رہتا ہے ضروری ہو،

[1] افادیت علم الاخلاق کا ایک مسئلہ ہے جس کی رو سے بہترین عمل وہ ہے جس سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ خوشی حاصل ہو۔ اس فلسفیانہ اصول کا سب سے پہلا موجد بنتھم گزرا ہے جو انگلستان کے مشہور فلاسفہ میں شمار کیا جاتا ہے۔

اور ایسے کام انجام دینے جو انفرادی نفع سے تعلق رکھتے ہون مثلاً اپنے کسی بھائی کی جان بچانی یا کسی بیکس کے معاملہ مین پڑکر اُسے نقصان سے محفوظ رکھنا، یہ ایسے کام ہین کہ جب اِن کا کرنا صاف طور پر انسان کا فرض ہوجائے تو وہ اسکے نہ کرنے کی صورت مین قطعاً جماعت کا جوابدہ قرار دیا جاسکتا ہی۔ ایک شخص دوسرون کو نہ صرف اپنے کسی فعل کے ذریعہ سے بلکہ ترک فعل سے بھی نقصان پہونچا سکتا ہے اور دونو صورتون مین وہ اس نقصان کا ان کے سامنے ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ موخر الذکر صورت مین جبر کے استعمال کے لئے اول الذکر صورت سے زیادہ احتیاط کی ضرورت ہی۔ دوسرون کو نقصان پہونچانے کی صورت مین ایک شخص کو جوابدہ قرار دینا، یہ تو ایک عام اصول ہی لیکن نقصان کو روکنے کیلئے اسکو ذمہ دار ٹھہرانا، یہ ایک مستثنیٰ امر ہے۔ تاہم بہت سی ایسی صورتین ہوتی ہین جو اس قدر صاف اور سنگین ہوتی ہین کہ ان کی وجہ سے یہ استثناء بالکل حق بجانب ہوجاتا ہی۔ اُن تمام اُمور مین جو افراد کے خارجی معاملات سے تعلق رکھتے ہین، وہ قانوناً ان لوگون کا جوابدہ ہے جن کے مفاد کا اس سے تعلق ہوتا ہے اور اگر ضرورت ہو تو وہ جماعت کا بھی اس حیثیت سے جوابدہ ہے کہ وہ ان کی محافظ ہے۔ بعض اوقات اس کو اِس بات کے لئے ذمہ دار نہ قرار دینے کی بھی معقول وجوہ ہوتی ہین لیکن یہ وجوہ معاملہ کی خاص خاص صورتون مین پیدا ہونی چاہئین۔ یہ یا تو اس قسم کا معاملہ ہوتا ہے جس مین اگر اسے اس کی قوتِ تمیز پر چھوڑ دیا جائے تو وہ ممکن ہی کہ فی الجملہ اُس سے بہتر کام کرے جو وہ جماعت کے قابو رکھنے کی صورت مین کرسکتا۔ یا یہ وجہ ہو کہ اس پر قابو رکھنے کی کوشش سے دوسری ایسی برائیان پیدا ہون جو ان سے زیادہ مضر ہون کہ جن کو وہ روکنا چاہتی ہے۔ جب اِس قسم کے وجوہ ذمہ دار ٹھہرانے مین حائل ہوجاتی ہین، تو اس

صورت مین خود فاعل کے ضمیر کو مسند قضا پر آنا چاہیئے اور دوسرون کے ان مفاد کو بچانا چاہیئے جن کے لیئے حفاظت کا کوئی خارجی ذریعہ نہین ہے اور اسے بذات خود نہایت سختی سے فیصلہ کرنا چاہیئے اِس لئے کہ وہ اِس معاملہ مین اپنے بنی نوع کے فیصلہ؛ جوابدہ قرار نہین دیا جا سکتا ہے۔

لیکن ایک دائرۂ عمل ایسا بھی ہے جس مین سوسائٹی کا افراد سے جداگانہ اگر کوئی مفاد ہوتا ہے تو وہ صرف بالواسطہ ہوتا ہے اور اس مین ایک شخص کی جان اور اس کے وہ تمام افعال شامل ہوتے ہین جن کا تعلق صرف اس کی ذات سے ہوتا ہے یا دوسرون سے بھی ہوتا ہے تو وہ ان کی اپنی آزاد، بالارادہ اور بے فریب مرضی اور شرکت سے ہوتا ہے۔ صرف اس کی ذات سے میری مراد براہ راست اور بدرجہ اولیٰ اس سے ہے، اسلیئے کہ جس چیز کا اثر خود اس پر ہوتا ہے، اس کا اثر اس کے ذریعہ سے دوسرون پر بھی پڑ سکتا ہے، اور اس احتمال پر جو اعتراض عاید کیا جائے گا اس پر ہم بعد مین غور کرینگے۔ چنانچہ یہی انسانی آزادی کا سب سے موزوں محل ہے۔ سب سے پہلے تو اس مین شعور کی مملکتِ باطنی شامل ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وسیع سے وسیع معنوں میں ضمیر کی آزادیِ فکر اور خیال کی آزادی اور تمام مسائل پر خواہ عملی ہون یا نظری، سائنس سے متعلق ہون یا اخلاق و مذہب سے، ان سب مین خیالات و جذبات کو پوری آزادی حاصل ہو۔ خیالات کے اظہار و اشاعت کی آزادی دوسرے اصول کے تحت مین نظر آئیگی، اس لئے کہ اِس کا تعلق فرد کے اعمال کے اس حصہ سے ہے جس کا اثر دوسرون پر پڑتا ہے لیکن چونکہ یہ بھی اسی قدر ضروری ہے جس قدر خود آزادیِ فکر، اور زیادہ تر اس کی بنا بھی انہیں وجوہ پر ہے، اس لئے عملاً اسکو اس سے کسی طرح جدا نہین کیا جا سکتا۔ دوسرے

اس اصول کا تقاضا یہ ہے کہ مذاق اور مشاغل میں آزادی ہو، اپنی زندگی کا وہ لائحہ عمل بنانے کی آزادی جو ہماری سیرت کے موافق ہو، جو کچھ ہمارا جی چاہے بلا مزاحمت غیرے کر سکیں، بشرطیکہ ہمارے اِن افعال سے دوسرون کو کوئی نقصان نہ پہونچتا ہو خواہ وہ ہمارے طرزِ عمل کو غلطی اور حماقت ہی پر محمول کیوں نہ کرتے ہوں تیسرے اِس انفرادی آزادی سے انھی حدود کے اندر رہ کر افراد مین اتحاد قایم کرنے کی آزادی کا درجہ آتا ہے یعنی وہ کسی ایسی غرض کیلیے آپس مین اتحاد کر سکتے ہین جس مین دوسرون کا کوئی نقصان نہین ہے۔ بشرطیکہ جو لوگ اِس اتحاد مین شریک ہون وہ اپنے پورے سن بلوغ کو پہونچ چکے ہون۔ اور وہ اس مین زبردستی یا دھوکہ سے شریک نہ کیے گئے ہون۔

جس جماعت مین اِس قسم کی آزادیان بہ حیثیت مجموعی ملحوظ نہین رکھی جاتی ہین وہ کسیطرح آزاد نہین کہی جاسکتی خواہ اس کا طرزِ حکومت کچھ ہی کیون نہ ہو اور کوئی جماعت پوری آزاد نہین کہی جاسکتی جس مین یہ آزادیان کلی اور غیر مشروط طریقہ پر موجود نہ ہوں۔ جو آزادی صحیح معنوں میں آزادی کہی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ لوگ اپنی اپنی طریقہ پر اپنی فلاح وبہبود کی کوشش کریں، بشرطیکہ وہ دوسرونکو فلاح وبہبود سے محروم نہ کریں یا انکے حصول بہبود کی کوششوں مین رکاوٹ نہ پیدا کرین ہر شخص اپنی صحت کا آپ مالک ہے، خواہ وہ صحت جسمانی ہو یا دماغی۔ نوع انسان کا زیادہ فائدہ اسصورت مین ہے کہ سب لوگ آپس مین ایک دوسرے کو اپنے اپنے طریقہ پر چلنے دین جو انھین اچھا معلوم ہوتا ہو۔ نہ یہ کہ وہ ہر ایک کو اس طریقہ پر مجبور کرین جو باقی لوگون کو بھلا لگتا ہو۔

اگرچہ یہ کوئی نیا اصول نہین ہے اور بعض لوگون کو ممکن ہے یہ بالکل بدیہی نظر آتا ہے۔ پھر بھی آجکل کوئی اصول ایسا نہین ہے جو موجودہ خیال اور عمل کے میلان کا اس سے زیادہ مخالف ہو۔ جماعت نے اب تک (اپنی بصیرت کے مطابق) اپنی شخصی

خوبی کے معیار پر لوگون کو چلانے کی پوری اتنی ہی کوشش کی ہے جتنی معاشرتی خوبی کے معیار کو تسلیم کرانے کی۔ قدیم دولت ہائے مشترکہ خود کو اس بات کا بالکل مستحق سمجھتی تھین اور قدیم فلاسفہ بھی اِس کو پسند کرتے تھے کہ ذاتی افعال کا سارا طور طریقہ حکومت کی طرف سے مقرر کیا جائے اور یہ اس بنا پر کہ ریاست کو اپنے ہر ایک شہری کی ہر قسم کی جسمانی اور دماغی تربیت سے ایک گہرا تعلق ہے۔ یہ ایک ایسا خیال ہے جو ممکن ہے کہ ان چھوٹی چھوٹی جمہوری حکومتون مین جائز سمجھا گیا ہو جو ہمیشہ طاقتور دشمنون کے نرغہ مین رہا کرتی تھین یا جنھین بیرونی حملہ یا اندرونی بغاوت کا ہر وقت خطرہ لگا رہتا تھا اور جن کے لیئے قوت یا خود مختاری مین تھوڑے عرصہ کی ڈھیل بھی اِس قدر مہلک ثابت ہوتی کہ وہ آزادی کے خوشگوار مستقل اثرات کا انتظار نہین کر سکتی تھین۔ موجودہ زمانہ مین سیاسی جماعتون کے بڑے ہونے اور سب سے زیادہ دینی اور دنیوی اقتدار کی علیحدگی سے (جس سے لوگون کے ضمیر کی ہدایت کا کام اب ان لوگون کے ہاتھ مین نہین رہا جو پہلے ان کے دنیوی معاملات پر بھی اقتدار رکھتے تھے) اب تمام چھوٹے چھوٹے ذاتی معاملات زندگی مین قانون کی اسقدر مداخلت نہین رہی ہے۔ لیکن تشدد اور سختی کے اخلاقی طریقے نجی کے معاملات مین غالب رائے سے اختلاف کرنے کی بنا پر اس سے زیادہ سختی کیساتھ استعمال کیئے جاتے ہین، جتنا کہ وہ معاشرتی معاملات تک ہین۔ مذہب جو ان عناصر مین جنھون نے خلاقی احساس کے بنانے مین حصہ لیا ہے، سب سے زیادہ طاقتور عنصر ہے۔ اس پر تقریبًا ہمیشہ یا تو کسی مذہبی جماعت کی ہوس کاری کا اثر رہا ہے جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر اپنا اقتدار رکھنا چاہتی تھی یا اس پر پیوریٹن ذہنیت کارفرما رہی ہے۔ اور جدید زمانہ

کے بعض وہ مصلحین بھی جنھون نے گزشتہ مذاہب کی سخت مخالفت کی ہے، اپنے روحانی اقتدار کے حق کو تسلیم کرانے مین ان کلیساؤن یا مذہبی فرقون سے کسی طرح پیچھے نہین رہے ہین۔ مثال کے طور پر موسیٹو کونت کو لیجئے جس کے نظام معاشرتی کا

؎ یہ فرانس کا ایک مشہور فلسفی گزرا ہے جو جنوری ۱۷۹۸ء مین ایک گاؤن مین پیدا ہوا۔ اوائل عمر ہی سے اس کی طبیعت انقیاد و اطاعت سے متنفر تھی۔ محاسن اور خوبیون کی بنا پر خواہ وہ اخلاقی ہون یا دماغی، وہ بلا چون و چرا قائل ہو جاتا۔ اس کا یہ انداز طبیعت شباب مین پہنچکر اور رنگ لایا۔ ایک بار اس نے اپنے ایک استاد کے خلاف بغاوت کی جسکا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اسکول ہی ٹوٹ گیا اور اسے اپنے گھر واپس آجانا پڑا۔ اسکی اس حرکت پر اسکے والدین بہت خفا ہوئے، بالآخر وہ پیرس چلا آیا اور یہان وہ ریاضی کی تعلیم دینے لگا۔ اپنے زمانہ کے اساتذہ مین وہ بن یا مین فرینک لین کا بہت معتقد تھا اگرچہ دونو مین زمین آسمان کا فرق تھا۔

۱۸۲۶ء مین اس نے لکچرون کا ایک سلسلہ شروع کیا جن سے اسے اُمید تھی کہ دولت اور شہرت دونون ہاتھ آئیگی۔ یہ خطبے دراصل اس کے مشہور نظریۂ "نظام اثباتی" کے پیش خیمہ تھے جو اس قدر مقبول ہوئے کہ اس کے ایک دوست نے اسے مشورہ دیا کہ وہ انھین قلمبند کر ڈالے، ورنہ لوگ بلا حوالہ دیئے ہوئے ان خیالات نادرہ سے ناجائز فائدہ اُٹھائینگے اس کے ان لکچرون مین نہ صرف متوسط درجے کے لوگ بلکہ ہان ہیبولٹ جیسے مشہور و معروف فلسفی بھی (جنکا ذکر اس کتاب مین آگے چلکر ملیگا) شریک ہوتے تھے ۱۸۳۰ء مین ان لکچرون کی پہلی جلد مطبوعہ صورت مین شائع ہوئی۔ چھٹی اور آخری جلد ۱۸۴۲ء مین تمام ہوئی۔

اسی زمانہ مین موسیو کونت کی جان اسٹورٹ مل، مصنف کتاب ہذا سے بھی بعض مسائل پر خط و کتابت رہی مل اس کے فلسفیانہ خیالات اور نظریون کا بہت ثنا خوان اور مداح تھا، وہ خود کہتا ہے کہ میرے بعض خیالات اور میری سب سے بڑی تصنیف "نظام منطق" کے بعض مسائل کونت کے خیالات اور اس کے "فلسفہ اثباتی" سے ماخوذ ہین خود کونت بھی مل کے بعض خیالات اور نظریون کی بہت قدر کرتا تھا۔ (بقیہ صفحہ آئندہ پر)

سب سے بڑا مقصد جیسا کہ اس نے اپنی کتاب "نظام سیاست اثباتی"، مین وضاحت کے ساتھ لکھا ہے، یہ ہے کہ افراد پر جماعت کی ایک ایسی مطلق العنان حکومت قایم کیجائے (اگرچہ اس کے ذرائع قانونی سے زیادہ اخلاقی بیان کئے گئے ہین) جو ان تمام طریقون سے بڑھکر ہے، جو قدیم فلاسفہ مین سخت سے سخت حامی نظام کے سیاسی مطمح نظر میں پائی جاتی ہے،

انفرادی حیثیت سے ارباب فکر کے مخصوص عقائد کے علاوہ بالعموم دنیا مین یہ ایک عام میلان یہ پایا جاتا ہے کہ جماعت کے اختیارات کو افراد پر رائے کے زور سے اور قوانین تک کے ذریعہ خوب وسیع کیا جائے اور چونکہ دنیا میں جو تغیرات ہو رہے ہیں ان سب کا میلان یہ ہے کہ جماعت کو مضبوط کیا جائے اور افراد کی قوت کو گھٹایا جائے لہذا یہ مداخلت بیجا کوئی ایسی برائی نہین معلوم ہوتی جو از خود زائل ہو جائے بلکہ برعکس اس کے روز بروز خطرناک صورت اختیار کرتی جارہی ہے۔ انسان اس میلان طبع کی کہ وہ بہ حیثیت حکمران ہو یا عام شہری کے، اپنے خیالات اور رجحانات کو دوسرون پر بطور ضابطہ کے نافذ کرے فطرت انسانی کے بعض بہترین اور بعض بدترین جذبات کی طرف سے اس زور وشور کے ساتھ تائید ہوتی ہے کہ اسے بجز سلب قوت کے اور کسی دوسرے طریقہ سے بمشکل روکا جا سکتا ہے اور چونکہ قوت گھٹتی نہین بلکہ بڑھتی جارہی ہے، اسلیئے جبتک کہ اس کے خلاف اخلاقی عقائد کی ایک مضبوط دیوار نہ کھڑی کی جائے گی اسوقت تک یہ حالات

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) کونت کی دوسری مشہور تصنیف "نظام سیاست اثباتی" ہے جسکا ذکر اس کتاب مین بھی آیا ہے۔ یہ چار جلدون مین ہے جسکی پہلی جلد ۱۸۵۱ء مین شایع ہوئی اور آخری ۱۸۵۴ء مین ختم ہوئی ۱۸۴۸ء میں کونت نے مجلس اثباتی، کے نام سے ایک جماعت قایم کی تھی جس کا مقصد ۱۸۴۸ء کے انقلاب کے بعد باہم لوگون مین اتحاد واتفاق پیدا کرنا تھا۔ یہ اتحاد تو ہوا نہین اور مجلس اسکے شاگردون کی ایک ٹولی بنکر رہ گئی۔

موجودہ ہم کو یہی اُمید رکھنی چاہیئے کہ یہ بڑھتی ہی جائیگی۔

استدلال کے خیال سے یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ بجائے اسکے کہ یکبارگی اصل موضوع پر بحث شروع کردیجائے، سب سے پہلے ہم اس کے ایک حصہ سے گفتگو کرین جس پر مذکورۂ بالا اُصول اگر پورے طور پر نہین تو بہت حد تک تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہ حصہ آزادیٔ خیال ہی، جس سے تقریر و تحریر کی آزادی کو جدا کرنا ناممکن ہے۔ اگرچہ اِن باتون کی آزادی آج کل ایک بڑی حد تک ان تمام ممالک کے سیاسی اخلاق کا جزو ہے جو مذہبی رواداری اور آزادادارے قایم کرنے کے مدعی ہین لیکن جن فلسفیانہ اور عملی وجوہ پر ان کی بنیاد قایم ہے، ان سے غالبًا عام لوگ بہت زیادہ آشنا نہین اور نہ انھین بڑے بڑے اہل الرائے لوگون نے ہی اتنی اچھی طرح سمجھا ہی، جتنی کہ ان سے توقع ہونی چاہیئے تھی۔ وہ اسباب و وجوہ اگر صحیح طور پر سمجھ لیئے جائین تو ان کا استعمال نہ صرف اس موضوع کے ایک حصہ بلکہ بہت وسیع پیمانہ پر ہوسکتا ہی اور ایک حصہ موضوع پر پورے طور سے غور و فکر کرنا گویا باقی اجزاء کیلیے ایک نہایت بہتر تمہید ثابت ہوگی۔ جن حضرات کو ان مباحث مین کوئی نئی بات نہ معلوم ہو، ان سے یہ اُمید ہے کہ ایک ایسے موضوع پر جس پر کم و بیش تین سو سال سے بحث ہوتی چلی آئی ہے اگر مین ایک مرتبہ اور گفتگو کرنے کی کوشش کرون، تو وہ مجھے معاف رکھین گے۔

باب دوم

آزادیٔ خیال و مباحثہ

اب وہ زمانہ نہیں رہا جبکہ "آزادیٔ مطابع" کے بارے میں بحث و استدلال کی ضرورت ہو اور اس سے متعلق کہا جائے کہ یہ خراب اور جابر حکومت کے خلاف تحفظ کی ایک ضمانت ہے۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس بات کے لئے کسی دلیل و وجہ کی ضرورت نہیں۔ جن واضعان قوانین یا عمال حکومت کے مفاد رعایا کے مفاد سے بالکل جداگانہ ہیں انہیں اس کی اجازت نہ ہونی چاہیئے کہ وہ انھیں بتائیں کہ فلان قسم کی رائیں ان کو رکھنی چاہئیں اور فلان قسم کی نہیں، اور ان کے لیئے یہ طے کریں کہ کون کون سے اصول یا کون کون سے دلائل ان کو سننے چاہئیں علاوہ بریں مسئلہ کے اس پہلو پر اس سے پیشتر اتنی بار اور اتنے جوش و خروش کے ساتھ بحث کی جا چکی ہے کہ اس موقع پر اس پر اصرار کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی۔ اگرچہ مطابع کے بارے میں انگلستان کا قانون آج بھی ویسا ہی غلامانہ ہے، جیسا کہ وہ ٹیوڈر[۵] بادشاہوں کے زمانہ میں تھا لیکن اس کا کوئی اندیشہ نہیں کہ وہ

[۵] ٹیوڈر انگلستان کا ایک شاہی خاندان ہے جس میں پانچ بڑے بڑے بادشاہ گزرے ہیں۔ ان میں سے پہلے دو یعنی ہنری ہفتم اور ہنری ہشتم بہت مشہور ہوئے ہیں اور سلاطین ٹیوڈر کے نام سے اکثر یہی مراد لیئے جاتے ہیں۔ انگلستان کی تاریخ میں یہ بہت مطلق العنان حکمران سمجھے جاتے ہیں۔ لیکن ان کی مطلق العنانی

کبھی سیاسی مباحثہ کے خلاف استعمال بھی کیا جائیگا بجز اِس کے کہ عارضی اضطراب و بےچینی کی حالت مین بغاوت و شورش کا خوف وزراء اور ججون کو دیوانہ بنا دیتا ہے[۱]

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس قسم کی تھی کہ خود رعایا اس کی خواہشمند تھی۔ گزشتہ جنگوں سے لوگ اس قدر تنگ آ گئے تھے کہ ہر شخص امن کا طالب تھا اور یہ دولت انتی جیسے طاقتور حکمرانوں کے ہاتھ سے نصیب ہوئی۔

[۱] ان الفاظ کی سیاہی ابھی خشک ہونے نہ پائی تھی کہ قانون مطابع مجریہ ۱۸۵۸ء کا نفاذ عمل مین آیا گویا حکومت ان الفاظ کی اور زیادہ سختی کے ساتھ تردید کرنا چاہتی تھی لیکن عام مباحثہ کی آزادی مین حکومت کی اس غیر منصفانہ مداخلت سے مین ایک حرف کے رد و بدل کرنے پر بھی آمادہ نہین ہون اور نہ اسسے میرے اس خیال مین کوئی ضعف آیا ہے کہ شورش و بےچینی کے علاوہ دیگر حالات مین سیاسی مباحثہ کی بنا پر سزا دہی ظلم کا دور اب ہمارے ملک سے ختم ہو چکا ہے۔ کیونکہ اولاً تو استغاثے کرنے پر اصرار نہین ہوا اور اگر ہوتا بھی ہے تو وہ اصل مین سیاسی استغاثے نہین ہوتے جو جرم لگایا جاتا ہے وہ یہ نہین ہے کہ ادارون اور حکمرانون کی ذات اور ان کے افعال پر کیون نکتہ چینی کی گئی بلکہ یہ ہے کہ ایک مخرب اخلاق اصول و جواز ظلم کے فتوے کی اشاعت کیون کی گئی؟

اگر اس باب کے دلائل مین کچھ بھی صحت و قوت ہے تو اخلاقی عقیدہ کے لحاظ سے ہر اصول اور نظریے پر عقیدہ رکھنے اور اس پر بحث کرنے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے خواہ وہ اصول اور نظریہ کتنا ہی مخرب اخلاق کیون نہ سمجھا جائے۔ اس امر پہ بحث کرنا یہان پر کچھ مناسب نہ ہوگا کہ نظریۂ ظلم اس لقب کا مستحق بھی ہے۔ میرے خیال مین صرف اسقدر کہدینا کافی ہوگا کہ اس مسئلہ کا شمار ہمیشہ اخلاق کے بین اور کھلے مسائل مین رہا ہے۔ ایک عام شخص کا ایک ایسے مجرم کو قتل کر ڈالنا جس نے خود کو قانون کے حدود سے بالا رکھکر قانونی سزاؤن یا قانونی اختیارات کی رسائی سے بالکل خارج کر لیا ہو تمام اقوام کے نزدیک اور بعض عقلاء اور حکماء کی نظرون مین بھی جرم نہین خیال کیا گیا ہے بلکہ ایک فعل مستحسن سمجھا گیا ہے اور خواہ صحیح ہو یا غلط یہ فعل قتل کی نوعیت مین نہین بلکہ خانہ جنگی کی نوعیت مین آتا ہے۔ ایسی صورت مین مین تسلیم کرتا ہون کہ اسکے لئے اشتعال دلانا سزا کا مستوجب ہو سکتا ہے لیکن اسی صورت مین جب کوئی فعل سرزد ہو (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

اور عام طور سے آئینی ممالک میں چنداں خطرہ نہیں کہ حکومت خواہ پورے طور پر رعایا کی جوابدہ ہو یا نہو، اظہار رائے کے معاملہ میں اپنا قابو رکھنے کی کوشش کرے گی الا یہ کہ ایسا کرنے میں وہ لوگوں کے عام عدم رواداری کی ترجمانی کرنے لگے لہذا ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ حکومت اور رعایا کے مفاد بالکل ایک ہیں اور وہ کبھی جبر کے استعمال کرنے کا خیال بھی نہیں کرتی ہی جبتک کہ وہ ان کی ہم آہنگ نہیں ہو جاتی۔ لیکن میرے خیال میں رعایا کو اس قسم کے جبر کا کوئی حق نہیں ہے، خواہ وہ خود اپنے ہاتھوں ہو یا اپنی حکومت کے ذریعہ سے۔ یہ اختیار بذات خود ناجائز ہی۔ بہتر سے بہتر حکومت کو بھی اس اختیار کے استعمال کا اسی قدر کم حق ہی جس قدر خراب سے خراب حکومت کو۔ یہ اختیار جس وقت رائے عامہ کی مرضی سے استعمال کیا جاتا ہی تو اس صورت میں بھی یہ اسیقدر برا بلکہ اس سے زیادہ برا ہے جس قدر کہ رعایا کی مرضی کے خلاف استعمال کئے جانے کی صورت میں۔ اگر تمام لوگ بجز ایک شخص کے ایک رائے ہوں اور صرف ایک شخص دوسری رائے رکھتا ہو تو اس صورت میں وہ تمام لوگ بھی اس ایک شخص کے بہ جبر زبان بند کرنے میں اسیقدر برسر ناحق ہوں گے جس قدر کہ وہ ایک شخص بشرط قدرت ان تمام لوگوں کے خاموش کرنے میں ہوتا۔ اگر رائے ایک ذاتی ملک ہوتی جو بجز اپنے مالک کے اور دوسرے کیلیے کوئی قدر و قیمت نہ رکھتی، اور اگر اس کے استعمال میں رکاوٹ ڈالنا محض ذاتی نقصان ہوتا

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) اور اشتعال اور فعل کے درمیان کم سے کم کوئی تعلق ظاہر کیا جا سکے۔ اس حالت میں بھی یہ کوئی اور حکومت نہیں بلکہ خود وہی حکومت ہی جس پر یہ حملہ کیا گیا ہی اور صرف وہی اپنے تحفظ کے لئے ایسے حملوں پر جائز طور سے سزا دیسکتی ہی۔ (از مصنف)

تو اس صورت مین البتہ اِس سے کچھ فرق پڑتا کہ یہ نقصان چند اشخاص کا ہے یا بہت سے لوگون کا۔ لیکن کِسی رائے کے روکنے مین جو مخصوص خرابی ہوتی ہے وہ یہ کہ اس سے کل بنی نوع کا نقصان ہوتا ہی خواہ وہ موجودہ نسل ہو یا آنے والی نسلین ہون ہمین ان کا نقصان بھی ہے جو وہ رائے ظاہر کرنا چاہتے ہین اور ان سے زیادہ ان کا جو اس سے اختلاف رکھتے ہین۔ اگر وہ رائے صحیح ہے تو وہ اپنی غلطی کی تصحیح کرنے کے موقع سے محروم رہتے ہین۔ اگر غلط ہی تو وہ صحت کے واضح تر تخیل سے جو سچ اور غلطی کے تصادم سے پیدا ہوتا ہی ہاتھ دھو بیٹھتے ہین اور یہ تقریبًا اسیقدر نفع بخش ہی

ضرورت ہی کہ اِن ہر دو اُمور پر علیحدہ علیحدہ غور کیا جائے اسلیئے کہ ان مین سے ہر ایک کے دلائل مختلف ہین ہم کبھی یہ یقینی طور پر نہین کہہ سکتے کہ جس رائے کو ہم روکنے کی کوشش کر رہے ہین وہ رائے غلط ہے اور اگر ہمین یہ یقین بھی ہو جائے تو اِس صورت مین بھی اس کا رُوکنا بُرائی سے خالی نہین۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہی کہ جس رائے کے جبرًا رُوکے جانے کی کوشش کی جا رہی ہے وہ بہت ممکن ہے کہ صحیح ہو۔ اِس مین شبہہ نہین کہ جو لوگ اِس کو رُوکنا چاہتے ہین وہ اِس کی صحت کے منکر ہوتے ہین لیکن وہ کچھ غیر خطا پذیر نہین ہین۔ انھین یہ کوئی حق نہین کہ وہ کِسی مسئلہ کا فیصلہ کرین اور دوسرے لوگون کو اِس کے متعلق اظہار رائے کا حق نہ دین۔ کِسی رائے کو سننے سے اِس بنا پر انکار کرنا کہ انھین اسکی غلطی کا یقین ہی، یہ فرض کر لینا ہی کہ انکا یقین گویا حق الیقین کا درجہ رکھتا ہے کِسی قسم کے مباحثہ کا رُوکنا گویا اپنی غیر خطا پذیری کو فرض کر لینا ہی۔ اِس بات کو بُرا سمجھنا صرف اسی ایک معمولی دلیل کی بنا پر کافی ہو سکتا ہی جو محض اسوجہ سے کوئی بُری دلیل نہین ہے

کہ وہ بہت معمولی ہے۔

لوگون کی سمجھ پر پڑ رونا آتا ہے کہ اپنی اِس خطا پذیری کا احساس جسے وہ یون بطور نظریہ کے تسلیم کرتے ہین، لیکن اپنے عملی معاملات مین ذرّہ برابر نہین ہوتا۔ اِس لیئے کہ اگرچہ ہر شخص اپنے متعلق یہ بخوبی جانتا ہے کہ وہ خاطی ہے، لیکن بہت کم ایسے ہین جو اپنی خطا پذیری کے خلاف کسی احتیاط کی ضرورت سمجھتے ہون، یا یہ تسلیم کرتے ہون کہ جس رائے پر انھین اِس قدر یقین ہے، وہ ممکن ہے اسی غلطی او خطا کی ایک مثال ہو جس کے مرتکب ہو سکنے کا انھین اعتراف ہے۔ بڑے بڑے مطلق العنان سلاطین یا وہ لوگ جو تملق و خوشامد کے عادی ہوتے ہین، انھین تقریبًا تمام معاملات مین اپنی رائے پر ایسا ہی اعتمادِ کلّی ہوتا ہے لیکن جو لوگ اِن سے بہتر حالت مین ہین اور جنھین اپنی رایون پر بحث و حجت کے سننے کا موقع ملتا ہے اور جس وقت اُن کی غلطی ثابت ہو جاتی ہے وہ اسے تسلیم بھی کر لیتے ہین۔ وہ اِس قسم کا اعتمادِ کلی اپنی صِرف ان رایون کے متعلق رکھتے ہین، جن مین اِن کے گرد و پیش کے لوگ ان کے ہمنوا ہون، یا وہ لوگ جنکا یہ عادتًا ادب کرتے ہین۔ اسلیئے کہ ایک شخص کو اپنے تنہا فیصلہ کے متعلق جس قدر کم اعتماد ہوتا ہے اسی قدر شدت کے ساتھ وہ عمومًا "دنیا" کے صحتِ فیصلہ پر پورا یقین رکھتا ہے، اور ہر شخص کی دنیا سے مراد وہ حصّہ ہوتا ہے جس سے اس کا سابقہ رہا کرتا ہے، یعنی وہ جماعت، وہ فرقہ، وہ مذہب اور وہ طبقہ جس سے اس کا تعلق ہوتا ہے اور وہ شخص تو نسبتہً آزاد خیال اور وسیع النظر کہا جا سکتا ہے جس کے نزدیک اپنی دنیا سے مراد اپنے ملک یا اپنے زمانہ کے لوگ جیسے وسیع دایرے ہوتے ہین، یہانتک کہ جب اس کو یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ دوسرے زمانے،

دوسرے ملکون، دوسرے فرقون کو دوسرے مذہبون اور دوسری جماعتون کے خیالات اِس کے بالکل برعکس رہے ہین اور اب بھی ہین تو بھی اسکی اِس اجتماعی سند پر اس کے اعتقاد مین ذرہ برابر ضعف نہین آتا وہ اپنے صحیح ہونیکی تمام ذمہ داری دوسرے مخالف لوگونکے مقابلہ میں اپنی اس دنیا کے سر رکھتاہو۔ اور اس کا اِسے کبھی خیال بھی نہین آتا کہ اِن مختلف دنیاؤن مین جس ایک دنیا پر اسے اِس درجہ اعتماد ہو وہ محض ایک اتفاقی امر ہے اور جن اسباب کی بنا پر وہ لنڈن مین ایک عیسائی مذہب رکھتا ہو وہی اسباب پیکن مین اُسے بدھ مت یا کنفیوشس[۱] مذہب کے پیرو ہونے کا باعث ہو سکتے تھے۔ تاہم یہ بات کہ افراد کی طرح مختلف عہد بھی غلطی کے مرتکب ہو سکتے ہین؛ بذات خود اسیقدر واضح ہے جتنا کہ دلائل سے واضح ہو سکتی ہے۔ ہر زمانہ مین بہت سے ایسے خیالات رہے ہین

۱؎ کنفیوشس دنیا کے اُن بڑے مصلحین میں ہے جسکا نام تاقیامت ہمیشہ زندہ رہیگا۔ وہ چین کی ایک ریاست لو میں پیدا ہوا اور ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوا جبکہ چین کی حالت نہایت خراب و خستہ ہو رہی تھی۔ اس انتشار اور بدنظمی کی وجہ سے تمام لوگ نہایت تباہ حال اور برباد ہو رہے تھے۔ ملک میں امن و امان نہ ہونے کی وجہ سے قحط پر قحط پڑ رہے تھے۔ بیٹے کا باپ کو، وزیر کا بادشاہ کو قتل کر دینا ایک معمولی بات تھی۔ لوگوں کی معاشرتی حالت نہایت خراب تھی۔ مذہب کا کہیں نام نہ تھا۔ ایسے حالات میں کنفیوشس ۵۵۱ ق م میں چین کے ایک معزز لیکن مفلس گھرانے میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بائیس سال کی عمر میں اُس نے معلمی کا پیشہ اختیار کیا لیکن یہ تعلیم کوئی عام تعلیم نہیں بلکہ سیاسیات اور اخلاقیات کی تعلیم تھی جو اس زمانہ کی اولین ضروریات میں سمجھا جاتا تھا۔ کنفیوشس کی تمام تعلیمات کا لب لباب ان چند لفظوں میں ہے۔ وہ کہا کرتا تھا کہ جماعت ایک فرمان الٰہی ہے اور یہ پانچ قسم کے تعلقات پر قائم ہے۔ حاکم و رعایا، پدر و فرزند، زن و خاوند، برادر و احباب۔ ان میں سے حاکم، پدر، خاوند اور برادر کا حق ہے امر اور رعایا، فرزند، زن اور برادر کا فرض ہے اطاعت۔ حکم دینے والوں کو چاہیئے کہ وہ حق اور انصاف سے کام لیں اور اسطرح اطاعت کرنیوالوں پر بھی فرض ہے کہ وہ حق اور انصاف کو ملحوظ رکھیں۔ دوستوں میں یگانہ تعلقات ہونے چاہئیں جو حق اور نیکی پر قائم ہوں۔

جنھین لبعد کے زمانون نے نہ صرف غلط بلکہ لغو سمجھا ہو اور یہ بھی اسی قدر یقینی ہے۔ بہت سے وہ خیالات جو آجکل رائج ہین، آیندہ زمانون مین چلکر مسترد کردیے جاینگے جس طرح کہ آجکل دیکھا جاتا ہو کہ بہت سے وہ خیالات جو پیشتر کبھی عام طور پر رائج تھے آج مسترد کر دیے گئے ہین۔

اِس استدلال پر جو اعتراض کیا جا سکتا ہے، وہ غالبًا اِس شکل مین ہوگا کہ کسی غلط رائے کی اشاعت کے روکنے مین غیر خطا پذیری کا احتمال اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہی جتنا کہ حکام کے ان دوسرے افعال مین ممکن ہی جو وہ اپنے فیصلہ سے اور اپنی ذمہ داری پر کرتے ہین۔ فیصلہ کا اختیار لوگون کو اِس غرض سے دیا جاتا ہی تاکہ وہ اسے استعمال کرین لیکن اِس وجہ سے کہ اِس مین غلطی کا امکان ہے کیا لوگونکو اِس بات کی تاکید کر دیجائے کہ وہ اسے سرے سے استعمال ہی نہ کرین؟ جس چیز کی اشاعت کو وہ مُضر سمجھتے ہین، اس کے روکنے کے یہ معنی تو نہین ہین کہ وہ خود غلطی سے منزہ ہونے کے مدعی ہین بلکہ اِس کا یہ مطلب ہے کہ وہ باوجود خطا پذیر ہونے کے اپنے دلی اعتقاد کے مطابق عمل کرنے کے فرض کو انجام دے رہے ہین اگر ہم اپنی رایون پر کبھی عمل نہ کرین، اسلئے کہ ممکن ہے وہ غلط ہون تو اِس صورت مین ہمین اپنے مفاد کی کچھ بھی پروا نہ کرنی چاہیئے اور اپنے فرائض کو کبھی پورا نہ کرنا چاہیئے ایک اعتراض جو ہر قسم کے افعال پر عاید ہو سکتا ہے وہ کسی ایک مخصوص فعل کے خلاف صحیح طور پر وارد نہین کیا جا سکتا۔ تمام حکومتون اور افراد کا یہ فرض ہے کہ وہ جہانتک ممکن ہو صحیح سے صحیح رائے قایم کرین، نہایت احتیاط کے ساتھ قایم کرین۔ اور جبتک کہ انھین اپنے صحیح ہونے کا پورا یقین نہو، اس وقت تک وہ انھین دوسرون

کیلئے لازم نہ قرار دین۔ لیکن معترضین یہ کہہ سکتے ہین کہ جب انھین پورا یقین ہوجائے تو یہ دیانت نہین بلکہ بزدلی کی علامت ہے کہ ان رایون پر عمل کرنے سے احتراز کیا جائے اور جن خیالات کو وہ نہایت ایمانداری کے ساتھ انسان کی بہبود کے لئے خواہ اِس عالم مین ہو یا دوسرے عالم مین مضر سمجھتے ہین، انھین بلا تامل اِس بنا پر رواج پذیر ہونے کا موقع دیا جائے کہ دوسرے لوگون نے کم روشنی کے زمانہ مین ان رایون کے اظہار کی اجازت نہین دی تھی جو آجکل صحیح سمجھی جاتی ہین۔ یہ کہا جاسکتا ہو کہ ہمین احتیاط رکھنی چاہیئے کہ کہین وہی غلطی آج بھی ہم نہ کرین۔ لیکن حکومتون اور قومون نے ایسے ایسے معاملات مین بھی غلطیان کی ہین جن کے متعلق کوئی نہین کہہ سکتا کہ یہ ان کے اختیار کے استعمال کے لئے موزون و مناسب مواقع نہ تھے انھون نے نا واجب محاصل لگائے ہین اور غیر منصفانہ جنگین کی ہین پھر اس بنا پر کیا ہم کو چاہیئے کہ ہم سرے سے کوئی محصول ہی نہ لگائین اور بڑے سے بڑے اشتعال کی حالت مین بھی جنگ نہ کرین؟ لوگون کو اور حکومتون کو حتی الوسع اپنی اپنی قابلیت کے مطابق عمل کرنا چاہیئے۔ یقین کامل دنیا مین کوئی شے نہین حیات انسانی کے اغراض کے لئے جتنے یقین کی ضرورت ہے وہ موجود ہے ہمین اپنے اعمال و افعال کے لئے اپنی رائے کو صحیح ماننا نہ صرف جائز ہے بلکہ ضروری ہے۔ اور جب ہم بُرے آدمیون کو ایسی رایون کی اشاعت سے روکتے ہین جنھین ہم جماعت کے لئے غلط اور مضر سمجھتے ہین تو بھی ہم کچھ اس سے زیادہ نہین فرض کرتے۔

میرا جواب یہ ہے کہ ہم بہت کچھ زیادہ فرض کرلیتے ہین۔ کسی رائے کو اسوقت صحیح تسلیم کرنا جبکہ اس کے خلاف ہر قسم کے دلائل استعمال کرنے سے بھی اس کی تردید

نہین ہوسکتی ہے اور دوسرے ایسی حالت مین جبکہ اس کو مسترد کرنے کی اجازت ہی نہ ہو، ان دونون صورتون مین بہت بڑا فرق ہے۔ اپنی رائے کو رد کرنے اور غلط ثابت کرنے کی پوری آزادی دینا ہی تو ایک ایسی شرط ہے جس سے ہم عمل کے لئے بجا طور پر اسے صحیح تسلیم کرسکتے ہین۔ اور اسکے علاوہ کوئی دوسری صورت نہین ہے، جس کی بنا پر کوئی انسانی عقل وفہم رکھنے والا اپنی رائے کے صحیح ہونے کا کوئی معقول اطمینان کرسکے۔

جب ہم رائے کی تاریخی یا انسانی زندگی کی عام حالت پر غور کرتے ہین تو ہماری سمجھ مین یہ نہین آتا کہ ان کی حالت جیسی بھی ہے اس سے بدتر کیون نہین ہے؟ یہ تو یقینی ہے کہ یہ فہم انسانی کی فطری قوت کا نتیجہ نہین ہے، کیونکہ کسی ایسے معاملہ مین جو بالکل بدیہی نہین ہے، ننانوے اشخاص ایسے ہیں جو اس پر خود بخود فیصلہ کرلے کے قابل نہین بلکہ صرف ایک ہوتا ہے جو اس قابل ہوتا ہے اور اس سَوین شخص کی قابلیت بھی اضافی ہوتی ہے۔ اسلئے کہ ہر گزشتہ نسل کے بڑے بڑے اشخاص مین کثرت تعداد ایسے لوگون کی ملیگی جن کی رائین آج غلط نظر آرہی ہین اور انھون نے بہت سی ایسی باتین خود کین یا پسند کین جنھین آج کوئی شخص مناسب نہ کہے گا۔ پھر بھی کیا وجہ ہے کہ بہ حیثیت مجموعی آج لوگون مین معقول رایون اور معقول افعال کی اس درجہ کثرت پائی جاتی ہے؟ اگر واقعتہً یہ کثرت موجود ہے جس کا ہونا لازمی ہے بشرطیکہ انسانی معاملات بالکل خراب حالت میں نہون اور نہ ہمیشہ رہے ہون، تو اس کی وجہ انسانی دماغ کا جو اس کی تمام ذہنی و اخلاقی خوبیون کا منبع ومخرج ہے صرف ایک وصف ہے اور وہ وصف یہ ہے کہ انسان کی تمام غلطیون کی اصلاح ہوسکتی ہے۔ انسان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ اپنی غلطیون کو مباحثہ اور تجربہ کے ذریعہ

صحیح کر سکتا ہے۔ صرف تجربہ سے نہین بلکہ ان پر مباحثہ بھی ہونا چاہیئے تاکہ یہ معلوم ہوتا رہے کہ تجربہ کی تاویل کس طرح کیجائے۔ غلط رائین اور افعال رفتہ رفتہ واقعات اور دلائل کے سامنے دب جاتے ہین لیکن اگر دماغ پر کوئی اثر ڈالنا ہے تو ان واقعات و دلائل کو اس کے سامنے لانا چاہیئے۔ بہت کم واقعات ایسے ہوتے ہین جن کی اصلی حقیقت بغیر ان پر تنقید کیئے ہوئے معلوم ہوجائے لہذا انسانی فیصلہ کی تمامتر قوّت کا انحصار اس پر ہے کہ اگر یہ غلط ثابت ہوا تو درست کیا جا سکتا ہے اور اس پر اعتماد صرف اسی صورت مین ہو سکتا ہے جبکہ اس کے درست کرنے کے ذرائع ہمیشہ تیار رکھے جائین اگر کسی شخص کا فیصلہ واقعتہً اس قابل ہے کہ اس پر اعتماد کیا جائے، تو سوال یہ ہے کہ ایسا کیونکر ہوا؟ اسلئے کہ وہ ہمیشہ اپنی رائے اور اپنے فعل پر اعتراض سننے کے لیئے تیار رہا ہے، اسلیئے کہ اس کا ہمیشہ سے یہ دستور رہا ہے کہ اس کے خلاف جو کچھ بھی کہا جائے، وہ اسکو غور سے سُنا کرے اور جہانتک مناسب ہو اس سے فائدہ اُٹھائے اور خود اپنے دل کو یا جہان موقع ہو دوسرون کو بھی مغالطہ آمیز باتون کی غلطیان بتائے، اسلئے کہ اس نے محسوس کرلیا ہے کہ اگر انسان کسی شے کے علم کُل سے قریب ہو سکتا ہے تو اس کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ اس کے متعلق ہر قسم کی رائے رکھنے والے اشخاص کے خیالات سُنے اور ان تمام طریقون کا مطالعہ کرے جن سے ہر طرح کا دماغ اس پر غور کر سکتا ہے۔ کسی عقلمند شخص نے اسکے علاوہ کسی اور طریقہ سے کبھی عقل نہین حاصل کی ہے اور نہ انسان کے لیئے کسی اور طریقہ سے عقلمند بننا ممکن ہے۔ اپنی رائے کا دوسرون کی رایون سے مقابلہ و موازنہ کرکے اسے مکمل کرنے اور صحیح کرنے کی مستقل عادت ہی بجائے اس پر عامل ہونیکی راہ مین کاوٹ

اور شبہ پیدا کرنیکے اِس پر صحیح اعتماد رکھنے کی مستحکم بنیاد ہو سکتی ہے کیونکہ ان تمام باتون سے جو کم سے کم ظاہر ہین اسکے خلاف کہی جا سکتی ہین، واقف ہونے اور اپنے تمام مخالفین کا مقابلہ کرنے کے بعد اور یہ سمجھکر کہ اِس نے اعتراضات اور مشکلات سے پرہیز کرنے کی بجائے انھین اچھی طرح دیکھ بھال لیا ہے اور کسی ایسی روشنی کے پڑنے سے جو کسی پہلو سے بھی اِس موضوع پر پڑ سکتی تھی، رکا نہین ہے، اسے اپنے فیصلہ کو کسی ایسے شخص یا جماعت سے جس نے یہ تمام تدابیر اختیار نہین کی ہین، بہتر خیال کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

جس بات کو دنیا کے بڑے بڑے عقلا نے جنھین اپنی رائے و عقل پر اعتماد کرنے کا سب سے زیادہ حق ہو سکتا ہے، قابل اعتماد ماننے کے لئے ضروری سمجھا تو پھر جمہور کا کیا ذکر جو چند عقلمندون اور بہت سے بیوقوفون کا مجموعہ ہوتے ہین!

کلیساؤن مین سب سے متعصب کلیسا یعنی کلیسائے روم اپنے 'مقدسین' کی نامزدگی کے موقع پر بھی ایک "وکیل شیطان"[1] کی اجازت دیتا ہے، اور نہایت صبر کے ساتھ اس کی باتون کو سنتا ہے، گویا مقدس سے مقدس انسان اس وقت تک اعزاز بعد الموت کا مستحق نہین قرار دیا جا سکتا جبتک کہ وہ سب کچھ جو شیطان اسکے خلاف کہہ سکتا ہے معلوم نہ ہو جائے اور جانچ نہ لیا جائے۔ اگر نیوٹن[2] کے فلسفہ پر نکتہ چینی اور اعتراضات

---

[1] عیسائی کلیسا مین ایک دستور ہو کہ جب کسی شخص کا نام 'مقدسین' کے زمرہ مین داخل کرنے کے لئے پیش کیا جاتا ہو تو ایک شخص اسکی مخالفت مین کھڑا ہوتا ہی اور اسکے متعلق جتنی خرابیان اور برائیان ہوتی ہین وہ سب پوست کندہ بیان کر دیتا ہے اور کہتا ہے کہ ایسا شخص مقدسین کے زمرہ مین داخل کیے جانے کے قابل نہین ہے، اس شخص کو انکی اصطلاح مین وکیل شیطان کہتے ہین اور جو شخص کہ تائید مین کھڑا ہوتا ہی اور اسکا نام پیش کرتا ہی اسے "وکیل خدا" کہتے ہین ۱۲۔ (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

کی اجازت نہ ہوتی تو لوگ اِس کی صحت کا اسقدر یقین نہ کرتے جس قدر کہ آج انھیں ہے۔ جن عقائد پر ہمیں زیادہ سے زیادہ اعتماد ہے، ان کے اعتماد کی بجز اس کے اور کوئی بنا نہیں ہے کہ ہم نے تمام دنیا کو ایک عام دعوت دے رکھی ہے کہ وہ آئیں اور ان کو بے بنیاد ثابت کریں۔ اگر یہ دعوتِ جنگ قبول نہ کی جائے یا اگر کیجائے اور کوشش ناکام رہے تو پھر بھی ہم یقین کامل سے کوسوں دور رہیں گے۔ لیکن ان کی صحت و صداقت کی طرف سے اطمینان کرنیکی جہانتک موجودہ عقل انسانی اجازت دے سکتی تھی، ہم نے انتہائی کوشش کرلی ہم نے کوئی ایسا دقیقہ اُٹھا نہیں رکھا جس سے حقیقت کے ہم تک پہونچنے میں کوئی دشواری ہو۔ اگر دروازہ کھلا رکھا جائے تو ہمیں اُمید ہے کہ جس وقت انسانی دماغ اِس سے بہتر حقیقت کے قبول کرنے کے قابل ہو جائیگا وہ اسے معلوم کرلے گا اور اس دوران میں ہمیں اعتماد ہوگا کہ اپنے زمانہ میں جس حد تک حقیقت کا حصول ممکن ہو سکتا تھا، اتنا ہم نے حاصل کرلیا۔ ایک خطا پذیر انسان کیلئے بس اِسی حد تک یقین کا حصول ممکن ہے، اور یہی اِس کے حصول کا واحد ذریعہ ہے۔

حیرت تو یہ ہے کہ لوگ ایک طرف تو آزادیِ مباحثہ کے تمام دلائل تسلیم کرتے ہیں لیکن دوسری طرف انھیں اِس امر پر اعتراض ہے کہ کیوں اِن دلائل کو حد سے زیادہ کھینچ کر لیجایا جاتا ہے۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ جب تک دلائل کسی انتہائی صورت کے لیئے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) [۲] سر آئزک نیوٹن انگلستان کا ایک بہت مشہور طبعی فلاسفر گزرا ہے۔ ۱۶۴۲ء میں انگلستان کے ایک چھوٹے سے قصبہ میں پیدا ہوا نیوٹن میں اوائل عمری سے ایجاد و اختراع کا مادہ تھا۔ اس نے کئی ایک نئی چیزیں بنائیں۔ اور یہی مادہ اُسے علمی مسائل کی تحقیق و تفتیش کیطرف بھی مائل کرتا تھا۔ وہ شروع سے فلکیات کے مطالعہ کا بہت شایق تھا اور اسی سلسلہ میں ثوابت و سیاروں کی نقل و حرکت کا پتہ لگاتے لگاتے اسنے کشش اجسام کا مسئلہ دریافت کیا جو نیوٹن کے دامن شہرت کا سب سے آبدار موتی ہے۔

صحیح نہین ہوتے وہ کسی صورت کے لیئے بھی صحیح نہین ہو سکتے۔ تعجب ہی کہ وہ اپنے کو خطا سے بری ہونے کا مدعی اِس حالت مین نہین سمجھتے۔ جن مسائل مین کچھ شک و شبہہ ہے اُن پر تو آزادی مباحثہ کو تسلیم کر لیا جائے لیکن بعض اصولون اور مسئلون پر اِس وجہ سے نکتہ چینی ممنوع کر دی جائے کہ وہ یقینی ہین یعنی ان کے یقینی ہونے کا خود انھین یقین ہے۔ کسی مسئلہ کو ایسی صورت مین یقینی کہنا جبکہ ایک شخص بھی ایسا موجود ہے کہ جس کو اگر اجازت دیجائے تو وہ اسکے یقینی ہونے سے انکار کریگا لیکن اِس کو اجازت نہین دیجاتی ہے، گویا یہ سمجھنا ہے کہ ہم خود اور وہ لوگ جو ہمارے ہمخیال ہین، اِس یقین کے فیصلہ کرنے والے ہین اور ایسے جج ہین کہ جنھون نے فریق ثانی کا کوئی بیان نہین سُنا ہے۔

موجودہ زمانہ مین جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ اعتقاد سے بالکل محروم ہے، لیکن پھر بھی وہ تشکک سے خوفزدہ ہے، جس مین لوگون کو اپنی رائے کے صحت کا چندان یقین نہین ہوتا جتنا انھین یہ خیال ہوتا ہے کہ اس رائے پر اعتقاد نہ رکھا تو کرینگے کیا؟ ایسے زمانہ مین کسی رائے کو جمہور کے حملہ سے محفوظ رکھنے کا دعویٰ اس رائے کی صحت پر چندان نہین ہو سکتا جتنا جماعت کے لیئے اس کی اہمیت کی بنا پر۔ کہا جاتا ہے کہ بعض اعتقادات بہبود عام کے لیئے اسقدر مفید بلکہ ناگزیر ہین کہ ان کو قائم رکھنا حکومت پر اسی قدر فرض ہے جتنا جماعت کے کسی اور مفاد کو محفوظ رکھنا۔ ایسی ضرورت کی حالت مین اور ایسی صورت مین جو بلا واسطہ اس کے فرائض کے زمرہ مین آتی ہو، خطا سے منزہ ہونے سے کم درجہ کی چیز ہی حکومت کو خود اپنی رائے پر جس کی تصدیق لوگون کی عام رائے سے ہو چکی ہو، عمل پیرا ہونے کا مجاز ٹھہرا سکتی

بلکہ اس پر مجبور کر سکتی ہے۔ اکثر یہ دلیل پیش کیجاتی ہے اور اس سے زیادہ خیال مین آتی ہے کہ ان مفید اعتقادات کو کمزور کرنے کی صرف برے آدمی ہی خواہش کر سکتے ہیں اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ برے آدمیون پر قیود عاید کرنے کو روکنے اور ان باتون کو روکنے مین جو صرف ایسے ہی اشخاص کر سکتے ہین، کوئی برائی نہین ہے۔ اس طرح کے خیال سے مباحثہ پر قیود عاید کرنیکے حق بجانب ہونے مین نظریون کی صداقت ہی کا سوال نہین رہ جاتا بلکہ وہ ایک افادیت کا مسئلہ بھی بن جاتا ہے اور اس طریقہ سے گویا اس پر رایون کے ایک ایسے جج ہونے کی ذمہ داری نہین رہی ہے جو اپنے کو ارتکاب غلطی کے امکان سے بری سمجھتا ہے لیکن جو لوگ اس طریقہ سے اپنے دل کو تسکین دے لیتے ہین، وہ یہ نہین سمجھتے کہ خطا سے منزہ ہونے کا خیال صرف ایک جگہ سے منتقل ہو کر دوسری جگہ چلا گیا ہے۔ کسی رائے کا مفید ہونا خود ایک رائے کا معاملہ ہے جو اسی قدر متنازعہ فیہ اور بحث کے قابل ہے جس قدر کہ خود رائے۔ جب تک کہ متنازعہ فیہ رائے کو اپنی مدافعت کا پورا موقع نہ ملے۔ اس وقت تک اس رائے کے مضر ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک غیر خاطی جج کی اسی قدر ضرورت ہے جس قدر اس کے غلط ہونے کا فیصلہ کرنے کے لئے۔ اور یہ کہنا کافی نہ ہوگا کہ ملحد گو اپنی رائے کے مفید یا بے ضرر ہونے پر یقین رکھے تو رکھے لیکن اس کی صداقت پر ایمان رکھنے کی اسے ممانعت ہے، رائے کی صداقت اس کے افادہ کا ایک حصہ ہے اگر ہمین یہ معلوم کرنا ہو کہ ایک چیز پر یقین رکھنا ضروری ہے یا نہین تو کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اس کی صحت و عدم صحت کے خیال کو علیحدہ کر سکتے ہین؟ برے لوگون کی نہین بلکہ بہترین لوگون کی یہ رائے ہے کہ کوئی عقیدہ جو صداقت کے منافی ہو وہ ہرگز

مفید نہین ہوسکتا اور کیا آپ ایسے لوگون کو اس دلیل کے پیش کرنے سے روک سکتے ہین کہ جن پر کسی ایسے مسئلہ کے انکار کرنے کا الزام لگایا گیا ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ مفید تو ہے لیکن اسے وہ صحیح نہین سمجھتے، جو لوگ عام مسلّمہ رایون کے قایل ہوتے ہین، وہ اس استدلال کے ممکن سے ممکن فوائد حاصل کرنے سے ذرا بھی نہین چوکتے۔ آپ انھین ہرگز نہ پائین گے کہ وہ افادیت کے سوال کو اس طرح اٹھائین گویا کہ یہ صداقت سے بالکل علٰحدہ کر لیا گیا ہے، بلکہ برعکس اسکے ان کا اصول چونکہ "تمام تر صداقت" ہی ہے اسلئے اس کا علم یا اس کا عقیدہ رکھنا اس درجہ ناگزیر سمجھا جاتا ہے۔ افادیت کے مسئلہ پر اس صورت مین کوئی بہتر مباحثہ نہین ہوسکتا جبکہ ایک طرف اس قدر مضبوط دلیل ہو اور دوسری طرف کچھ بھی نہ ہو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جب قانون یا عام جذبات کسی رائے کی صداقت پر بحث کرنے کا موقع نہ دین تو وہ اس کے مفید ہونے سے انکار کرنے کے بھی اسی قدر کم روادار ہون گے۔ زیادہ سے زیادہ جو رعایت وہ کرتے ہین وہ یہ کہ اسے بہت زیادہ ضروری نہین سمجھتے یا اس سے انکار کرنے کو قطعی جرم نہین قرار دیتے۔

بعض رایون کے اس بناپر سننے سے انکار کر دینے سے کہ ہم نے اپنے فیصلہ کے مطابق انھین رد کر دیا ہے، جو نقصانات ہوتے ہین انکی مزید وضاحت کے لیے بہتر ہی کہ بحث کے لیئے کوئی مخصوص مثال لے لی جائے اور مین ایسی مثالین لونگا جو بہت کم میرے موافق پڑتی ہین یعنی جن مین آزادی رائے کی مخالفت کے دلائل صداقت اور افادیت دو حیثیتون سے سب سے زیادہ قوی سمجھے جاتے ہون۔ مثال کے طور پر خدا اور آخرت پر ایمان کے مسئلہ کو یا کسی ایسے ہی اخلاق کے مسلّمہ مسئلہ کو لے لیجئے۔

اِس قسم کے مسائل پر بحث کرنے مین ایک غیر منصف مخالف کو بہت فائدہ ہوتا ہے کیونکہ وہ یقینی طور پر یہ کہے گا کہ (اور بہت سے وہ لوگ جو غیر منصف بننا نہین چاہتے، اپنے دلمین کہتے ہین)، کیا اِن مسائل کو آپ اس قدر یقینی نہین سمجھتے کہ قانون کے ذریعہ ان کی حفاظت کیجائے؟ کیا ایمان باللہ ایک ایسی شے ہے جس پر اعتقاد رکھنا آپکے خیال مین غیر خاطی بنناہے؟ لیکن مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجائے کہ کسی مسٔلہ پر (خواہ وہ کوئی مسٔلہ کیون نہ ہو) اعتقاد رکھنے کو مین غیر خاطی بننے کے نام سے موسوم نہین کرتا ہون بلکہ دوسرون کے لیئے اِس مسٔلہ کے فیصلہ کرنے کی ذمہ داری کو بلا انھین اِس بات کے سننے کا موقع دیئے ہوئے کہ اس کی مخالفت مین کیا کہا جا سکتا ہے۔ اور یہی چیز اگر خود میرے بڑے سے بڑے عقائد کے موافق استعمال کیجائے تو بھی مین اسے اسی قدر سختی کے ساتھ بُرا اور ناپسندیدہ سمجھون گا۔ کسی شخص کا یقین نہ صرف ایک رائے کی غلطی کے متعلق بلکہ اس کے ناگوار نتائج کے متعلق بھی، اور نہ صرف ناگوار نتائج کے بارے مین بلکہ (اگر مین وہی فقرہ استعمال کرون جسے مین اِس درجہ بُرا سمجھتا ہون) اُس کے خلافِ اخلاق و مذہب ہونے کے متعلق بھی خواہ کتنا ہی مضبوط کیون نہ ہو، پھر بھی اگر وہ اپنے اس فیصلہ کے مقابلہ مین جس کی تائید مین چاہے اسکے ملک یا اس کے زمانہ کا عام فیصلہ بھی ہو، مخالف رائے کو ظاہر نہین ہونے دیتا ہے تو وہ خطا سے منزہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے، اور اس رائے کو خلاف اخلاق یا خلاف مذہب بتا کر یہ دعویٰ کچھ کم قابل اعتراض یا کم خطرناک نہین ہوجاتا بلکہ اور سب صورتون سے زیادہ اِس صورت مین مہلک ثابت ہوتا ہے۔ یہی وہ مواقع ہوتے ہین جہان ایک نسل کے لوگ ایسی ایسی غلطیان کر جاتے ہین جنھین بعد کی آنیوالی نسلین سخت حیرت و استعجاب کی نظر سے دیکھتی ہین۔ انھی مین ہم کو ایسی

مثالین ملتی ہین جو تاریخ مین یادگار رہین گی۔ اور جہان قانون کا حربہ بہتر سے بہتر اشخاص اور عمدہ سے عمدہ اُصول کو بھی بیخ و بن سے اُکھاڑ کر پھینکدینے کے لیئے استعمال کیا گیا ہے، اور جہان تک اشخاص کا تعلق ہے اسکے نہایت افسوسناک نتائج ظاہر ہوچکے ہین البتہ بعض اُصول جو بچ رہے وہ بطور ستم ظریفی بعد کو ان لوگون کے خلاف اسی قسم کے ردّیہ کی حمایت مین پیش کیئے گئے ہین جنھون نے اسوقت اُنکی یا ان کی مسلّمہ تاویلون کی مخالفت کی۔

لوگون کو یاد ہوگا کہ ایک زمانہ مین سقراط[1] نامی ایک شخص تھا جس مین اور اس زمانہ کے مقنّنین اور رائے عامہ مین ایک بہت بڑا تصادم ہوا۔ یہ شخص ایک ایسے زمانہ اور ایک ایسے ملک مین پیدا ہوا جس مین کثرت سے بڑے بڑے لوگ ہوئے اور اسکے حالات ہم تک ایسے لوگون کے ذریعہ سے پہونچے ہین جو اُس کو اور اُس کے زمانہ کو اچھی طرح جانتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ وہ اس زمانہ کا سب سے زیادہ نیک شخص ہے۔ اور ہم بھی اسکے متعلق یہ جانتے ہین کہ وہ بعد کے آنے والے نیکی کے تمام معلّمین کا سرگروہ اور نمونہ تھا۔ اور افلاطون[2] کے بلند پایہ الہامات اور ارسطو[3] کی منصفانہ افادیت دونوں کا منبع ہے۔

[1] یہ پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان کا ایک بہت بڑا حکیم گزرا ہے۔ اس کے خیالات وعقاید اپنے زمانہ کے خیالات وعقاید سے بالکل جدا تھے، جسکی وجہ سے اس کے بعض حریفوں نے اس پر بد دینی اور بد اخلاقی پھیلانے کے جرم میں مقدمہ چلایا۔ سقراط نے اپنی برات وصفائی کیلیے عدالت کے سامنے اپنے خیالات کی تشریح کی جو بلاشبہ ایسی تھی کہ اسپر جرم عائد نہیں کیا جاسکتا تھا لیکن مخالفین کو چونکہ سقراط سے ایک گونہ شخصی وجماعتی کدتھی، اسلئے جوری کا فیصلہ خلاف ہوا اور بالآخر یونان کے اس سب سے بڑے حکیم کو اپنے ہموطنوں کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

[2] یہ بھی اسی صدی میں گزرا ہے لیکن اسکا زمانہ سقراط کے زمانہ کے کچھ بعد شروع ہوتا ہے۔ سقراط نے جو راستہ صاف کر دیا تھا اسپر یہ نہایت تیزگامی سے چلا۔ افلاطون نے اپنے فلسفیانہ خیالات چھوٹے چھوٹے مکالمات کی صورت میں پیش کئے ہیں جو بہت حد تک سقراط کے خیالات سے ماخوذ ہیں۔ اسنے اس علم وبصیرت کو جو سقراط

جو اخلاق اور دیگر اصناف فلسفہ کے سرچشمہ ہین۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے مفکرین کے اِس مسلمہ سردار کو جس کی شہرت آج دو ہزار سال سے زیادہ گزرنے کے بعد بھی برابر بڑھتی جارہی ہے اور ان سب ناموں پر فوقیت لے گئی ہے جو اُس کے وطن کو ممتاز کرتے ہین آج اس کے ہموطنوں نے بد اخلاقی پھیلانے کے جرم مین ایک عدالتی فیصلہ کے ذریعہ جان سے مار ڈالا۔ بیدینی یہ تھی کہ اُس نے ریاست کے مسلمہ معبودون کو ماننے سے انکار کردیا تھا بلکہ اسکا مستغیث تو اس پر بار بار یہی الزام لگاتا تھا کہ وہ کسی معبود ہی کو نہین مانتا ہے۔ بداخلاقی یہ تھی کہ وہ اپنے اصول اور تعلیم کے ذریعہ نوجوانون کو خراب کرتا ہے۔ اِن الزامات کا عدالت نے دیانتداری کے ساتھ اسے مجرم پایا جسے یقین نہ کرنے کی کوئی وجہ نہین۔ اور اس شخص کو جو غالباً اس وقت تک کے تمام لوگون سے زیادہ دنیا کے بہتر سے بہتر سلوک کا مستحق تھا، مجرم قرار دیکر سولی پر چڑھادیا۔

اِس کے بعد عدالت کی بے انصافی کا بس وہ واقعہ بیان کرنا چاہتا ہون جس کا ذکر سقراط کے واقعہ قتل کے بعد اتار یا زوال کلام نہ سمجھا جائیگا۔ یہ واقعہ کیلوری پر واقع ہوا جسے کوئی اٹھارہ سو سال سے زیادہ کا زمانہ گزرا۔ وہ شخص جس نے ان لوگون کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) سے پہلے مخصوص لوگوں کا حصہ سمجھی جاتی تھی ایک عام شے بنادی۔ یہ سقراط کے خاص رفقا میں تھا اور جس وقت سقراط کو عدالت سے سزا کا حکم ملا ہے اسنے جلا وطنی اختیار کر لی۔ ۳؎ ارسطو یونان کا ایک بہت بڑا فلسفی گزرا ہے جو ۳۸۴ ق م میں پیدا ہوا۔ وہ عقل و فہم میں اس درجہ بلند پایہ رکھتا تھا کہ افلاطون اسے اپنے اسکول کا "دماغ" سمجھتا تھا۔ اکزنوکریٹیز سے مقابلہ کرتے ہوئے افلاطون کہتا ہے کہ اسے مہمیز کی ضرورت تھی لیکن ارسطو کیلئے لگام لگانے کی ضرورت پڑتی تھی۔ کچھ عرصہ کے بعد جب اسے مقدونیہ سے اسکندر کے اتالیقی کی دعوت آئی تو وہ وہاں چلا گیا۔ یہاں وہ کوئی آٹھ سال تک رہا اور اس عرصہ میں سکندر اور اُس کا باپ فلپ دونوں اس کی بڑی علمی قدر افزائی کرتے رہے۔ اسکندر کی قدر و منزلت اس کی زندگی بھر جاری رہی۔

حافظہ پر جنھوں نے اس کی زندگی دیکھی اور اس کی باتیں سنی تھیں، اخلاقی عظمت و شوکت کا ایک ایسا اثر چھوڑا ہے کہ اس وقت سے اٹھارہ صدیاں برابر اس کو خدا کا اوتار مانتی آئی ہیں۔ ایک ایسے شخص کو اس بیدردی کے ساتھ قتل کر ڈالا گیا اور وہ بھی کس حیثیت سے؟ مفتری اور کافر کی حیثیت سے۔ لوگوں نے یہی نہیں کہ اسے اپنا محسن نہ سمجھا بلکہ جیسا وہ تھا اس کے بالکل برعکس سمجھا اور اس کے ساتھ ایک بدترین فاسق و فاجر کا سا برتاؤ کیا، جس بنا پر کہ آج خود وہ ایسے ہی سمجھے جاتے ہیں۔ جن جذبات سے کہ لوگ آج ان دردانگیز واقعات کو دیکھتے ہیں، بالخصوص ان میں سے ثانی الذکر واقعہ کو، ان کی بنا پر ان غریبوں پر حکم لگانے میں بڑی ناانصافی ہوتی ہے جنھوں نے اس واقعہ میں حصہ لیا تھا۔ یہ لوگ کسی حیثیت سے بُرے آدمی نہ تھے، کچھ اس سے بھی زیادہ بُرے نہ تھے جیسے کہ عام طور پر لوگ ہوتے ہیں بلکہ وہ ان سے کہیں بہتر تھے۔ یہ ایسے لوگ تھے جن میں مذہبی، اخلاقی اور وطنی جذبات جو ان کے زمانہ میں اور ان کی قوم میں تھے، بدرجہ اتم موجود تھے۔ یہ اس قسم کے لوگ تھے جنھیں ہر زمانہ میں حتیٰ کہ آج کل بھی پاکبازانہ اور باعزت زندگی گزارنے کے تمام مواقع حاصل ہیں۔ وہ سب سے بڑا پجاری جس نے اُن الفاظ کو سنکر اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے جو کہ اس کے ملک کے خیالات کے مطابق انتہائی جرم میں داخل تھے، وہ غالباً اپنے اظہار غیظ و غضب میں اسی قدر سچا تھا جس قدر کہ آج عام طور پر باعزت اور نیک لوگ اپنے مذہبی اور اخلاقی جذبات میں ہوتے ہیں اور اکثر وہ لوگ جو آجکل اس فعل پر متنفر ہیں اگر وہ اس زمانے میں ہوتے اور ایک یہودی کے گھر جنم لیتے تو وہ بھی بالکل وہی کرتے جو اس نے کیا تھا۔ وہ کٹّر عیسائی جو یہ سمجھتے ہیں کہ جن لوگوں نے ان شہداء اوّلین کو سنگسار کیا تھا وہ ہم سے کہیں زیادہ بُرے لوگ تھے، انھیں یہ یاد

رکھنا چاہیئے کہ انہی ظلم کرنے والون مین سے ایک شخص پولوس[۵۱] مقدس بھی تھا۔

اِن کے علاوہ ایک اور مثال لیجیئے۔ اگر غلطی کے سنگین ہونے کی دلیل غلطی کرنیوالے کی عقل و فہم پر منحصر ہے تو یہ مثال اِن سب سے زیادہ موزون ہے۔ اگر کِسی صاحب قوت کو اپنے معاصرین مین خود کو سب سے بہتر اور سب سے زیادہ روشن خیال سمجھنے کا حق ہوسکتا تھا تو وہ شہنشاہ مارکس[۵۲] اوریلیس تھا۔ باوجود اس وقت کی تمام متمدن دنیا کا مطلق العنان حکمران ہونے کے

---

[۵۱] پولوس مقدس جن کا پہلے ساؤل نام تھا مسیحی ہونے سے پیشتر عیسائیوں کے بہت بڑے دشمن تھے۔ ایکبار وہ کہیں جا رہے تھے کہ غیب سے یہ آواز آئی "اے ساؤل' تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟" اسکے بعد ساؤل نے عیسائیوں کو ستانا چھوڑ دیا اور عیسائی مذہب کا زبردست حامی ہوگیا۔

[۵۲] مارکس اوریلیس سلطنت رومہ کا بادشاہ گزرا ہے جو ۱۲۱ء مین شہر روم مین پیدا ہوا۔ اس کی تعلیم بہت تھوڑی ہوئی تھی اور وہ بھی زیادہ تر اتالیقون کی نگرانی مین۔ پھر بھی وہ کہا کرتا تھا کہ مین اپنے خداؤن کا ممنون ہون کہ اُنھون نے مجھے اچھے باپ دادے، اچھی بہن، اچھے اُستاد، اچھے دوست احباب اور ہر چیز اچھی عطا کی۔ گیارہ سال کی عمر مین اسکی ڈایوگنیٹس نامی ایک شخص سے ملاقات ہوئی جو ایک بہت بڑا مصوّر تھا اور فلاسفہ کے اس طبقہ سے تعلق رکھتا تھا جن کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر شے کی حقیقت مادّی ہے۔ مارکس اس کے خیالات سے اسقدر متاثر ہوا کہ اس نے اسی طبقہ کا لباس بھی اختیار کر لیا۔ وہ اِس فرقہ کی وضع قطع کا اِس سختی سے پابند ہوگیا کہ اس کی وجہ سے اس کی صحت بھی خراب ہوگئی۔ اِس نے اپنے فرقہ کے اساتذہ سے محنت و جفاکشی، عاجزی و انکسار، تحمل و برداشت، عزم و استقلال، پاس و لحاظ کے اوصاف حاصل کیئے۔

چالیس سال کی عمر مین وہ سلطنت رومہ کے تخت پر بیٹھا، اس کا زمانہ نہایت اضطراب و پریشانی کا زمانہ تھا لیکن باوجود اِس کے اس نے نہایت کامیابی کے ساتھ سلطنت کو قایم رکھا وہ اپنے آپ کو لوگون کا خادم سمجھتا تھا، اور اس لحاظ سے باہمی تنازعات کی کمی، مصارف سلطنت مین تخفیف، عام اخلاق و تہذیب کی اصلاح، اور تماشے و تفریحات مین اعتدال پیدا کرنے کی طرف خاص توجہ رکھتا تھا (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

اس نے ساری عمر نہ صرف انصاف و عدل کے ساتھ زندگی بسر کی، بلکہ ایک رنج و خوشی سے بے نیاز رہنے والے شخص سے جس بات کی کم سے کم توقع ہو سکتی تھی، وہ یہ کہ وہ اپنے سینہ کے اندر ایک نرم دل بھی رکھتا تھا۔ تھوڑی بہت جو خامیاں اِس کی طرف منسوب کی جاتی ہین وہ سب اس کی نرمی اور رعایت سے تعلق رکھتی ہین، حالانکہ اس کی تحریرین جو قدما کے دماغ کی اعلیٰ ترین اخلاقی تخلیق کہی جا سکتی ہین، وہ حضرت مسیح کی امتیازی تعلیمات سے بمشکل مختلف ہیں۔ یہ شخص جو بجز ظاہری رسوم و عبادات کے ہر حیثیت سے تقریبًا اُن تمام بڑے بڑے عیسائی حکمرانون سے بہتر عیسائی تھا جنھون نے اسکے بعد حکومت کی، اس نے عیسائی مذہب پر ظلم و ستم کیئے، اور باوجود اس کے کہ اسوقت کے تمام کمالات انسانی کی سب سے انتہائی منزل پر تھا اور ایک ایسا روشن اور آزاد دماغ اور ایک ایسی سیرت رکھتا تھا جس کی وجہ سے اس نے خود اپنی تحریرون مین مسیحی خیالات و عقائد کو سمو لیا تھا، پھر بھی وہ اپنے ان فرایض ملکی مین جن سے کہ اسے اتنا گہرا تعلق تھا، یہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اس کی قانونی اور عدالتی اصلاحات خاص طور پر قابل توجہ ہین، اسکی ذات سے غلامون، وارثون، عورتون اور بچون کو خاص طور پر نفع حاصل ہوا۔

اورلیس اپنی ساری عمر مذہب عیسوی کا مخالف رہا۔ اس کے عہد مین عیسائیون پر بہت مظالم ہوئے جن کی ذمہ داری بعض مورخین اسی کے سر رکھتے ہین۔ اس کے زمانے مین یونانی فلسفہ کا بہت زور تھا، اور عیسائی مذہب اس کے بالکل خلاف پڑتا تھا، اورلیس ایک محبّ وطن اور معقول آدمی تھا ابتدا ہی سے اس نے یہ کوشش کی کہ رومی مذہب اور سلطنت کے مقاصد مین تصادم نہونے پائے۔ وہ آٹھ ہی سال کی عمر مین پادری ہو گیا اور تھوڑے عرصہ مین تمام ضروری رسوم و عبادات سیکھ لیئے۔ بالآخر اس نے محسوس کیا کہ یہ دونو چیزین یکجا جمع نہین ہو سکتی ہین اور اسلیئے اس نے عیسائیون پر سختی اور تشدد کرنا شروع کیا۔

نہ سمجھ سکا کہ عیسائی مذہب دنیا کے لیئے لعنت ثابت ہونے کی بجائے رحمت کا باعث ہوگا۔ اسوقت وہ یہ سمجھتا تھا کہ موجودہ سوسائٹی نہایت ہی خواب حالت مین ہی، مگر وہ جیسی کچھ بھی تھی، اس کا خیال تھا کہ جو مذہبی عقائد اس وقت ہین انہی پر عقیدہ و ایمان رکھنے کی وجہ سے یہ آپسمین متحد و منسلک ہے اور اسی وجہ سے اس نے حالت کو بد سے بدتر ہو جانے سے روکا۔ بہ حیثیت ایک حکمران کے اس نے اپنا یہ فرض سمجھا کہ جماعت کے شیرازہ کو بکھرنے نہ دے اور اسے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اگر اسوقت کے موجودہ رستے ٹوٹ گئے تو پھر اور رشتے کیونکر قایم کیئے جا سکتے ہین جو جماعت کو اسی طرح باہم مربوط و منسلک کر سکین۔ اس نئے مذہب کا صاف مقصد یہ تھا کہ وہ ان رشتون کو توڑ دے، لہذا جب تک اس نے یہ نہ سمجھا کہ اس مذہب کو قبول کرنا اسکا فرض ہی، اس وقت تک اس نے اسکو روکنا ہی اپنا فرض جانا۔ چونکہ عیسائی دینیات اسے نہ سچی معلوم ہوتی تھی نہ الٰہی الاصل، اور چونکہ ایک مصلوب خدا کے عجیب و غریب قصہ پر اسے یقین نہین آتا تھا اور ایک ایسی نظام دینیات جو تمامتر ایسی بنیاد پر قایم ہو جو اسکے نزدیک اس درجہ ناقابل یقین تھی، وہ اسے کسی طرح ایک حیات بخش شے نظر نہ آسکتی تھی جو فی الحقیقت باوجود تمام خامیون کے وہ ثابت ہوئی۔ چنانچہ اس بہتر سے بہتر فلسفی اور بڑے سے بڑے حکمران نے بکمال احساس فرض شناسی مذہب عیسوی پر ظلم و تشدد کرنے کی اجازت دیدی۔

میرے نزدیک یہ واقعہ تاریخ کے بڑے سے بڑے درد انگیز واقعات مین سے ہی۔ یہ خیال کرکے تکلیف ہوتی ہی کہ اگر عیسائی مذہب قسطنطین[1] کی بجائے مارکس اوریلیس کے زمانہ مین

[1] قسطنطین (۱۷۷۹ء تا ۱۸۳۱ء) روس کا ایک بہت بڑا حکمران گزرا ہے۔ اس نے پولینڈ کی ایک عورت سے شادی کر لی تھی اسلئے اسنے پولینڈ کو روس سے علیحدہ ہونے کی کوشش کو کامیاب نہ ہونے دیا جسکی وجہ سے اسے ہمیشہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔

حکومت کا مذہب تسلیم کر لیا گیا ہوتا تو آج یہ کتنا مختلف ہوتا۔ لیکن ساتھ ہی اس امر سے انکار کرنا انصاف اور حق دونو کے خلاف ہوگا کہ جو دلائل عیسائیت کی مخالف تعلیمات کو موردِ سزا قرار دینے کے لیئے استعمال کیئے جاتے ہین اُن مین سے کوئی بھی ایسی دلیل ہے جو مارکس اوریلیس کی عیسائیت کو موردِ سزا قرار دینے کے لیئے استعمال نہ کیجا سکتی ہو۔ جسطرح عیسائیون کا عقیدہ ہے کہ خدا کے وجود سے انکار کرنا بُرا ہے، اور اس سے جماعت کا تمام شیرازہ بکھر جائیگا، اسی طرح مارکس اوریلیس کا بھی عیسائیت کے متعلق یہی عقیدہ تھا۔ یعنی اس شخص کا جو اپنے زمانہ مین اس مذہب کے قبول کرنے کا سب سے زیادہ اہل سمجھا جاسکتا تھا تاوقتیکہ وہ شخص جو اشاعتِ آراء پر سزا دینے کا قائل ہے، اپنے دل کو اطمینان نہ دے لے کہ وہ مارکس اوریلیس سے زیادہ دانا اور عقلمند ہے یعنی اپنے زمانہ کی فہم و ذکاء مین اس سے بلند پایہ رکھتا ہے، دماغی حیثیت سے اس سے بلند سطح پر ہے، تلاشِ حق مین اس سے زیادہ سرگرم ہے، حق کے پالینے پر وہ اس پر عمل کرنے مین اس سے زیادہ انہاک رکھتا ہے اُسوقت تک اسے اپنے اور اپنے زمانہ کے خطا سے پاک ہونے کے خیال سے احتراز کرنا چاہیئے کہ یہ وہ خیال ہے جو انتونیس[۱] اعظم نے رکھکر ایسے افسوسناک نتائج پیدا کیئے۔

اس بات کو ناممکن سمجھکر کہ مذہبی خیالات کو روکنے کے لیئے سزا کے استعمال کی تائید کسی ایسی دلیل سے بھی کیجا سکتی ہے جس سے دوسری طرف مارکس انتونیس کے طرز عمل کو بھی حق بجانب نہ ٹھہرایا جاسکے، ایسی صورت مین جو لوگ مذہبی آزادی کے مخالف ہیں وہ کبھی کبھی جب بہت مجبور کیئے جاتے ہین تو اس بات کو تسلیم کر لیتے ہین

---

[۱] مارکس انتونیس (۱۲۱ء ق م تا ۸۷ ق م) اپنے زمانہ کے سب سے مشہور رومی مقررین میں تھا۔ وہ اپنے اس فن میں سسرو کا مقلد تھا۔ علاوہ اس کے وہ کئی ایک سرکاری عہدوں پر بھی کام کر چکا ہے اور ۸۷ ق م میں جب دشمنوں کے ہاتھ پڑ آیا تو اسے جان سے مار ڈالا گیا۔

اور ڈاکٹر جانسن کے ہمنوا ہوکر کہتے ہیں کہ جن لوگوں نے عیسائی مذہب پر اسقدر ظلم و ستم روا رکھا وہ بالکل حق بجانب تھے۔ تشدد ایک ایسی آزمائش ہے جس سے حق کو گزرنا

سلہ سیموئیل جانسن ایک کتب فروش کا لڑکا تھا جو ۱۷۰۹ء میں انگلستان کے ایک چھوٹے سے شہر لچفیلڈ میں پیدا ہوا اسکی ابتدائی تعلیم بہت بے ضابطہ اور معمولی ہوئی۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا، اپنی محنت اور کوشش سے حاصل کیا۔ ایک دولتمند شخص کی امداد سے آکسفورڈ میں داخل ہوا، وہاں دو سال بھی مشکل سے گزرے ہونگے کہ یہ سلسلہ منقطع ہوگیا، جانسن اپنی زندگی کے ابتدائی ایام میں کچھ پاگل سا رہا کرتا تھا، اسکی زندگی نہایت عسرت اور تنگدستی میں بسر ہوتی تھی اس نے اپنی آمدنی کے لئے علمی زندگی اختیار کی، اور اس غرض سے لندن میں قیام کرنے لگا۔ وہ مختلف رسائل میں مضامین لکھتا، رسالے اور کتابیں تصنیف کرتا۔ پھر بھی اسکے اخراجات کے لئے یہ آمدنی کافی نہ ہوتی تھی۔ اسی حالت میں اس نے ایک محبوبہ سے شادی کرلی جس نے اس کی حالت کو بد سے بدتر بنا دیا۔ جانسن اسی فقر و فاقہ کی حالت میں ۳۰ سال تک اپنی زندگی بسر کرتا رہا۔ ۱۷۶۲ء میں یکبارگی اُس کی حالت بدلی۔ شروع ہی سے وہ اس زمانہ کے شاہی خاندان کا مخالف تھا، لیکن اندنوں مالیات کا افسر اعلیٰ اسکا سیاسی ہمخیال تھا جسکی کوششوں کی بدولت اسکے لیئے حکومت کی طرف سے تین سو سالانہ کا ایک وظیفہ مقرر ہوگیا۔ اس کے بعد سے جانسن کسیقدر سکون اور اطمینان کی زندگی گذارنے لگا لیکن آگے چلکر یہی زندگی کاہلی اور سستی کی زندگی ہوگئی وہ دن کے دو دو بجے تک پڑا سوتا رہتا اور صبح کے چار بجے تک بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا، لیکن زمانہ نے اسکو اس حالت میں رہنے کا زیادہ موقع نہ دیا۔ اور اب وہ تھوڑا بہت کام کرلیا کرتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ جانسن کو اپنی ساری زندگی کی محنتوں کا پھل کھانا تھا، آکسفورڈ یونیورسٹی نے اسے ڈاکٹری کی اعزازی ڈگری دی، رایل اکادیمی نے اسے اپنے ہاں پروفیسری کیلئے مدعو کیا۔ اور ملک معظم نے اسے شرف باریابی بخشا۔

جانسن قلم کا بادشاہ تو تھا ہی، لیکن وہ زبان کا بھی مالک تھا سکون و اطمینان کی اس زندگی نے اسے دوست احباب اور مقربین اور مصاحبین کی صحبت کا ایسا عادی بنا دیا تھا کہ (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

لازمی ہے اور یہ نہایت کامیابی کے ساتھ گزر بھی جاتا ہے، قانونی سزائیں اخیر میں چلکر حق کے مقابل میں بالکل بے کار ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ بعض وقت یہی تعزیرات افلاطون کے خلاف بہت موثر بھی ثابت ہوئی ہیں۔ یہ ایک ایسا استدلال ہے جو مذہبی عدم رواداری

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گذشتہ) وہ گھنٹوں بیٹھا مختلف موضوع پر باتیں کیا کرتا تھا قدرت نے چونکہ اسے ایک اعلیٰ دماغ اور وسیع نظر عطا کی تھی اسلئے اسکی یہ جواہر ریزے بھی اس کی تحریری گلکاریوں سے کچھ کم انمول نہ ہوتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ بے قاعدہ صحبت ایک باضابطہ مجلس کی صورت اختیار کر گئی، انہی مصاحبین میں ایک شخص باسول نامی بھی تھا جو اڈنبرا کا رہنے والا تھا لیکن اکثر جانسن کی صحبت سے فیض حاصل کرنے کے لیئے یہاں چلا آتا تھا وہ جب گفتگو کرتا تو عمداً ایسے سوالات کرتا جس سے جانسن اپنے قیمتی خیالات ظاہر کرنے پر مجبور ہوتا، باسول ان جواہر ریزوں کو اپنی اس چھوٹی سی کاپی میں درج کر لیتا جو وہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا یہی وہ تعلیقات تھے جنھیں پھیلا کر اس نے جانسن کی شہرۂ آفاق سوانح عمری لکھی ۔

اپنی زندگی کے آخری حصہ میں جانسن کو ایک نہایت ناخوشگوار واقعہ پیش آیا۔ اس نے اسکاٹلینڈ کے بعض ایسے لوگوں کے حالات لکھے جو اس وقت تک غیر متمدن حالت میں رہتے تھے۔ جانسن کے یہ خیالات لوگوں کو پسند نہ آئے اور اس پر بہت لے دے ہوئی۔ بعض پرجوش لوگوں نے اس کو مارنے پیٹنے کی دھمکی دی۔ بعضوں نے طعن و تشنیع پر اکتفا کیا۔ لیکن ایک اس سے بھی زیادہ خلاف توقع بات پیش آئی اور وہ یہ کہ انہی دنوں انگلستان اور اہل امریکہ میں محصول کے معاملہ پر جنگ چھڑی ہوئی تھی، وزرائے انگلستان نے جانسن کو ایک سحر نگار اہل قلم دیکھکر اپنے موافقت میں کام لینے کیلئے تاکا، بدقسمتی یہ کہ جانسن بھی ان کے پھندے میں آگیا اور اس نے "محصول لگانا کوئی ظلم نہیں" کے عنوان سے ایک کتاب لکھ ڈالی جس پر مختلف حلقوں سے سخت ناپسندیدگی اور نفرت کا اظہار کیا گیا۔ سچ یہ ہے کہ جانسن سب کچھ رہا ہو لیکن وہ مدبر ہرگز نہ تھا، یہ ایسی غلطی تھی جس کی تلافی مشکل ہی سے ہو سکتی تھی۔ پھر بھی اس کی خوبیاں اس کے عیوب سے کہیں زیادہ تھیں (بقیہ حاشیہ صفحۂ آئندہ پر)

کے لیئے اکثر استعمال کیا جاتا ہو اور جو اس قدر کافی اہم ہے کہ اس پر بغیر نظر کیئے نہیں رہا جا سکتا ایک اس قسم کے نظریے کے متعلق جس کا یہ مفہوم ہو کہ حق پر تشدد کرنے مین کوئی ہرج نہین ہو اس لیئے کہ تشدد اُسے کوئی نقصان نہین پہونچا سکتا، یہ الزام تو نہین لگایا جا سکتا کہ یہ جدید حقائق کے قبول کرنے مین مانع ہو لیکن ہم اس کے اطلاق کو ان اشخاص پر کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے جن سے کہ ان حقائق کے لیئے بنی نوع رہین منت ہون۔ دنیا کے سامنے کوئی ایسی چیز تحقیق کر کے پیش کرنا جس کا اس سے بہت گہرا تعلق ہو اور جن سے وہ پہلے ناواقف رہی ہو، یا کسی دنیوی یا روحانی اہم مسئلہ مین اس کی غلطی کو ثابت کر کے بتانا، یہ ایسی ہی اہم خدمات ہین جیسی کوئی شخص اور اپنے بھائیون کی انجام دے سکتا ہو، اور بعض حالات مین مثلاً شروع زمانہ کے عیسائیون اور مصلحین کے معاملہ مین تو وہ لوگ جو ڈاکٹر جانسن کے ہمخیال ہین، اسے ایک بیش بہا نعمت سمجھتے ہین جو انسان کو قدرت کی طرف سے عطا ہو سکتی ہو ایسے عظیم الشان مفید کام کرنیوالون کو اجر یہ ملے کہ وہ شہید ہون، ان کا صلہ یہ ہو کہ ان کے ساتھ بڑے سے بڑے مجرم کا سا سلوک کیا جائے۔ یہ اس نظریے کی بنا پر کوئی افسوسناک غلطی یا بدنصیبی کی بات نہین ہو جو انسان کے لیئے رنج و ماتم کا باعث ہو بلکہ یہ ایک عام بات ہو۔ کسی نئی حق بات کے کہنے والے کے ساتھ اس نظریے کی رو سے وہ برتاؤ ہونا چاہیئے جو لوکرینون کی قانون سازی مین ہوتا تھا کہ ہر نئے قانون کے تجویز کو اپنی گردن مین ایک رسی باندھ کر کھڑا رہنا پڑتا تھا کہ جہان جمعیۃ خلق نے اس کے دلائل سننے کے بعد اس کی تجویز کو منظور نہ کیا وہین فوراً اسے کس دیا جاتا تھا۔ جو لوگ دنیا کے محسنون کے ساتھ

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) اور وہ باوجود عسرت و تنگدستی اور فقر و فاقہ کی زندگی گزارنے کے آج شہرت و ناموری کی دولت سے مالا مال ہو، اور جب تک علم و فن کا وجود باقی ہو اس کا نام اسی طرح روشن رہیگا۔

اِس قسم کے برتاؤ کو اچھا سمجھتے ہین، اِن سے یہ توقع ہرگز نہین ہوسکتی کہ وہ اِن فوایدکی کچھ بہت زیادہ قدر کرین گے اور میرا خیال ہو کہ اس مسئلہ کے متعلق یہ نقطۂ نظر بس ایسے لوگون کا ہی جو یہ سمجھتے ہین کہ جدید حقایق کی ضرورت ممکن ہو کہ کسی زمانہ مین رہی ہو لیکن اب ان کی کوئی ضرورت نہین ہی۔

لیکن درحقیقت یہ دعویٰ کہ حق ہمیشہ ظلم و تشدد پر غالب آتا ہی، ان خوشنما جھوٹی باتون مین سے ہے جو لوگ یکے بعد دیگرے ہمیشہ سے کہتے آئے ہین یہان تک کہ وہ روزمرہ کی بول چال بن جاتے ہین لیکن جن کی تجربات انسانی کبھی تائید نہین کرتے۔ تاریخ کے صفحات ایسی مثالون سے پُر ہین کہ جہان حق کو ظلم و تشدّد سے دبا دیا گیا ہے۔ گو یہ ہمیشہ کیلئے دبا نہ دیا جائے، تاہم صدیون پیچھے اسے ضرور پھینک دیا جا سکتا ہی، ایک مذہبی خیالات ہی کو لیجیے۔ اِصلاحؔ کی تحریک لوتھر سے قبل تقریبًا بیسیون بار اُٹھی اور دبا دی گئی۔ آرنلڈ آف بریشیا کو روکا گیا، فراڈولسینو کو روکا گیا۔ سیلو وِنیرولا کو روکا گیا البی جینویس کو رُوکا گیا۔

ـلہٰ "اِصلاح" کی تحریک سے مراد وہ تحریک ہی جو پندرہوین صدی عیسوی مین رومی کاتھولکی کلیسا کے خلاف اُٹھائی گئی تھی رومی کاتھولکی کلیسا اس زمانہ مین مذہبی خرابیون اور بے اعتدالیون کا مرکز بنا ہوا تھا، کہ یکایک ایک خدا کا بندہ لوتھر نامی ۱۴۸۳ء مین پیدا ہوا۔ اور اس نے اِن تمام بُرائیون اور بے اعتدالیون کو بے نقاب کر دیا اور چاہا کہ اِس خدا کے گھر کی اصلاح کرے لیکن یہ کب ہو سکنے کی! مجبورًا اس نے اپنی ایک الگ جماعت بنالی، اور رفتہ رفتہ اِس مین اضافہ ہوتا گیا۔ یہ جماعت چونکہ اپنے کو رومی کلیسا مین شامل نہین کرنا چاہتی تھی، اسلئے اِسس جماعت کو لوگ "پروٹسٹانی" یعنی احتجاجیئین کہنے لگے، اور ان کے مسلک کو "پروٹسٹانی مذہب" کے نام سے منسوب کرنے لگے یہ مذہب اسپین، اٹلی، فرانس، انگلستان اور یورپ کے تمام دیگر ممالک مین جا پھیلا اور ہر جگہ اسکو کاتھولکی مذہب سے دوچار ہونا پڑا۔ اصلاح کلیسا کی تحریک اِس سے پیشتر بھی کئی بار مختلف (بقیہ حاشیہ صفحہ آیندہ پر)

واڈ واکورو کا گیا۔ لالرڈ لوگون کو دبایا گیا ہسائیٹ لوگون کو دبایا گیا۔ لوتھر کے زمانے کے بعد بھی جہان کہین تشدّد کا سختی کے ساتھ استعمال کیا گیا وہان وہ کامیاب رہا۔ اسپین اٹلی، فلینڈرس، آسٹریا ان مین سے ہر جگہ پر وتستائی مذہب بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینکدیا گیا اور بہت ممکن تھا کہ انگلستان مین بھی اِس کا یہی حشر ہوتا اگر ملکہ میری زندہ رہتی یا ملکہ ازبتھ مرجاتی۔ ظلم و تشدد ہمیشہ کامیاب رہا ہی، بجز ان صورتون کے کہ جہان مخالفین کی جماعت اسقدر مضبوط رہی ہو کہ ان پر تشدّد کا زور نہ چل سکا۔ کوئی سمجھدار شخص اِس مین شبہہ نہین کر سکتا کہ مذہب عیسوی سلطنت رومہ مین کبھی کا مٹ چکا ہوتا، لیکن یہ پھیلا اور ساری سلطنت پر چھا گیا، اسلیئے کہ مظالم گاہ گاہے ہوتے رہے، اور ہوتے بھی تو بہت کم عرصہ کیلئے اور ان کے درمیان آپس مین اسقدر طویل وقفے ہوتے تھے کہ جن مین انھین تبلیغ و اشاعت کا کافی موقع مِل جاتا تھا۔ یہ ایک لغو نازک خیالی ہی کہ حق بذات خود اپنے اندر کوئی ایسی فطری قوت رکھتا ہے جو باطِل مین نہین اور جس سے وہ دار ورسن کے مقابل مین کبھی غالب آتا ہی۔ لوگ حق کیلئے کچھ اس سے زیادہ بےچین نہین رہتے جتنا باطل کیلئے، اور قانونی یا معاشرتی سزاون کا تھوڑا سا استعمال بھی، حق ہو یا باطل، اِن مین سے ہر ایک کی اشاعت کو روکنے مین کامیاب ہو سکتا ہے، اصلی فائدہ جو حق مین مضمر ہی وہ درحقیقت اس مین ہی کہ جب کوئی رائے حق ہوتی ہی تو وہ اگرچہ ایک مرتبہ، دو مرتبہ یا اِس سے بھی زیادہ دبائی جائے، لیکن کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد اکثر ایسے اشخاص ملجاتے ہین جو اسے پھر تلاش کر لیتے ہین یہان تک بعض وقت اس کا ظہور ایسے زمانون

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) مقامات سے اُٹھائی جاچکی ہی اور ہر جگہ اس کو تشدد و سختی اور ظلم و ستم سے مقابلہ کرنا پڑا ہی، آئندہ سطروں میں جو نام آئے ہیں وہ انھی مصلحین اور فرقوں کے ہیں جنھیں اپنے خیالات کے اظہار سے روکا گیا۔

مین بھی ہوتا ہی جبکہ موافق حالات کی وجہ سے یہ تشدد سے بچ رہتا ہے، اور پھر اسقدر ترقی کرجاتا ہی کہ بعد کو اس کے دبانے کی تمام کوششین ناکام رہتی ہین۔

اسکے جواب مین یہ کہا جائیگا کہ اب ہم جدید آراء کے محرکین کو پھانسیان نہین دیتے ہین۔ ہم اپنے ان آباؤ اجداد کی طرح نہین ہین جو انبیاء کو قتل کرڈالتے تھے بلکہ ہم تو ان کے مرنے کے بعد اُن کی قبرون پر قبے اور مزارات بناتے ہین۔ یہ صحیح ہے کہ اب ہم مخالفین و منکرین کو جان سے نہین مار ڈالتے اور جتنی سختیان کہ موجودہ زمانہ کے جذبات بُری سے بُری رایون کے خلاف گوارا کرسکتے ہین، وہ اِس قدر زیادہ نہین ہوتین کہ ان رایون (خیالات) کو نیست و نابود کردین لیکن ہم کو خوش نہونا چاہیئے کہ ہمارا دامن قانونی سختیون تک کے داغ سے بھی بالکل پاک ہی۔ خیالات کے لیئے یا کم سے کم ان کے اظہار کیلیے قانون مین سزائین اب بھی موجود ہین اور ان کا استعمال اِس زمانہ مین بھی کچھ اسقدر شاذ و نادر نہین ہی کہ یہ پورے طور پر یقین ہوسکے کہ وہ ایک نہ ایک دن پورے زور و شور کے ساتھ پھر شروع نہوجائے گا۔ ۱۸۵۷ء مین صوبہ کارنوال[۱] کی عدالت گرما مین ایک بدنصیب شخص کو جس کے متعلق بیان کیا جاتا ہی کہ وہ کوئی غیر معمولی عادات و اطوار کا آدمی بھی نہ تھا اس بنا پر اکیس مہینہ قید کی سزا دی گئی تھی کہ اس نے عیسائی مذہب کے متعلق کچھ ناگوار الفاظ کہے تھے اور ان الفاظ کو ایک دروازہ پر لکھدیا تھا۔ اسی زمانہ مین ایک ہی مہینے کے اندر اولڈ بیلی[۲] مین دو

---

[۱] یہ شخص طامس پولی نامی ہے جس کو باڈمن کی عدالت سے ۳۱ ر جولائی ۱۸۵۷ء کو سزا ہوئی تھی۔ لیکن بعد کو پھر دسمبر کے مہینہ مین اُسے ملک معظم کی طرف سے معافی مل گئی (مصنّف)

[۲] اِن دونون اشخاص مین سے ایک جارج جیکب ہولیوک تھا جسے ۱۷ ر اگست ۱۸۵۷ء کو اور دوسرا ایڈورڈ ٹرولو تھا جسے جولائی ۱۸۵۷ء مین یہ سزائیں ملی تھیں۔ (مصنّف)

اشخاص کو دو مختلف موقعوں پر جوری کا رکن بنانے سے انکار کر دیا گیا اور ان مین سے ایک کی جج اور اس کے ایک مشیر نے سخت توہین بھی کی اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ انھون نے نہایت دیانتداری کے ساتھ یہ اعلان کر دیا تھا کہ ان کا کوئی مذہبی عقیدہ نہین ہے، ان کے علاوہ ایک اور شخص کے ساتھ جو کہین باہر کا رہنے والا تھا، انہی وجوہ کی بنا پر ایک چور کے مقابلہ مین انصاف کرنے سے انکار کر دیا گیا۔ دادرسی سے یہ انکار اس اصول قانون کی بنا پر تھا کہ کسی عدالت مین ایک ایسے شخص کو جو خدا پر (خواہ وہ کوئی خدا کیون نہو) اور عقبیٰ پر ایمان نہ رکھتا ہو، شہادت دینے کی اجازت نہین دیجا سکتی ہے جس کے یہ معنی ہین کہ ایسے اشخاص قانون اور عدالت کے تحفظ سے بالکل باہر ہین، اور جن کو نہ صرف یہی کہ جو چاہے انھین لوٹ لے یا ان پر حملہ کر بیٹھے اور اس کی کوئی بازپرس نہو اگر وہ خود یا انہی جیسی رائے رکھنے والے اشخاص موجود ہون، بلکہ ہر اُس شخص کو بلا خوف بازپرس لوٹا جاسکتا ہے، اور اس پر حملہ ہوسکتا ہے، اگر واقعہ کے ثبوت کا دارومدار ان کی شہادتون پر ہو۔ جس خیال پر اس استدلال کی بنیاد ہے، وہ یہ ہے کہ ایک ایسے شخص کی قسم کا کوئی اعتبار نہین جو عقبیٰ پر ایمان نہین رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسا دعویٰ ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے مدعیون کو تاریخ سے کوئی واقفیت نہیں (اسلیئے کہ یہ تاریخی حیثیت سے ثابت ہے کہ ہر زمانہ مین کفار اور منکرین کی ایک بڑی تعداد ایسے اشخاص کی رہی ہے جن مین بہت زیادہ صدق و دیانت تھی) اور یہ دعویٰ کوئی ایسا شخص ہرگز نہ کرے گا جسے ذرا بھی یہ احساس ہو کہ دنیا کے تمام ان بڑے بڑے لوگوں میں سے جو اپنی ذاتی خوبیون اور اپنے کمالات کی وجہ سے خاص شہرت رکھتے تھے، بہیترے ایسے تھے جو کم سے کم اپنے خاص

سلہ یہ شخص بیرن ڈی گلائشن تھا جسکے ساتھ مارلبورہ کی عدالت نے ۴ ہر اگست ۱۸۵۷ء کو یہ سلوک کیا تھا۔ (مصنف)

دوستون کے علم مین ضروریے دین رہے ہین۔ علاوہ اسکے یہ اصول خود اپنے لیئے ہلاکت کا باعث ہی، اور اپنی جڑ آپ سے کاٹے ڈالتا ہے اس گمان پر کہ ملحدین ہمیشہ جھوٹے ہوتے ہین، یہ اُصول تمام ایسے ملحدون کی شہادت تو قبول کرتا ہے جو جھوٹ بولنے پر آمادہ ہوتے ہین اور صرف ان کو مسترد کر دیتا ہی جو ایک متنازعہ فیہ عقیدہ کے علانیہ اظہار پر لوگون کے لعن وطعن کا ولیری سے مقابلہ کرنا پسند کرتے ہین، بجائے اسکے کہ وہ جھوٹ بولین۔ یہ قاعدہ جہان تک اسکی غرض کا تعلق ہی بالکل لغو ہے محض بطور ایک نفرت کی علامت یا تشدد کی یادگار کے برتا جاسکتا ہی۔ اور یہ تشدّد بھی ایسا جس کے برداشت کرنے کی شرط یہ ہوکہ نہایت واضح طور پر ثابت ہوجاے کہ یہ تشدد جائز نہین ہی۔ یہ قاعدہ اور وہ اُصول جو اس قاعدہ کے اندر کار فرما ہے، دو نو منکرین سے زیادہ معتقدین کیلیئے باعثِ ذلّت ہین۔ کیونکہ اگر وہ شخص جو آخرت کا قائل نہین، لازمًا جھوٹ بولتا ہے تو اسکا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ ایمان رکھتے ہین وہ اگر جھوٹ بولنے سے بچتے ہین تو محض دوزخ کے خوف سے ایسا کرتے ہین ہم یہ فرض کرکے اِس اُصول کے بنانے والون اور ان کے حامیون کو نقصان پہونچانا نہین چاہتے کہ انھون نے عیسوی محاسن کا جو تخیّل اپنے ذہن مین قایم کیا ہی، وہ خود ان کی اپنی فکر کا نتیجہ ہے۔

حقیقت یہ ہی کہ یہ تشدّد کی یادگار اور باقیات ہین اور انھین تشدّد کرنے کی خواہش کچھ چنداں محمول نہ کرنا چاہیئے جتنا کہ انھین انگریزون کی عام دماغی کمزوری کی ایک مثال سمجھنی چاہیئے یہ اسی کمزوری کا نتیجہ ہے کہ وہ ایک بُرے اُصول کے رواج دینے میں بیجا مسرّت کا اظہار کرتے ہین، حالانکہ وہ خود اِس قدر بُرے نہین ہوتے کہ اِس اصول کو واقعتہً عمل مین لانا چاہتے ہون۔ لیکن بد قسمتی سے عام ذہنیّت کا

لحاظ کرتے ہوئے اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہو کہ بدترین قانونی تشدّدات جو تقریباً ایک نسل سے موقوف ہیں، آیندہ بھی باقی نہ رہیں گے، اس زمانہ میں معمولات عام کی پُرسکون سطح میں گزشتہ برائیوں کے زندہ کرنے کی کوششوں سے اسی قدر خلل واقع ہوتا ہی جس قدر نئے فوائد کے رواج دینے سے۔ اس وقت جس احیائے مذہب پر فخر کیا جاتا ہی وہ تنگ نظر اور جاہل لوگوں میں ہمیشہ سے تعصّب کے اظہار کا مرادف رہا ہی اور جہاں لوگوں کے جذبات میں عدم رواداری کی ایک مضبوط اور مستقل تہ موجود ہو جو اس ملک کے متوسط طبقہ میں ہمیشہ سے رہی ہو وہاں ایسے لوگوں کے ان اشخاص پر آمادۂ تشدّد کرنے کیلئے بہت کم محرکات کی ضرورت ہے۔ جنھیں وہ ہمیشہ اپنے تشدد کے لیے بجا تختۂ مشق سمجھتے رہے ہیں[1]، کیونکہ یہی وہ حالت ہی

---

[1] کافی مواد مل سکتا ہی ان جذبات میں جن کا اظہار ۱۸۵۷ء کے سپاہیوں کی بغاوت کے موقع پر ظلم و تشدّد کرنیوالوں کی جانب سے ہوا اور عام طور سے ان افعال میں جو ہماری قومی سیرۃ کے سب سے بدنما حصّے ہیں، کلیسا کے مذہبی مجنونوں اور دینی اشخاص کے خیالات ممکن ہی قابل لحاظ نہوں لیکن ایونجیلیکل جماعت (عیسائیوں کی وہ جماعت جو چار دل انجیلوں کے مصدق ہونے پر ایمان رکھتی ہے) کے افسران اعلیٰ نے ہندو اور مسلمانوں کی حکومت کیلئے اپنی طرف سے اس اصول کا اعلان کیا ہی کہ کسی ایسے مدرسے کی امداد نہ کیجائے جس میں انجیل نہیں پڑھائی جاتی ہو، اور کوئی سرکاری ملازمت بجز ایسے اشخاص کے دوسروں کو ہرگز نہ دیجائے جو حقیقتاً یا بظاہر عیسائی نہو، ایک نائب وزیر ریاست کے متعلق بیان کیا جاتا ہو کہ انھوں نے ۱۲ نومبر ۱۸۵۷ء کو اپنی ایک تقریر میں فرمایا کہ "حکومت برطانیہ نے اُن کے مذہب کے ساتھ (وہ مذہب جو اکروڑ برطانوی رعایا کا مذہب ہی) جو تمامتر توہمات پر مبنی ہو اور جسے وہ مذہب کہتے ہیں، جو رواداری برتی ہو اس سے انگریزی نام کے اقتدار کو نہایت صدمہ اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کو بہت نقصان پہونچا ہے۔۔۔۔ رواداری بیشک اس ملک میں مذہبی آزادی کا سنگ بنیاد رہی ہے، لیکن رواداری کے اس اصول لفظ کو اس طرح خراب نہ کرنا چاہیئے جیسا کہ انھوں نے اسکا مفہوم سمجھا ہی" (بقیہ حاشیہ صفحۂ آیندہ پر)

یعنی وہ اِن لوگون کے متعلّق جو ان کے عقائد کو تسلیم نہین کرتے، ایسی رایون اور جذبات کا اظہار کرتے ہین جسکی وجہ سے اِس ملک مین ذہنی آزادی کی کوئی گنجائش باقی نہین ہی، ایک عرصہ دراز سے ان قانونی سزاون کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہی کہ ان سے جماعت مین بدنامی کے خیال کو اور تقویت پہونچتی ہی۔ یہی خیال ہی جو در اصل اِس درجہ قوی اور مستحکم ہے کہ ایسی رایون کا اظہار جنھین سوسائٹی برا سمجھتی ہی، انگلستان مین بہ نسبت دوسرے ممالک کے جہان ان کے اظہار سے کسی عدالتی سزا کا اندیشہ ہو بہت کم پایا جاتا ہی، بجز ان لوگون کے جن کو ان کے مالی حالات دوسرون کی رضا جوئی کا پابند نہین رکھتے ہین، باقی دوسرے لوگون کے لیے رائے عامّہ اس لحاظ سے قانون کا درجہ رکھتی ہی۔ ایسے لوگون کا روزی کمانے کے وسائل سے رُو کا جانا ایسا ہی ہی جیسا انھین قید کر دینا وہ لوگ جو رُوزی کی طرف سے بے فکر ہوتے ہین اور جنھین با اختیار اشخاص، جماعتون یا عام جمہور کی نظر عنایت حاصل کرنے کی خواہش نہین ہوتی، انھین اپنی رائے کے علانیہ اظہار مین سوائے اِس کے خوف کی اور کوئی وجہ نہین ہوتی کہ انھین بعض لوگ برا سمجھین گے یا برا کہین گے اور اسے گوارا کرنے کے لیے کسی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) وہ یہ کہ سب کو پوری آزادی ہونی چاہیئے عیسائیون مین جو ایک ہی طریقہ پر عبادت کرتے ہین، عبادت کرنے کی آزادی ہونی چاہیئے۔ اِس کا مطلب یہ ہے کہ ان عیسائیون کے تمام فرقون اور گروہون کے ساتھ رواداری برتی جائے جو ایک ہی ذریعۂ نجات کے قائل ہین؟ مین محض اِس امر کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہون کہ ایک شخص کا خیال جو آزاد خیال وزارت کے عہد مین حکومت کے ایک ایسے جلیل القدر عہدہ پر سرفراز کیا گیا ہے، یہ ہو کہ جو لوگ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے قائل نہون وہ رواداری کے دایرہ سے خارج ہین۔ اِس بز دلانہ اظہار خیال کے بعد کون شخص ہی جو کہہ سکتا ہی کہ مذہبی تشدد کا دور گذر چکا ہی اور اب وہ پھر کبھی واپس نہیں آئیگا۔ (مصنف)

خاص قوت و بہادری کی ضرورت نہین ہی، ایسے اشخاص کی طرف سے کسی اپیل کی گنجایش نہین ہی، لیکن اگرچہ آجکل ہم ان لوگون کے ساتھ جو ہم سے اختلاف رائے رکھتے ہین، اسقدر برا سلوک نہین کرتے جتنا ہم پہلے ان کے ساتھ کیا کرتے تھے، لیکن اِن کے ساتھ جو طرزعمل ہمارا ہوتا ہے اُس سے ہم خود اپنا نقصان اسیقدر کرتے ہین، سقراط کو پھانسی دیدیگئی لیکن فلسفۂ سقراط آفتاب بنکر چمکا اور اپنے نور سے اِس نے تمام ذہنی فضا کو منور کر دیا۔ عیسائیون کو درندون کے آگے ڈالا گیا، لیکن عیسائی کلیسا ایک شاندار اور وسیع درخت کی طرح ایسا بڑھا جس کے آگے تمام پرانے اور کمزور پودے دب گئے اور اسکی چھاؤن تلے نشو ونما نہ پاسکے۔ ہم اپنی محض جماعت کی عدم رواداری سے کسی کو جان سے مار نہین ڈالتے اور نہ خیالات کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ دیتے ہین، بلکہ اِس سے ہم لوگون کو اِس بات پر مائل کرتے ہین کہ وہ مکر وریا سے کام لین یا ان خیالات کی اشاعت مین کوئی سعی و کوشش نہ کرین، ہمارے زمانہ مین ملحدانہ خیالات ہر نسل اور ہر دسوین سالمین نہ بہت زیادہ ترقی کرتے ہین اور نہ تنزل کرتے ہین۔ اِن کے شعلے بھڑک کر دور دراز حصّون تک نہین پہونچتے بلکہ وہ صاحب فکر اور اہل علم اشخاص کے ان محدود دایرون مین جن مین وہ پیدا ہوئے، برابر سلگتے رہتے ہین اور لوگون کے عام معاملات کو سچی یا پُر فریب روشنی سے کبھی روشن نہین کرتے۔ اور اس طرح ایک ایسی حالت پیدا ہو جاتی ہی جو بعض لوگون کو بہت پسند ہوتی ہے، اسلئے کہ جرمانہ یا قید کی سزا کا ناخوشگوار طریقہ بغیر عمل مین لائے ہوے تمام مروجہ خیالات بہ ظاہر جون کے تون قایم رہتے ہین اور ان مخالفین کو جو خاص مرض غور و فکر مین مبتلا ہین، اپنی عقل سے کام لینے کی کوئی ممانعت نہیں ہوتی، ذہنی دنیا مین امن قایم رکھنے کی یہ ایک نہایت سہل تدبیر ہے اور اِس سے تمام معاملات بدستور قایم رہتے ہین، لیکن اِس قسم کی ذہنی تسخیر مین جو نقصان اُٹھانا پڑتا ہے

اسمیں دماغ انسانی کی تمام جرأت اخلاقی قربان ہوجاتی ہے۔ یہ ایک ایسی حالت ہوتی ہے
جس مین اکثر تیز اور متلاشی دماغون کو مناسب یہ بات معلوم ہوتی ہی کہ وہ اپنے اعتقادات
کے عام اصول و وجوہ کو اپنے سینہ کے اندر رکھین اور حتی الامکان خاص اپنے نتائج کو ان
مقدمات سے مطابقت دینے کی کوشش کرین جنھین وہ اپنے دلون کے اندر ترک کر چکے ہین۔
نتیجہ یہ ہوتا ہی کہ اس سے کبھی آزاد و بیباکانہ سیرت اور صحیح و منطقی دماغ کے اشخاص پیدا
نہین ہوتے جو کبھی دنیائے فکر کیلئے زیب و زینت ہوتے تھے ۔ ان حالات مین جس قسم کے لوگ
مل سکتے ہین وہ یا تو محض عام معمولی باتون کے زبان سے قائل ہوتے ہین یا زمانہ ساز حق
پرست ہوتے ہین جن کے دلائل تمام بڑے بڑے مسائل پر صرف سامعین کی غرض سے ہوتے ہین
اور نہ ایسے کہ جنھون نے خود انھین قایل کر دیا ہو۔ جو لوگ ایسا کرنا نہین چاہتے، وہ اپنے خیالات
اور مشاغل کو صرف ان چیزون تک محدود کر لیتے ہین جن پر گفتگو اصول کے حدود کے اندر بغیر
گئے ہوے کی جا سکتی ہے، یعنی وہ چھوٹے چھوٹے عملی مسائل جو خود بخود ایک دن طے ہو جائینگے،
اگر لوگوں کے دماغون مین قوت اور وسعت ہوگی اور جبتک یہ نہ ہوگا کبھی درست نہ ہونگے
لیکن وہ شئے جس سے لوگون کے دماغون مین قوت اور وسعت پیدا ہوگی یعنی بڑے بڑے
مسائل پر نہایت آزادی اور جرأت کے ساتھ غور و بحث کرنے کی عادت، اسے لوگ
ترک کر بیٹھتے ہیں۔

جن لوگون کا یہ خیال ہی کہ مخالفین مذہب کی اظہار رائے مین یہ روک نہین ہے،
انھین سب سے پہلے سوچنا چاہیئے کہ اس کی وجہ سے ملحدانہ خیالات پر آزادی کے ساتھ
اور پورے طور پر کبھی کوئی مباحثہ نہین ہو سکتا اور ان مین سے ایسے خیالات جو مباحثہ کے
مقابلہ مین ٹھر نہین سکتے، ان کی اشاعت اگر رک بھی جائے، پھر بھی وہ سرے سے غائب

نہین ہوتے۔ لیکن ایسی تحقیق و تفتیش کو رد کردینے سے جس کا انجام مسلمہ نتائج کی شکل مین نہو، یہ صرف ملاحدہ ہی نہین ہین جن کو ملنے پر سب سے زیادہ ناگوار اثر پڑتا ہو بلکہ سب سے بڑا نقصان تو ان لوگون کو پہونچتا ہی جو ملحد نہین ہین اور جن کی تمام دماغی نشو و نما الحاد کے خوف سے رُک جاتی اور عقل دبکر رہ جاتی ہی۔ اس نقصان کا کون اندازہ کر سکتا ہی جو دنیا کو ہونہار لیکن بزدل اہل فکر کی انبوہ سے پہنچتا ہے جنھین اتنی جرات نہین ہوتی کہ وہ ایسے خیالات پر دلیری و آزادی سے غور کرکے مضبوطی کے ساتھ ان پر قایم رہین، صرف اس ڈر سے کہ کہین انھین بے دین اور بد اخلاق نہ سمجھا جائے۔ ما نہی مین کبھی کبھی کوئی ایسا صاحب دیانت اور ذی عقل بھی ہوتا ہی جو ایک ایسے ذہن کو قائل کرنے مین جسے وہ مطمئن نہین کر سکتا، ایک عمر صرف کر دیتا ہی اور اپنے دل و دماغ کے محرکات کو عام مسلمہ عقائد سے مطابقت دینے کی کوشش مین اپنی ذہانت کے تمام ذرائع ختم کر ڈالتا ہی اور پھر بھی شاید آخر تک بھی اس مین کامیاب نہین ہوتا۔ کوئی شخص بہت بڑا صاحب فکر اس وقت تک نہین ہوسکتا جبتک کہ وہ یہ نہ تسلیم کرے کہ بحیثیت ایک صاحب فکر ہونے کے اس کا سب سے پہلا فرض یہ ہی کہ وہ اپنی عقل کی ان حدود تک اتباع کرے جہانتک کہ وہ اسے لیجاتی ہی حق کو ایک ایسے شخص کی غلطیون سے جو ضروری مطالعہ اور تیاری کے ساتھ خود غور و فکر کرتا ہی، زیادہ نفع پہونچتا ہی، بہ نسبت ان لوگون کے صحیح خیالات کے جو ان پر صرف اس وجہ سے عقیدہ رکھتے ہین کہ وہ ان پر غور و فکر کرنا گوارا نہین کرتے۔ یہی نہین کہ بڑے بڑے صاحب فکر بنانے کے لیئے ہی آزادی فکر کی ضرورت ہے بلکہ برعکس اس کے یہ عام انسانون کیلیئے بھی اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ ضروری ہے تا کہ جہانتک ان مین صلاحیت ہو وہ دماغی نشو و نما حاصل کر سکین۔ ذہنی غلامی کی عام فضا مین اکثر

بڑے بڑے صاحبِ فکر افراد ہوئے ہین اور ممکن ہے آیندہ بھی ہون لیکن اِس فضا مین نہ کبھی پیدا ہوا ہے اور نہ آیندہ ہوگا کہ عام طور سے صاحبِ دماغ و فکر لوگ پیدا ہون۔ جہان لوگ کسی حد تک اِس دلیرانہ سیرت کے ہوئے بھی ہین وہان اس کی وجہ یہ تھی کہ ملحدانہ خیالات کا خوف کچھ عرصہ کے لیے مفقود ہو گیا تھا۔ جہان پر یہ دستور ہو کہ اُصول پر کوئی بحث نہین ہوسکتی، جہان ایسے بڑے بڑے مسائل پر مباحثے جن کا اثر عام نبی نوع انسان پر پڑتا ہو روک دیئے جانے مناسب سمجھے جائین، وہان ہم ذہنی ترقی کی اِس بلند سطح کے دیکھنے کی کبھی توقع نہین کرسکتے جس نے تاریخ کے بعض زمانون کو اِس درجہ مشہور و معروف کیا ہے۔ جب کبھی ایسے مسائل پر مباحثے سے احتراز کیا گیا جن سے لوگون مین ایک جوش و خروش پیدا ہوتا، تو اس وقت لوگون کے دماغون مین نہ ایک ذرّہ برابر جنبش ہی پیدا ہوئی اور نہ کوئی ایسی ترغیب ہوئی جس نے معمولی سے معمولی دماغ کے آدمیون کو بھی بڑے سے بڑا صاحبِ غور و فکر بنا دیا ہو۔ اِس امر کی ایک مثال ہمین یورپ کی تاریخ مین تحریکِ اِصلاح کے بعد کے زمانہ مین ملتی ہے، دوسری مثال جو صرف براعظم یورپ کے اعلیٰ طبقہ ہی تک محدود ہے، اس فلسفیانہ تحریک مین ملتی ہے جو اٹھارھوین صدی کے آخر نصف مین شروع ہوئی۔ ایک تیسری مثال جو اِس سے بھی کم عرصہ تک قایم رہی، جرمنی کے اِس ذہنی انقلاب مین ملتی ہے جو گوئٹے اور فشٹے کے زمانہ مین پیدا ہوا۔ یہ تینون دوران خیالات کے اعتبار سے باہم مختلف ہین جن کی ان مین نشو و نما ہوئی لیکن اِس حیثیت سے یکسان ہین کہ اِن تینون مین غلبہ و اقتدار کا جوا اُتار پھینکا گیا ان مین سے ہر ایک زمانہ مین ذہنی غلامی کی لعنت کو دور کیا گیا اور اس کی بجائے کوئی دوسری ذہنی غلامی نہین لی گئی ہے۔ اِن ہر سہ زمانون مین جو حرکت پیدا ہوئی اسی نے یورپ کو وہ کچھ بنایا جو آج وہ ہے۔ ہر ایک ترقی جو خواہ

لوگون کے دماغون مین ہوئی ہے یا ان کے ادارون مین، وہ ان مین سے کسی نہ کسی زمانہ کی مرہون منت ہے۔ کچھ عرصہ سے حالات یہ بتا رہے ہین کہ ان ہر سہ تحریکات کا اثر اب تقریبًا ختم ہو چلا ہے اور جب تک کہ ہم اپنی ذہنی آزادی کو پھر قایم کرین اسوقت تک ہمین کسی نئی حرکت کی توقع نہ رکھنی چاہیئے۔

آیئے اب اپنے استدلال کے دوسرے حصّہ کو لین اور اس خیال کو نظر انداز کر کے کہ مسلمہ رائین غلط بھی ہو سکتی ہین، ہم یہ فرض کر لین کہ وہ بالکل صحیح ہوتی ہین۔ لیکن جب ان کی صحت کی آزادی کے ساتھ اور علانیہ کوئی تحقیق و تفتیش نہین کیجاتی تو ایسی صورت مین ان کے تسلیم کیئے جانے کی جو غالب شکل ہے، اس کی قیمت و قدر کی جانچ کرین۔ ایک شخص جو نہایت مضبوطی کے ساتھ ایک رائے پر قائم ہو وہ اِس کے غلط ہونے کے امکان کو خواہ کتنی ہی مشکل سے کیون نہ تسلیم کرے لیکن اسکو یہ بات ضرور ماننی چاہیئے کہ خواہ وہ خیال کتنا ہی صحیح خیال کیون نہو، اگر اس پر پورے طور سے اور آزادی و بیباکی کے ساتھ بحث و مباحثہ نہین ہوا ہے، تو وہ خیال ایک زندہ حقیقت کی بجائے ایک مردہ عقیدہ سمجھا جائیگا۔

ایک طبقہ ایسا ہے (خوش قسمتی سے اِس کے افراد کی تعداد اب اتنی نہین ہے جتنی پہلے تھی) جو اِس بات کو کافی سمجھتا ہے کہ ہر شخص کو بلا شک و شبہہ اِن باتون کو تسلیم کر لینا چاہیئے جنھین وہ صحیح سمجھتے ہین، اگرچہ اس شخص کو اس خیال کے دلائل کا کچھ بھی علم نہو اور وہ معمولی سے معمولی اعتراضات کا مقابلہ بھی نہ کر سکتا ہو، ایسے لوگ اگر وہ ایک مرتبہ اپنے عقائد کی تعلیم کسی با اختیار جماعت کے ذریعہ پھیلا لیتے ہین تو قدرتًا یہ سمجھنے لگتے ہین کہ ان پر نکتہ چینی کی اجازت دینے سے کوئی فائدہ نہوگا بلکہ اولٹا اور نقصان ہی ہوگا۔ جہان ان کا اثر غالب ہوتا ہے وہان تقریبًا اِس بات کو ناممکن بنا دیتے ہین کہ اِن مسلّمہ خیالات کو کافی غور و بحث کے بعد

مسترد کیا جاسکے اگرچہ اس کا امکان رہتا ہے کہ جہالت و ناواقفیت اور غصہ اور بے تکے پن سے انہیں ٹھکرا دیا جائے، اسلئے کہ بحث و مباحثہ کا دروازہ قطعی طور پر بند کر دینا تو مشکل ہی سے ممکن ہوتا ہے اور جہاں اس کا کچھ بھی موقع ملجاتا ہے وہاں وہ عقائد جن کی بنا یقین کامل پر نہیں ہوتی، عموماً دلائل کے محض ادنی اشارہ پر پارہ پارہ ہو جاتے ہیں اس امکان سے قطع نظر اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ صحیح خیالات دماغ میں قایم رہتے ہیں تو پھر وہ بہ منزلہ تعصبات کے ہوتے ہیں جنھیں دلائل سے نہ کوئی تعلق نہ دلائل کا اثر پھر بھی کسی عقل رکھنے والے شخص کے لیئے تو حق کے تسلیم کرنے کا یہ طریقہ کبھی نہیں ہو سکتا اسے حقیقت کا جاننا نہیں کہتے۔ اس طرح جو حقیقت تسلیم کیجاتی ہے وہ ایک طرح کا وہم ہوتا ہے جس کو اتفاق سے ایسے الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا ہے جنسے حقیقت کا اظہار ہوتا ہی۔

اگر انسان کی قوت ذہنی و قوت فیصلہ کو ترقی دینا ہو جس سے کم از کم پرستاری مذہب والے بھی انکار نہیں کرتے تو ان قوا کا محل استعمال بھلا ان سے زیادہ اور کن چیزوں سے ہو سکتا ہے جو اس درجہ اہم ہیں کہ ان پر اعتقاد رکھنا انسان کے لیئے ضروری ہے۔ اور عقل و فہم کو ترقی دینے کا کسی چیز پر سب سے زیادہ دار و مدار ہے تو وہ یقیناً اس پر ہی کہ خود اپنے عقاید کے دلائل و براہین پر غور کیا جائے۔ لوگوں کے عقائد ایسے مسائل پر خواہ کچھ بھی ہوں جن پر صحیح اعتقاد رکھنا سب سے ضروری اور مقدم ہے۔ تاہم اس قابل ضرور ہونا چاہیئے کہ وہ کم سے کم عام اعتراضات کا تو جواب دے سکیں۔ لیکن ایک شخص کہہ سکتا ہے کہ انھیں ان کے عقائد کے دلائل و براہین بھی سکھا دینے چاہیئیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ چونکہ وہ اپنے عقائد پر کبھی بحث و مباحثہ ہوتے ہوئے نہیں سنتے ہیں، اسلئے انھیں وہ عقائد طوطے کی طرح رٹا دیئیے گئے ہیں۔ جو لوگ علم الہندسہ (جیومیٹری) پڑھتے ہیں، وہ

صرف اِن کے دعووں کو زبانی نہین یاد کرلیتے بلکہ وہ اِن کے ثبوت کو بھی پڑھتے اور یاد کرتے ہین اور یہ کہنا بالکل لغو ہے کہ چونکہ وہ کسی شخص کو اِس ثبوت سے انکار کرتے ہوئے یا انھین غلط ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نہین سنتے، اسلیئے وہ علم الہندسہ کے حقائق کے دلائل و براہین سے بالکل ناواقف رہتے ہین، اِس مین کوئی شبہہ نہین۔ لیکن اس قِسم کی تعلیم ریاضی جیسے مضمون کیلیئے ممکن ہے جہان کسی مسئلہ کی مخالفت مین کچھ کہنے کی گنجائش ہی نہین ہے۔ ریاضی کے مسلّمات کا ثبوت دینے مین ایک عجیب بات یہ ہے کہ وہان تمام دلائل ایک ہی طرف ہوتے ہین، اِن پر کوئی اعتراضات نہین ہوسکتے اور نہ اِن اعتراضات کا کوئی جواب ہی، لیکن ہر ایسے مسئلہ پر جہان اختلاف رائے کا امکان ہے حقیقت دراصل ان دو متضاد دلائل کے فرق پر مبنی ہوتی ہے۔ فلسفۂ فطرت تک مین ایک ہی واقعات کی مختلف تشریحین ہوسکتی ہین۔ کہین آفتاب کو نظام شمسی کا مرکز ماننے کی بجائے زمین کو تسلیم کیا جاتا ہے، بعض وقت بڑھنے گھٹنے والی اشیار مین آگ تسلیم کرنے کی بجائے آکسیجن مانی جاتی ہے اور اس کو بتانا پڑتا ہے کہ دوسرا نظریہ کیون صحیح ہے اور جب تک کہ یہ نہ بتایا جائے اور ہم یہ نہ معلوم کرلین کہ یہ کیونکر بتایا جاتا ہے، ہم اپنے خیال کے تمام دلائل کو نہین سمجھ سکتے۔ لیکن جب ہم ایسے معالات کو لیتے ہین جو بہت زیادہ پیچیدہ ہوتے ہین، مثلاً اخلاق، مذہب، سیاسیات، سیاست مدن، معاشرتی تعلقات اور کاروبار زندگی، تو ہر متنازعہ فیہ رائے کے تین چوتھائی دلائل اس کے مخالف خیال کے رد کرنے مین صرف ہوتے ہین۔ ایک کو چھوڑ کر قدیم زمانہ کے سب سے بڑے مقرر کا قول ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے مخالف کے مقدمہ پر اگر اپنے سے زیادہ نہین تو کم از کم اپنے برابر ضرور غور و فکر کرلیتا تھا۔ ضرورت ہے کہ جو کچھ سسرو[1]

[1] اس کا پورا نام مارکس تولیس سسرو ہے۔ یہ روم کا ایک بہت بڑا فصیح البیان مقرر اور نکتہ دان (بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ پر)

اپنی عدالتی کامیابی حاصل کرنے کے لئے کیا کرتا تھا، وہی آج وہ سب لوگ کرین جو کسی رائے اور خیال کا مطالعہ اس غرض سے کرنا چاہتے ہین کہ کسی حقیقت پر پہونچین۔ جو شخص کسی معاملہ کے صِرف موافق پہلو سے واقف ہو، وہ اس معاملہ کے متعلق بہت کم جانتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس کے اپنے دلائل مضبوط ہون اور کوئی شخص انھین رد نہ کر سکے، لیکن اگر وہ اسی کے ساتھ فریق مخالف کے دلائل کو رد کرنے کے قابل نہین ہے، اگر وہ ان سے اتنا بھی واقف نہین کہ وہ دلائل کیا ہین تو اُسے کسی خیال کو اپنے لیے اختیار کرنے کا حق نہین ہے۔ اِس کے لیے سب سے معقول صورت یہ ہے کہ وہ اپنے فیصلہ کو معلّق و ملتوی رکھے اور اگر وہ ایسا نہ کرے گا تو وہ یا تو کسی صاحب اختیار قوت وجماعت کا ہو کے رہے گا یا دنیا کے عام لوگون کی طرح اس پہلو کو اختیار کر لے گا جس طرف اس کا میلان سب سے زیادہ ہوگا۔ اور صِرف یہ کافی نہین ہے کہ وہ مخالفین کی رائے خود اپنے اساتذہ کی زبان سے جس طرح وہ اسے بیان کرین اور اس کے ساتھ جو ردّ وہ اس کا پیش کرین سنے،

(بقیہ حاشیہ صفحۂ گزشتہ) مدبر گزرا ہے جو ۱۰۶ ق م مین روم کے ایک گاؤن مین پیدا ہوا۔ اسکا ابتدائی زمانہ کچھ تو اپنے خاص وطن مین اور کچھ شہر روم مین گزرا۔ یہ ابتدا ہی سے لکھنے پڑھنے کا شائق تھا لیکن اسکی زندگی کا اصل زمانہ اسکی عمر کے پچیسوین (۲۵) سال سے شروع ہوتا ہے جبکہ اسنے ایک مشہور تقریر کی تھی جسمین قانون کی بڑی بڑی باریکیان بیان کی تھین اِسنے اپنے اِس زور بیان سے کام لیکر دو ایک اشخاص کی وکالت بھی کی تھی جسمین اسے خاصی شہرت حاصل ہوئی اسکے علاوہ ۷۰ ق م مین اسنے سسلی کے ایک گورنر پر استغاثہ دایر کیا جسمین اسنے اپنی قوت بیان سے کام لیکر خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ دوسرے سال اسنے ایک شخص کیطرف سے وکالت کی اور انھی دلائل وبراہین سے کام لیا جو اسکے حریف کی موافقت مین پیش کیجا سکتی تھین اسنے روم کی مجلس مین مختلف مواقع پر بہت سی پُر زور تقریرین بھی کی تھین، ان واقعات نے سسرو کی زور بیانی اور منطقیانہ استدلال کا پورا سکہ ملک مین بٹھا دیا تھا۔

دلائل کے ساتھ انصاف برتنے یا ان پر صحیح معنون مین غور و فکر کرنے کا یہ طریقہ نہین ہے اُسے چاہیئے کہ وہ ان خیالات کو ان لوگون کی زبانی سنے جو ان پر پورا عقیدہ رکھتے ہین ان کی نہایت سرگرمی کے ساتھ حمایت کرتے ہین اور ان کے لیئے جو کچھ ان سے بن پڑتا ہی کرتے ہین۔ اسے ان خیالات کو بہتر سے بہتر اور خوشگوار سے خوشگوار شکل مین جاننا چاہئے اُسے چاہیئے کہ وہ ان پوری دشواریون کو محسوس کرے جس سے کسی مسئلہ کے صحیح نقطۂ خیال کو مقابلہ کرنا پڑتا ہے، ورنہ اُسے دراصل حقیقت کا وہ جزو کبھی نہ میسر آئیگا جسے مشکلات سے سابقہ پڑتا ہے۔ سو مین سے کم ازکم ننانوے تعلیمیافتہ ایسے ہین جن کی بشتیر یہی حالت ہے، نیز وہ بھی کچھ ان سے کم نہین جو اپنے خیالات کی وکالت نہایت طرّاری سے کرسکتے ہین۔ ممکن ہی وہ جن نتائج پر پہونچے ہین وہ صحیح ہون لیکن جن معلومات کی بنا پر انھون نے ایسا کیا ہے وہ بہت ممکن ہے کہ غلط ہو۔ انھون نے اپنے کو ان لوگون کی ذہنی حالت مین کبھی نہین رکھا ہے جو ان سے اختلاف رائے رکھتے ہین اور نہ انھون نے کبھی اسپر غور کیا ہے کہ ایسے لوگون کے خیالات کیا ہین، چنانچہ وہ صحیح معنون مین خود اِس عقیدہ سے واقف نہیں ہیں۔ جن کا وہ اپنی زبان سے اعتراف کرتے ہین، وہ اس عقیدہ کے ان حصون سے بالکل ناواقف ہوتے ہین جن سے باقی حصّے کی مزید تشریح اور وضاحت ہوتی ہے، وہ اِن باتون سے بھی ناواقف ہوتے ہین جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایک بات جو دوسرے سے بظاہر مخالف معلوم ہوتی ہے، اس سے اِس کا تطابق بھی ہوسکتا ہے، یا یہ کہ دو سلسلۂ استدلالات مین سے جو بظاہر دیکھنے مین بہت مضبوط نظر آتے ہین، ان مین سے ایک کی بجائے دوسرے کو کیون ترجیح دینی چاہیئے۔ حقیقت کے اِس تمام پہلو سے جس سے کبھی پلّہ جھک جاتا ہے اور ایک پورے واقف کار شخص کے فیصلہ کو بدل دیتا ہے، وہ اس سے ناواقف محض رہتے ہین

اور انھین اِس کا کبھی علم نہین ہوتا لیکن وہ لوگ کہ جنھون نے دونو پہلوؤن کو غیر جانبدارانہ اور مساویانہ طور پر تول لیا ہے اور دونو فریق کے دلائل کو بہتر سے بہتر روشنی مین دیکھنے کی کوشش کرلی ہے، وہ اِس سے واقف ہوتے ہین۔ اخلاق اور انسان سے تعلق رکھنے والے تمام مسائل کے حقیقی طور پر سمجھنے کے لیئے یہ طریقہ اسقدر ضروری ہے کہ اگر تمام بڑے بڑے حقائق کے مخالفین موجود نہون، تاہم ان کو اپنے ذہن مین تصور کر لینا اور ان کی طرف سے قوی سے قوی دلائل کا پیش کرنا جو بڑے سے بڑا "وکیل شیطان" سوچ سکتا ہی، ضروری ہے۔

اِن دلائل کے زور کو کم کرنے کے لیئے آزادی مباحثہ کا ایک مخالف کہہ سکتا ہی کہ یہ کوئی ضروری نہین ہی کہ عام لوگ بھی ان تمام باتون کو جانین اور سمجھین جو فلاسفہ اور علمائے دین ان کے خیالات کی موافقت یا مخالفت مین کہین۔ عام لوگون کے لیئے یہ ضروری نہین ہے کہ وہ اِس قابل ہون کہ ایک ذہین مخالف شخص کے مغالطون اور غلط بیانیون کو آشکارا کرسکین۔ ان کے لیئے یہ کافی ہے کہ ان کی طرف سے کوئی شخص جواب دیدیا کرے تاکہ جن باتون سے بے خبر اور بے علم لوگون کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہو ان کی تردید ہوجایا کرے۔ ان سیدھے سادے لوگون کو جنھین ان حقائق کے صرف موٹے موٹے دلایل بتادیئے گئے ہون، باقی کے لیئے صاحب اختیار جماعت پر اعتماد رکھنا چاہیئے اور انھین یہ سمجھنا چاہئیے کہ وہ ہر اس مشکل کے لیئے جو پیدا کی جاسکتی ہی نہ اسقدر علم رکھتے ہین اور نہ دماغ۔ اور یہ اطمینان رکھنا چاہیئے کہ تمام مشکلات جو ابتک پیدا کی گئی ہین، ان کا حل یا تو ان لوگون نے کرلیا ہے یا وہ کرسکتے ہین جو اِس کام کے لیئے خاص طور پر مشق اور مہارت رکھتے ہین۔

جو لوگ یہ خیال کرتے ہین کہ حقیقت کا صرف اسی قدر سمجھنا جس سے اس کا یقین آجائے کافی ہے، ان کے اِس خیال کو تسلیم کرتے ہوئے بھی آزادی مباحثہ کی دلیل مین کسی طرح ضعف نہین آتا، کیونکہ اِس نظریہ سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ لوگون کو اس امر کا پورا یقین ہونا چاہیے کہ تمام اعتراضات کا نہایت کافی وشافی جواب دیا جاچکا ہے اور ان کے اعتراضات کا جواب اس وقت تک کیسے دیا جاسکتا ہے جب تک وہ خیالات ظاہر نہ کیئے جائین؟ یا وہ جواب کیونکر شافی سمجھا جاسکتا ہے جبتک کہ معترضین کو اسکے ناکافی ہونے کے اظہار کا موقع نہ ملے؟ اگر عام لوگ نہین تو کم سے کم فلاسفہ اور علمائے دین کو جنھین ان مشکلات کو حل کرنا ہے، ان سے پوری واقفیت ہونی چاہئیے اور یہ اسوقت تک نہین ہوسکتا جبتک کہ ان کا نہایت آزادی کے ساتھ اظہار نہ کیا جائے اور وہ پوری روشنی مین نہ لائے جائین، کاتولیکی کلیسا مین اِس دقّت طلب مسٔلہ کے حل کا اپنا خاص طریقہ ہے، اس کے ہان دو الگ الگ جماعتین ہین، ایک وہ جنھین اسکے عقائد کو سوچ سمجھکر ماننے کی اجازت ہے اور دوسرے وہ لوگ جنھین اِن عقائد کو دوسرون کے اعتماد پر ماننا پڑتا ہے اس مین شبہہ نہین کہ ان دونون مین سے کسی کو یہ طے کرنے کا اختیار نہین ہے کہ انھین کن کن باتون پر ایمان لانا چاہیئے اور کن کن باتون پر نہین لیکن پادریون کو کم سے کم اِس بنا پر کہ ایک جماعت کے معتمد ہوتے ہین، یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ نہایت اچھی طرح سے اپنے مخالفین کے دلائل سے واقفیت حاصل کرین تاکہ وہ ان کا جواب دےسکین اور اس لیئے وہ ملحدانہ کتابین پڑھ سکتے ہین، لیکن عام لوگون کے لیئے تاوقتیکہ خاص اجازت نہو یہ ممکن نہین۔ اِس قاعدہ سے کم سے کم یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مخالف کے دعاوی و دلائل کا جاننا علما اور واعظین

کے لئے مفید ہے، لیکن اِسی کے ساتھ یہ بھی ہے کہ باقی لوگون کو اسے نہ جاننا چاہیئے، گویا اس طرح سے عام لوگون کی بہ نسبت صرف ایک منتخب جماعت کو ذہنی نشوونما کا زیادہ موقع دیا جاتا ہے، اگرچہ ذہنی آزادی پھر بھی نہین ملتی۔ اس ترکیب سے یہ فرقہ اپنے اغراض کے حسب منشا ایک طرح کا دماغی تفوق حاصل کرلیتا ہے جس کی اسے اپنے مقاصد کیلئے ضرورت ہوتی ہے، اسلیئے کہ تعلیم و تربیت بغیر آزادی کے اگرچہ دماغ میں وسعت اور فراخی نہین پیدا کرسکتی، لیکن یہ ایک شخص کو کسی مسئلہ کا نہایت پختہ اور چالاک وکیل ضرور بنا سکتی ہے، لیکن جن ملکون مین پروٹسٹانی مذہب رائج ہے وہان یہ صورت نہین۔ اسلیئے کہ ان کا کم سے کم بطور نظریہ یہی ہی، یہ اعتقاد ہے کہ مذہب کے انتخاب کی ذمہ داری ہر شخص کی اپنے سر ہونی چاہیئے اور یہ علما اور واعظین کے سر نہین ڈالی جاسکتی۔ علاوہ اس کے بحالات موجودہ یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ جو تحریرین تعلیم یافتہ لوگون کی نظرون سے گزرتی ہین وہ غیر تعلیم یافتہ لوگون کی نظرون سے مخفی رکھی جائین۔ اگر علما اور واعظین تمام اِن باتون سے واقف ہوسکتے ہین جو انھین جاننی چاہئین تو پھر ہر چیز کے تحریر و اشاعت کی بلا روک ٹوک عام اجازت ہونی چاہیئے۔

دنیا کے تمام اخلاقی اُصولون اور مذہبی عقائد کی سرگزشت اس کی شاہد ہے۔ جن لوگون نے اِن اصول و عقاید کو پیش کیا اور جو ان کے قریبی شاگرد تھے، ان کے لیئے وہ عقائد اور اصول معنی و زندگی سے معمور ہوتے ہین۔ ان کے معنی ہین اس وقت تک وہی زور و قوت باقی رہتا ہے بلکہ اور بھی زیادہ قوت پیدا ہوجاتی ہے جبتک کہ دوسرے عقائد پر فوقیت حاصل کرنے کی کشمکش باقی رہتی ہے یا آخر وہ عقیدہ یا تو سب پر غالب آجاتا ہے اور عام عقیدہ بنجاتا ہے یا اس کی ترقی بالکل

رُک جاتی ہے، یہ جس حد تک پہونچ چکا ہے، اُس کو باقی رکھتا ہے، لیکن اس کی آیندہ رفتار بالکل رُک جاتی ہے۔ جب اِن دونوں سے کوئی حالت بھی نمایاں طور پر ظاہر ہو جاتی ہے، اُس وقت اِس مسئلہ پر بحث و مباحثہ بھی رُک جاتا ہوا اور رفتہ رفتہ بالکل ختم ہو جاتا ہے۔ وہ عقیدہ اگرچہ ایک مسلمہ عام رائے کی حیثیت سے نہین، تاہم ایک فرقہ یا جماعت کے مسلمہ اعتقاد کے اعتبار سے قایم ہو جاتا ہے، جو لوگ اسکے ماننے والے ہوتے ہین، وہ اسکو بحث و مُباحثہ کے بعد قبول نہین کرتے بلکہ عام طور سے وہ انھین وراثتہً ملتا ہے اور تبدیل مذہب کا خیال جو اب شاذ و نادر ہی ہوتا ہے، اس کے پیرؤون کے دلون مین بہت کم آتا ہے پہلے کی طرح وہ تمام دنیا کے خلاف مدافعت کرنے یا تمام دنیا کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کیلئے آمادہ و مستعد رہنے کی بجائے اب بالکل بے دست و پا اور اپاہج ہو جاتے ہین اور اگر ممکن ہوتا ہے تو نہ وہ اپنے عقیدہ کے خلاف دلائل کو سنتے ہین اور نہ مخالفین کو (اگر کچھ ہوے) اپنے دلائل پیش کرنے دیتے ہین۔ اس تاریخ سے عموماً اِس عقیدہ کی قوت مین زوال آنا شروع ہوتا ہے، ہم اکثر مذاہب کے علما اور واعظین کو یہ شکایت کرتے ہوئے سنتے ہین، کہ لوگون کے دلون مین اب مذہب کا ایک زندہ تخیل قایم رکھنا دشوار ہو گیا ہے اور لوگ مذہب کو اب برائے نام مانتے ہین اور وہ حالت نہین رہی ہے کہ یہ لوگون کے دلون مین گھر کرے اور ان کے اخلاق و عادات پر پورا قبضہ رکھے جس وقت تک مذہب اپنے وجود کو باقی رکھنے کی کشمکش مین مبتلا تھا، اسوقت تک اِس قسم کی کوئی شکایت سننے مین نہین آتی تھی۔ اس وقت اس مذہب کے کمزور سے کمزور حامی بھی اِس بات کو جانتے اور محسوس کرتے ہین کہ وہ کس چیز کے لیئے لڑ رہے ہین اور اس مین اور دوسرے

مذاہب مین کیا فرق ہے اور ہر ایک مذہب کی زندگی کے اس دَور مین بہت سے
اشخاص ایسے مِل سکتے ہین جنھون نے اس مذہب کے بنیادی اُصولون کو ہر حیثیت سے
محسوس کر لیا ہو، ان کو ہر طرح سے جانچ پڑتال لیا ہو اور اخلاق پر اس پورے اثر کا
تجربہ کر لیا ہو جو اس مذہب پر اعتقاد رکھنے سے ایک ایسے دماغ مین پیدا ہوتا ہے
جو سرتا سر اسی مین رنگ گیا ہو۔ لیکن جب وہ ایک آبائی مذہب ہو جاتا ہے اور براہِ
راست نہین بلکہ بالواسطہ آتا ہے یعنی یہ کہ جب دماغ پہلے کی طرح ان مسائل پر اپنے قوا
کے استعمال کے لیئے اس طرح مجبور نہین ہوتا جیسے پہلے ہوا کرتا تھا تو اس وقت رفتہ رفتہ
اس مذہب کا اثر بجز اس کے ظاہری عبادات و رسوم کے باقی ہر حیثیت سے محو
ہونے لگتا ہے، یا چپ چاپ خاموشی کے ساتھ اسے مان لیا جاتا ہے، گویا کہ اسے
دوسرے کے اعتماد پر قبول کیا گیا ہے اور اسے خود محسوس کرنے یا ذاتی تجربہ سے
آزمانے کی کوئی ضرورت نہین ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ انسان کی حیات داخلی سے
اس کا تمام تعلّق منقطع ہو جاتا ہے۔ اِس کے بعد وہ حالات پیدا ہوتے ہین جو آج کل کے
زمانہ مین اِس قدر عام ہین کہ شاید اکثریت انھی کی ہو جن مین مذہب گویا دماغ سے
باہر علیحدہ کوئی شے ہوتا ہے اور وہ اسے اس طرح بے حِس اور جامد بنا دیتا ہے کہ باقی
دوسرے اثرات کا اس پر کوئی اثر نہین ہوتا اور خود اس کے اپنے اثر کا اظہار اِسطرح
ہوتا ہے کہ کسی جدید اور زندہ اعتقاد کو وہ اس کے اندر داخل ہونے نہین دیتا۔ اور
خود دل و دماغ کے لیئے بجز اس کے اور کچھ نہین کرتا کہ ان پر بطور پہریدار کے کھڑا رہتا ہے
تاکہ کوئی اور اِس خالی گھر مین نہ آنے پائے۔

جو عقائد کہ دماغ پر گہرے سے گہرا اثر ڈالنے کے قابل ہوتے ہین وہ کِس حد تک

بالکل مردہ عقائد بنجاتے ہین اوران کا تخیل، جذبات یا عقل پر کہان تک کوئی اثر نہین ہوتا، اِس کی بہترین نظیر اگر تلاش کرنی ہے تو عیسائی مذہب کے ماننے والون مین مل سکتی ہے۔ عیسائی مذہب سے میری مُراد یہان وہ مذہب ہی جسے تمام فرقے اور جماعتین متفقہ طور پر تسلیم کرتی ہین یعنی وہ امثال ونصائح جو عہدنامۂ جدید مین موجود ہین۔ تمام عیسائی جو اپنے کو عیسائی کہتے ہین، اِن تعلیمات کو مقدس مانتے ہین اور انھین بطور قوانین کے تسلیم کرتے ہین۔ تاہم یہ کہنا کچھ بہت زیادہ بیجا نہوگا کہ ہزار مین سے ایک عیسائی بھی بمشکل ایسا ہوگا جو اپنے اخلاق وعادات کو ان قوانین کے مطابق درست رکھتا ہو۔ جس معیار یا اُصول کے مطابق وہ اپنی روزمرّہ کی زندگی بسر کرتا ہے، وہ خود اس کی قوم، اس کی جماعت یا اس کے دینی پیشے کے مطابق ہوتی ہی اسطرح ایک طرف اس کے پاس اخلاقی اقوال کا ایک مجموعہ ہی جسے وہ سمجھتا ہی کہ ایک غیر خاطی عقل کی طرف سے اسے بطور قواعدِ حکومت کے سپرد ہوئے ہین اور دوسری طرف روزانہ کے فیصلون اور تجربون کا ایک سلسلہ ہی جو کبھی کِسی حد تک توان اقوال کے مطابق ہوتے ہین اور کبھی ان مین سے بعض کے مخالف اور بہ حیثیت مجموعی وہ مسیحی عقائد اور دنیوی زندگی ومفاد کے درمیان ایک بین بین کی صورت ہوتی ہے۔ اِن مین سے اول الذکر کے ساتھ وہ تعظیم وتکریم بجالاتا ہی اور ثانی الذکر کے ساتھ اطاعت وانقیاد کا سلوک رکھتا ہی۔ تمام عیسائی مانتے ہین کہ برکت ہے اُن لوگون پر جو غریب اور مسکین ہین اور دُنیا مین مظلوم ہین، ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزرجانا اتنا مشکل نہین جتنا ایک دولتمند کا خدا کی بادشاہت مین داخل ہونا مشکل ہے، لوگون کو دوسرون کی عیب جوئی نہ کرنی چاہیئے تاکہ ان کی بھی عیب جوئی نہ کی جائے،

لوگون کو قسم نہ کھانی چاہیئے، لوگون کو اپنے ہمسایہ کے ساتھ ایسی ہی محبّت رکھنی چاہیئے جیسی وہ اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اگر کوئی شخص اِن کا لبادہ اُتار لے تو انھین اپنا چوغہ بھی دیدینا چاہیئے۔ اِنھین آج ہی سے کل کی فکر نہ کرنی چاہیئے۔ اگر وہ کامل بننا چاہتے ہیں تو انھین اپنی تمام چیزین بیچکر غریبوں کو دیدینا چاہیئے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ وہ اِن تمام باتون پر ایمان رکھتے ہیں وہ اس کے کہنے میں جھوٹے نہین ہیں، بے شک وہ ان سب باتون پر اسی طرح ایمان رکھتے ہین جیسا لوگ اُن باتوں کو مانتے ہیں جو انھون نے ہمیشہ بلند آہنگی کے ساتھ تو سنی ہیں لیکن ان پر بحث و مباحثہ ہوتے ہوئے کبھی نہین دیکھا ہے۔ لیکن ایک زندہ عقیدہ کے اعتبار سے جو انسان کے اخلاق و عادات کو درست رکھتا ہے، وہ اِن تعلیمات پر صرف اِسی حد تک ایمان رکھتے ہین جہان تک ان پر عمل پیرا ہونا ایک معمولی بات ہے۔ یہ تعلیمات اپنی حقّانیت کے اعتبار سے مخالفین کا مقابلہ کرنے کیلئے مفید ہوتی ہین اور سمجھا جاتا ہے کہ (اگر ممکن ہو تو) وہ لوگون کے ان افعال کے لئے بطور دلائل کے پیش کیجاتی ہین جنھین وہ اچھا سمجھتے ہین لیکن اگر کوئی شخص انھین یہ یاد دلائے کہ ان تعلیمات کے ساتھ اور بھی بہت سی باتون کی ضرورت ہے جن کے کرنے کا خیال تک بھی ان کے دِل مین نہین آتا تو وہ غریب ان مطعون لوگون مین شمار کیا جاتا ہے جو دوسرون سے بڑا بننا چاہتا ہے۔ اِن تعلیمات کا عام لوگون پر چندان اثر نہین ہوتا اور وہ ان کے دماغ مین کوئی قوت نہین رکھتین انھین الفاظ کی آواز سُنکر تعظیم بجالانے کی عادت تو ہوتی ہے لیکن انھین کوئی ایسا احساس نہین ہوتا جو ان الفاظ سے اصل معنی کی طرف لیجائے اور دماغ کو ان کے قبول کرنے پر مجبور کرے اور انھین اصل مسئلہ سے مطابقت دے۔ جب کبھی

زندگی کے معاملات کا سوال آتا ہے اس وقت وہ الف اور بے کا منھ تکتے ہین کہ وہ انھین بتائین کہ کہان تک حضرت مسیح کی پیروی کیجائے۔

لیکن ہمین پورا یقین ہے کہ اوائل عہد کے عیسائیون کی ایسی حالت نہ تھی بلکہ اس کے برعکس تھی۔ اگر ان کی بھی ایسی ہی حالت ہوتی تو عیسائی مذہب ذلیل وحقیر یہودیون کی گمنام جماعت سے نکلکر سلطنت رومہ کا مذہب نہ بنجاتا۔ جب انکے مخالفین یہ کہتے کہ "دیکھو یہ عیسائی آپس مین ایک دوسرے سے کیسی محبّت رکھتے ہین" (جو آج اُمید نہین کہ کوئی شخص کہے) تو یقیناً ان مین ان کے مذہب کے معنی کا اس سے کہین زیادہ احساس تھا جتنا ان مین اس کے بعد سے کبھی ہوا۔ اور غالبًا یہی سبب ہے کہ عیسائی مذہب آج کوئی ترقی نہین کر رہا ہے اور اٹھارہ صدی گزر جانیکے بعد بھی وہ تقریبًا یورپ کے لوگون اور اُن کے ہم نسلون ہی تک محدود ہے حتیٰ کہ وہ بڑے مذہبی لوگ جو اپنے عقائد پر نہایت سختی کے ساتھ پابند رہتے ہین اور ان مین سے اکثر عقائد کے معنی وہ عام لوگون سے کہین زیادہ سمجھتے ہین، ان کا بھی یہ حال ہے کہ جو چیز ان کے دماغون مین سب سے زیادہ نمایان ہے، وہ کالوین یا انھی جیسے کسی اور شخص کی پیدا کی ہوئی ہے" حضرت مسیح کی تعلیمات بھی ساتھ ہی ساتھ ان کے دماغون مین کسی گوشہ مین چھپی رہتی ہین جن کا اثر ان کے دماغ پر اس سے زیادہ مشکل سے ہوتا ہے جو بعض دل پسند اور ملایم الفاظ کے سننے سے ہوسکتا ہے۔ اِس مین شبہہ نہین کہ اِس کے اور بھی بہت سے وجوہ ہین کہ کیون کسی جماعت یا فرقہ کے مخصوص عقائد زیادہ دیرپا ہوتے ہین بہ نسبت اُن عقاید کے جو تمام جماعتون اور فرقون مین مشترک ہوتے ہین اور کیون ان فرقون کے پیشواؤن اور ہادیون کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ اِن عقائد کے معنی کو زندہ رکھین،

لیکن ان مین سے ایک یہ وجہ تو یقینی ہے کہ ان عقائد پر اکثر بحث اور نکتہ چینی ہوتی رہتی ہے اور ان کو ان کے علانیہ مخالفین سے مدافعت کرنے کے اکثر مواقع ملتے ہین۔ لیکن جب میدان دشمن سے خالی رہتا ہے تو رہبر اور رہرو دونوا پنی اپنی جگہ پر غافل سو جاتے ہین۔

یہی اُصول عام طور سے ان تمام عقائد پر صادق آتا ہے جو روایتہً نسلاً بعد نسلٍ چلے آتے ہین، یہ مسائل خواہ زندگی کے عِلم و بصیرت سے تعلّق رکھتے ہون یا اخلاق اور مذہب سے۔ دنیا کی تمام زبانین اور ادب زندگی کے متعلق عام مسایل سے بھرے ہوتے ہین، یعنی یہ کہ زندگی کیا شے ہے اور ایک شخص کو زندگی کس طرح بسر کرنی چاہئے۔ یہ ایسے مسائل ہین جنھین ہر شخص جانتا ہے، زبان سے کہتا ہے اور خوشی کے ساتھ سنتا ہے اور جو بطور مسلمہ مسائل کے تسلیم کئے جاتے ہین۔ لیکن جب ان کے متعلق کوئی تلخ تجربہ ہوتا ہے تو وہ زندگی مین پہلی بار اس کے معنی اور حقیقت سے آشنا ہوتے ہین۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ جب کسی شخص پر کوئی خلاف توقع مصیبت آئی ہے، تو اُسے کوئی مثل یا مقولہ یاد آگیا ہے جو اسے تمام عمر معلوم تھا لیکن جس کے معنی کو اگر وہ پہلے ہی ایسا محسوس کر لیتا جیسا کہ وہ اب کر رہا ہے تو اس مصیبت سے بچ جاتا۔ اِس مین شبہہ نہین کہ اِس کے وجوہ بحث و مباحثہ کے نہونے کے علاوہ اور بھی ہین۔ بہت سے ایسے حقایق ہین جن کے پورے معنی اس وقت تک سمجھ مین نہین آسکتے جبتک کہ انسان کا ذاتی تجربہ انھین حل نہ کرے۔ لیکن ان کے معنی بھی بہت کچھ سمجھ مین آگئے ہوتے اور جو کچھ سمجھ مین آگئے، انکا اثر بھی دماغ پر بہت گہرا پڑا ہوتا اگر اس شخص کو ان لوگون کی زبان سے موافق و مخالف دلائل کے سننے کا موقع ملتا جنھون نے اسے اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ انسان کا یہ مہلک میلان کہ جب کسی مسئلہ مین کوئی شک و شبہہ باقی نہ رہے

تو اس پر غور و فکر کرنا چھوڑ دیا جائے اس کی نصف غلطیوں کا اصلی سبب ہوتا ہے۔ ایک ہمعصر مصنّف نے کیا خوب کہا ہے کہ "جب انسان کوئی رائے تسلیم کر لیتا ہے تو پھر وہ خواب خرگوش میں پڑ جاتا ہے"۔

لیکن سوال یہ ہو سکتا ہے کہ کیا اتفاق رائے کا نہونا حقیقی علم ہونے کے لیئے کوئی لازمی شرط ہے؟ کیا یہ ضروری ہے کہ نبی نوع کا کوئی نہ کوئی حصّہ غلط رائے رکھنے پر ہمیشہ مُصر رہے تاکہ دوسروں کو حق کا علم ہو سکے؟ کیا ایک عقیدہ عام طور سے تسلیم کر لئے جانے کے بعد حقیقی اور صحیح نہیں ہو سکتا، اور کیا کوئی مسئلہ اسوقت تک پورے طور پر سمجھا اور محسوس نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ اس میں کوئی نہ کوئی شبہہ باقی نہ رہجائے؟ کیا جب لوگ متفقہ طور سے کسی حقیقت کو مان لیتے ہیں تو وہ حقیقت انہی میں فنا ہو جاتی ہے؟ ترقی یافتہ دماغ کا اعلیٰ ترین مقصد اور سب سے بہتر نتیجہ اب تک یہ خیال کیا گیا ہے کہ تمام اہم حقایق کے تسلیم کرانے پر انسان میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا کیا جائے، تو کیا دماغی ترقی اسی وقت تک رہتی ہے جبتک کہ اس کا مقصد حاصل نہیں ہوتا؟ کیا فتوحات کے ثمرات ان کے پایہ تکمیل کو پہونچتے ہی برباد ہو جاتے ہیں؟

میں اِس قسم کی کسی بات کا مدعی نہیں۔ جوں جوں انسان ترقی کرتا جائیگا اسی قدر اس میں ایسے مسائل کی تعداد بڑھتی جائیگی جن میں کسی بحث و مباحثہ یا شک و شبہہ کی گنجایش نہو گی۔ اور انسان کی بہبود کا اندازہ تقریبًا ان مسائل کی تعداد اور اہمیّت سے کیا جائیگا جو اسوقت تک غیر متنازعہ فیہ حد کو پہونچ چکے ہیں۔ اسکے بعد دیگرے تمام مسائل پر سنجیدہ مباحث کا بند ہونا اتفاق رائے کی

ایک ضروری دلیل ہے، یہی اتفاق و یکجہتی صحیح رایون کی صورت مین جسقدر مفید اور سودمند ہے اسی قدر غلط رایون کے معاملہ مین خطرناک اور مضر بھی ہے۔ اور اگرچہ اختلاف رائے کے کم کرنے کی یہ تدریجی کوشش دونو مضمون کے اعتبار سے ضروری ہے، یعنی ناگزیر بھی ہے اور لازمی بھی لیکن ہم اِس نتیجہ پر پہونچنے کے لئے مجبور نہین ہین کہ اِس کے تمام نتائج مفید ہی ہون گے۔ ایک مسئلہ کے بہتر اور صحیح سمجھنے کے لئے وہ اہم معاون شے جو مخالفین کے سامنے اسکے بیان کرنے یا اس کی مدافعت کرنے سے حاصل ہوتی ہے، اس کا ہاتھ سے چلا جانا اگرچہ اِس مسئلہ کے عام طور پر تسلیم کرلئے جانے کے فائدہ سے زیادہ نہ سہی تاہم اس کی راہ مین کچھ کم درجہ کی رُکاوٹ بھی نہین ہے۔ جہان یہ فائدہ نہین حاصل ہوسکتا، وہان مین یہ چاہتا ہون کہ علما اور واعظین اِس کا کوئی بدل پیدا کرنے کی کوشش کرین اور کوئی ایسی تدبیر نکالین جس سے مسئلہ کی دشواریان متلاشی حق کے ذہن کے سامنے اس طرح آجائین جس طرح ایک مخالف شخص نے جو اسکو اپنا ہمعقیدہ بنانے کے لئے کوشان ہے، اسکے سامنے پیش کردی ہون۔

لیکن اِس غرض کیلئے تدابیر تلاش کرنے کی بجائے انھون نے وہ تدابیر بھی اپنے ہاتھ سے کھودی ہین جو ان کے پاس پہلے سے موجود تھین حکیم سقراط کا منطقیانہ طریقہ تعلیم جو اس قدر خوبی کے ساتھ افلاطون کے مکالمات مین موجود ہے، اِسی قِسم کی ایک تدبیر تھی۔ ان مین زیادہ تر فلسفہ اور زندگی کے بڑے بڑے مسائل مہمہ پر منفی مباحثے ہوتے تھے جن کی خاص غرض یہ ہوتی تھی کہ ان اشخاص کو جنھون نے مسلّمہ خیالات کو بلا سوچے سمجھے مان لیا ہے،

ان کو اِس بات کے لئے قایل کیا جائے کہ انھون نے ان مسائل کو سمجھا نہین ہے اور انھون نے اب تک ان عقاید کے جن کے وہ زبان سے قایل ہین، کوئی مخصوص معنی قرار نہین دیئے ہین، تاکہ اِس طرح سے وہ اپنی ناواقفیّت سے واقف ہوکر ایک مستقل عقیدہ قایم کرین جو ان عقائد کے معنی اور ان کی شہادت کے صاف و صریح فہم پر مبنی ہو۔ قرونِ وسطیٰ کے مدارس مین جو مباحثے ہوتے تھے ان کی بھی کم وبیش یہی غرض ہوتی تھی۔ اِس طریقہ سے ان کا مقصد یہ معلوم کرنا ہوتا تھا کہ شاگرد اپنی رائے کو اچھی طرح سمجھ رہا ہے اور اسی کے ساتھ وہ مخالف رائے سے بھی واقف ہے اور اپنے خیال کی تائید اور مخالف کی تردید مین وہ دلائل بھی پیش کرسکتا ہے۔ اِس مین شبہ نہین کہ اِن موخر الذکر مباحثون مین ناقابلِ علاج نقص بھی تھا، اِس لئے کہ جو دعوے پیش کئے جاتے تھے۔ ان کا مآخذ اپنی عقل نہین بلکہ دوسرون کی سند ہوتی تھی اور بہ حیثیت دماغ کی تہذیب و ترتیب کے وہ ہر طرح سے اِن مکالمات سے کم درجہ پر تھے جنھون نے حلقۂ سقراط کی ذہنیت کی تشکیل کی تھی۔ لیکن موجودہ ذہنیت پر ان دونو چیزون کا اس سے کہین زیادہ اثر ہے جتنا کہ عام طور پر لوگ تسلیم کرتے ہین اور موجودہ طریقۂ تعلیم مین کوئی ایسی چیز نہین جو ان مین سے کسی ایک کی بھی جگہ لے سکے۔ ایک شخص جو اپنی تمام تر تعلیم اساتذہ اور کتابون کے ذریعہ حاصل کرتا ہے، اگر اس مین طوطے کی طرح رٹ لینے کی عادت نہ بھی ہو۔ پھر بھی یہ ضروری نہین ہے کہ وہ موافق و مخالف دونو پہلوؤن سے واقف ہوسکے، چنانچہ بڑے بڑے اہلِ فکر کو بھی اکثر یہ موقع نصیب نہین ہوتا کہ وہ ہر مسئلہ کے دونو پہلوؤن سے واقف ہوسکین اور لوگ اپنی رائے کی

موافقت میں جو کچھ کہتے، اس میں سب سے زیادہ کمزور حصہ وہ ہوتا ہے جو وہ اپنے مخالفین کے جواب میں پیش کرتے ہیں۔ یہ آج کل کا ایک عام دستور ہے کہ منفی منطق کو برا سمجھا جاتا ہے جو نظریے کی کمزوریوں کو یا عمل کی غلطیوں کو تو ظاہر کر دیتی ہے لیکن کوئی مثبت شے نہیں پیش کرتی ایسی منفی نکتہ چینی بجائے خود تو کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہیں ہے لیکن کسی علم یا عقیدہ کے حصول کا ذریعہ ہونے کی حیثیت سے اس کی جتنی قدر کی جائے، کم ہے اور تاوقتیکہ لوگوں کو پھر اس منفی منطق کی باقاعدہ طور پر تعلیم نہ ہو بجز ریاضی اور علوم طبیعی کے دوسری شاخوں میں بہت کم اہل فکر پیدا ہوں گے اور عام ذہنی ترقی کا معیار بھی کچھ بہت زیادہ بلند نہ ہوگا۔ کسی دوسرے موضوع پر ایک شخص کی رائے اس وقت تک علم کا درجہ نہیں حاصل کر سکتی جب تک کہ وہ ذہنی کیفیت جو مخالفین کے ساتھ مباحثہ کرنے میں ضروری ہوتی ہے، اس پر دوسروں نے مجبوراً نہ لاڈالی ہو یا خود اس نے اپنے اوپر نہ طاری کر لی ہو لہذا یہ شے جب موجود نہ ہو اسوقت اتنی ضروری ہوتی ہے اور اس کا حصول اس قدر دشوار، تو جب یہ از خود آرہی ہو اسوقت اسکو ہاتھ سے دینا کس قدر لغو بات ہوگی! اگر کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو مسلمہ رائے کی مخالفت کرتے ہیں، یا اگر قانون اور رائے عامہ کا خوف نہ ہو تو اس کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہیں، ایسی صورت میں ہمیں ان کا شکر گزار ہونا چاہیے اور ان کے خیالات کو نہایت خوشی سے سننا چاہیے اور خوش ہونا چاہیے کہ جو کام ہم کو اپنے عقائد کے یقین اور قوت کی خاطر کرنا چاہیے تھا، اس کے کرنے کے لئے ہم سے زیادہ مستعد اشخاص موجود ہیں۔

ان خاص اسباب میں سے ایک سبب کا ذکر کرنا ابھی باقی ہے جن سے اختلاف آراء کا ہونا مفید پڑتا ہے اور اس وقت تک مفید ثابت ہوتا رہے گا جب تک کہ انسان اتنی ترقی نہ کر لے جس کی مستقبل قریب میں کوئی امید نہیں۔ اب تک ہم نے دو صورتوں پر بحث کی ہے، ایک یہ کہ مسلمہ رائے غلط ہو سکتی ہے لہذا کوئی اور خیال اس کی بجائے درست ہو۔ دوسری

صورت یہ ہے کہ مسلمہ رائے صحیح ہو پھر بھی اس کے بہتر طور پر سمجھنے اور اصل حقیقت کے اثر پذیر ہونے کے لئے ضرورت ہے کہ مخالف رائے سے اس کا تصادم ہو۔ لیکن ایک تیسری صورت اس سے بھی زیادہ عام ہے اور وہ یہ کہ متصادم خیالات بجائے اس کے کہ ان میں سے ایک صحیح ہو اور دوسرا غلط۔ دونوں کسی نہ کسی حد تک اپنے اندر صحت رکھتے ہوں اور مخالف رائے کی اس لئے ضرورت ہو کہ اصل حقیقت کا بقیہ جزو پیدا ہو سکے۔ ان مسائل پر جہاں ادراک حسی ممکن نہیں، عام خیالات اکثر صحیح ہوتے ہیں لیکن وہ حقیقت کاملہ بہت کم ہوتے ہیں یا کبھی نہیں ہوتے۔ وہ حقیقت کاملہ کا ایک جزو ہوتے ہیں کبھی یہ جزو بڑا ہوتا ہے اور کبھی چھوٹا لیکن اکثر اسمیں مبالغہ ہوتا ہے اسکی صورت مسخ کر دیجاتی ہے اُسے اصل حقیقت سے علیحدہ کر دیا جاتا ہے حالانکہ اسے اس حقیقت کاملہ کیساتھ پیش کرنا چاہیئے۔ ملحدانہ خیالات عموماً اسی قسم کے پس پشت پڑی ہوئی یا دبے ہوئے حقایق ہوتی ہیں جو ان زنجیروں کو توڑ ڈالتے ہیں جو انکو پابند رکھتی ہیں اور اسکے بعد وہ یا تو عام رائے کیساتھ مصالحت کی کوشش کرتے ہیں یا انکا بحیثیت مخالف رائے کی پورے اور

وقوت مقابلہ کرتے ہیں اور مسلمہ حقائق کی طرح یہ بھی اپنے کو حقیقت کاملہ کا بے شریک حامل جانتے ہیں۔ اب تک ان میں سے موخر الذکر صورت اکثر پیش آئی ہے اس لئے کہ یکطرفہ پن ذہن انسانی کا دستور ہے اور ہمہ گیری استثناء۔ چنانچہ آراء و خیالات کے انقلاب تک میں حقیقت کا ایک حصہ عموماً زائل ہوتا ہے اور اس کی بجائے دوسرا حصہ نمایاں ہو جاتا ہے اور خود ترقی کی صورت میں بھی کہ یہاں حقایق میں مزید اضافہ ہونا چاہیئے، اکثر کسی ایک یکطرفہ اور غیر مکمل حقیقت کی بجائے ایسی ہی کسی دوسری حقیقت کا اضافہ ہوجاتا ہے اور اصل ترقی ہوتی ہے وہ بس یہ کہ حقیقت کے اس نئے جزو کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے اور بہ نسبت دوسرے کے وہ حالات کے زیادہ مناسب ہوتا ہے۔ جب مروجہ آراء و خیالات ایسی یکطرفہ نوعیت کے ہوتے ہیں چاہے گو ان کی بنا حقیقت ہی پر کیوں نہ ہو تو پھر ہر رائے اور خیال کی

جس میں اس حقیقت کا کچھ نہ کچھ جزو ضرور شامل رہتا ہے جو مسلمہ رائے میں موجود نہیں ہوتا، اس کی قدر کرنی چاہیئے خواہ اس کے ساتھ غلطی اور ابہام کا کتنا ہی بڑا حصہ کیوں نہ ہو۔ کوئی منصف مزاج شخص اس امر پر اس وجہ سے خفا نہ ہوگا کہ جو لوگ کوئی ایسا خیال یا عقیدہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں جن پر ہم بصورت دیگر غالبًا کوئی توجہ نہ کرتے، وہ بعض ان عقائد و خیالات کو نظر انداز کر جاتے ہیں جو ہمارے نزدیک حقائق ہیں۔ بلکہ اسے یہ خیال کرنا چاہیئے کہ جب تک عام رائے کے ماننے والے دوسروں کے خیالات کو تسلیم نہیں کرتے ہیں اس وقت تک یہی بہتر ہے کہ مخالف رائے کے ماننے والے بھی اپنے خیال کو یکطرفہ طور پر پیش کریں، کیونکہ ایسے ہی لوگ بالعموم اسے پوری قوت سے پیش کر سکے اور اس پارۂ دانش کے لئے جسے یہ دانشِ کُل کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں یہی مذبذب لوگوں کو توجہ کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں۔

چنانچہ اٹھارہویں صدی میں جب کہ تعلیم یافتہ اور وہ غیر تعلیم یافتہ جو ان کے زیر اثر تھے، دونوں اس زمانہ کی تہذیب اور اس وقت کے سائنس، ادب اور فلسفہ کے کارناموں کی مدح سرائی و ثنا خوانی میں محو تھے اور قدیم و جدید زمانے کے اشخاص میں زمین و آسمان کا فرق جتاتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ فائدہ اور بہتری کا جو پہلو ہے وہ سب انھی کی تائید میں ہے، عین اس وقت روسو[1] کے خیالات بم کے گولوں کی طرح ان کے درمیان گرے اور انھوں

[1] یہ فرانس کا ایک فلسفی ہے جو ۱۷۱۲ء میں پیدا ہوا۔ اس کی ابتدائی تعلیم و تربیت بہت ناقص ہوئی پھر بھی اس نے اپنی محنت اور خداداد قابلیت سے وہ شہرت پیدا کر لی جو کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔ اس کی قابلیت کا سب سے بہتر موقع اس وقت پیش آیا جب کہ کسی علمی مجلس نے ایک انعامی مضمون کا اعلان کیا جس کا عنوان یہ تھا "ترقی تہذیب کا اثر اخلاق پر" روسو نے اس اعلان پر اپنی قسمت آزمائی شروع کی اور نہایت مدلل طور پر دکھایا کہ انسان اپنی بربریت کی حالت میں کس درجہ فائق تھا۔ انعام بالآخر روسو کو ملا، دوسرے (بقیہ صفحہ ۸۳)

نے یکطرفہ رائے کے مجموعہ جامد کو پاش پاش کر دیا اور اس کے منتشر اجزار کو جدید عناصر کے ساتھ ملاکر از سر نو ایک بہتر صورت میں قایم کیا ۔ یہ نہیں کہ اس زمانہ کے مروجہ خیالات روسو کے خیالات کے مقابلہ میں حقیقت سے دور تھے بلکہ برعکس اس کے وہ تو اس سے قریب تر تھے ۔ ان میں حقیقی صداقت زیادہ تھی اور غلطیاں بہت کم ۔ پھر بھی باوجود اس کے روسو کے اصول و خیالات میں ایک بڑی حد تک وہ حقائق تھے جن کو اس زمانہ کی عام رائے کو ضرورت تھی اور آج تک مروجہ خیالات کے ساتھ چلے آئے ہیں اور یہی وہ خزانہ ہے جو سیلاب کے ختم ہو جانے کے بعد نیچے بیٹھے رہتا ہے ۔ سادہ زندگی کی قدر افزائی اور مصنوعی جماعت کے تکلفات اور موانعات کا تباہ کن اور مضر اثر یہ وہ خیالات ہیں جو روسو کے وقت سے لیکر آج تک تعلیم یافتہ گروہ کے دماغ سے پورے طور پر کبھی غائب نہیں ہوئے ہیں اور آیندہ بھی وہ اپنا اثر ڈالتے رہیں گے، اگرچہ آج کل ضرورت ہے کہ انھیں پھر اسی زور کے ساتھ پیش کیا جائے اور عملی طریقہ پر پیش کیا جائے، اس لئے کہ اس معاملہ میں الفاظ کا اثر تقریباً ختم ہو چکا ہے ۔

علاوہ اس کے سیاسیات میں یہ ایک تقریباً مسلمہ بات ہے کہ ایک جماعت جو نظام و امن کی حامی ہو اور دوسری جو ترقی و اصلاح کی علمبردار ہو، دونوں سیاسی زندگی

(بقیہ مضمون صفحہ ۸۲) ہی سال اس کا وہ مضمون شائع ہوا اور اس کی شہرت تمام ملک میں پھیل گئی ۔ کچھ عرصہ بعد اسی مجلس نے پھر ایک دوسرے مضمون کا اعلان کیا جس کا عنوان تھا "عدم مساوات کی اصل"، روسو نے پھر قسمت آزمائی کی لیکن اس مرتبہ وہ ناکام رہا، اگرچہ اس کا یہ مضمون بھی پہلے سے کچھ کم نہ تھا ۔

روسو اپنے عادات و اخلاق کے لحاظ سے کچھ پسندیدہ نہ تھا لیکن اس کے زور قلم اور طرز تحریر نے اسے ملک بھر میں محبوب اور ہر دل عزیز بنا دیا تھا ۔ اس نے اپنے عہد کے اکثر بڑے بڑے اشخاص کی مخالفتیں مول لے رکھی تھیں لیکن باوجود اس کے اس کی ہر دلعزیزی اور شہرت میں کوئی فرق نہ آیا یہی وہ زمانہ (بقیہ صفحہ ۸۴ پر)۔

کی فلاح و بہبود کے لئے ضروری سمجھی جاتی ہیں، تاوقتیکہ ان میں سے ایک اس قدر وسیع النظر نہ ہو جائے کہ وہ نظام اور ترقی دونوں کی یکساں حامی ہو اور یہ سمجھتی ہو کہ کونسی چیز باقی رکھنے کے لائق ہے اور کونسی دور کر دینے کے قابل۔ ان دونوں خیالات میں سے ہر ایک کا افادہ دوسرے کی خامی سے پیدا ہوتا ہے لیکن بڑی حد تک دوسرے خیال کی مخالفت ہی دونوں کو عقل و صحت کے حدود میں رکھتی ہے۔ جب تک کہ جمہوریت و اشرافیت، سرمایہ داری و مساوات دولت، تعاون باہمی و مقابلہ، تعیش و اعتدال، اجتماعیت و انفرادیت، آزادی و انضباط اور اسی قسم کے عملی زندگی کے تمام اضداد کی موافقت و مخالفت میں یکساں طور پر آزادی کے ساتھ خیالات ظاہر نہ کئے جائیں اور ان کی اسی شدت اور خوبی کے ساتھ مخالفت کی جائے جیسی کہ موافقت ہو، اس وقت تک ان کا پورا پورا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ یقینی ہے کہ ایک کا پلہ ہلکا ہو جائے اور دوسر

(بقیہ مضمون صفحہ ۸۳) تھا جب کہ اس نے اپنی دو مشہور کتابیں لکھیں یعنی "عقد اجتماعی" اور "ایمیل"۔ اول الذکر کا موضوع بحث یہ ہے کہ حکومت دراصل حاکم و محکوم کے درمیان ایک معاہدۂ باہمی پر مبنی ہوتی ہے اور ثانی الذکر میں تعلیم کے موضوع پر نہایت دلچسپ پیرایہ میں بحث کی گئی ہے۔ ہر دو کتابیں اس عہد کی غالب قوموں یعنی حکومت اور کلیسا کے خلاف پڑتی تھیں۔ "ایمیل" تو قطعاً ضبط کر لی گئی اور خود روسو کو حکم ملا کہ اگر اس نے دو روز کے اندر اپنا قیام نہ چھوڑ دیا تو وہ گرفتار کر لیا جائے گا۔ یہاں سے بھاگ کر روسو نے جنیوا میں پناہ لی لیکن یہاں کی حکومت نے بھی اس کتاب کی ضبطی کا حکم دیدیا تھا۔ حکومتوں کی اس مخالفت سے روسو کی شہرت پر برا اثر پڑا اور اس کی وجہ سے جمہور بھی اس کے خلاف ہونے لگے۔ اب روسو کے لئے کوئی چارہ کار نظر نہ آتا تھا کہ اسی عرصہ میں انگلستان کے مشہور فلسفی ڈیوڈ ہیوم نے اسے اپنے ہاں بلا لیا۔ اس پردیس میں اس محروم وطن مہاجر کی کافی قدر و منزلت ہوئی لیکن یہاں بھی کچھ زیادہ عرصہ گزرنے نہیں پایا تھا کہ وہ اپنے محسن ڈیوڈ ہیوم سے لڑ بیٹھا اور بالآخر مراجعت وطن کی ٹھان لی (بقیہ مضمون صفحہ ۸۵ پر)

کا بھاری۔ حقیقت اصلی زندگی کے بڑے بڑے عملی معاملات میں زیادہ تر افراد کے باہم اتفاق و اتحاد اور اختلاط وارتباط کا نام ہے، یہاں تک کہ بہت کم لوگوں کے دماغ اس قدر وسیع اور بے لوث ہوتے ہیں جو یہ اختلاط وارتباط کسی قدر صحت کے ساتھ پیدا کر سکیں اور یہ پیدا بھی اسی وقت ہوتا ہے جب کہ ہر دو فریق ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوں۔ ان چند اہم مسائل میں سے جو ابھی اوپر بیان کئے گئے ہیں، اگر ان میں سے موافق یا مخالف کسی رائے کے ساتھ نہ صرف رواداری بلکہ اس کے ساتھ حمایت وطرف داری کئے جانے کا حق ہے تو یہ اس زمانہ کی اقلیت کی رائے ہے یہی وہ رائے ہے جو اس زمانہ کے لئے اس جماعت کی نیابت کرتی ہے جس کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور جو انسانی فلاح وبہبود کا وہ جزو ہے جس کے متعلق یہ اندیشہ ہے کہ اس پر اتنی توجہ.........
.........نہ ہوگی جتنی کہ ہونی چاہیئے۔ میں جانتا ہوں کہ ہمارے ملک میں ان میں سے اکثر مسائل

(بقیہ مضمون صفحہ ۸۴) اس نے ہیپر پریں میں قیام کیا۔ اس دوران میں اس نے اپنے "اقبالات" لکھنے شروع کئے تھے جسے اس نے یہاں آکر ختم کیا اور "مکالمات" کے نام سے دوسری کتاب شروع کی جو اس کی بہترین تصنیف میں شمار کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ اس کی تصانیف میں چند اور رسائل بھی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ روسو کو اپنی زندگی کے آخری ایام میں کچھ خلل دماغ سا ہو گیا تھا اور اس کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کی خلاف توقع شہرت اور اس کی ہمیشہ کی عزلت پسندی اور بے اطمینانی نے اس کے دماغی توازن کو خراب کر دیا تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ روسو نے جتنا دوسروں کے ساتھ ظلم نہیں کیا اس سے زیادہ دوسروں نے اس کے ساتھ ظلم کیا اور اس کی حقیقی شہرت اس کے اور اس کے مخالفین کے مرنے کے بعد شروع ہوتی ہے جب کہ انقلاب فرانس کے حامیان اسے بطور دیوتا کے پوجنے لگے اور اس کے ایک ایک فقرے پر جان دینے لگے۔ مذہب کی حیثیت سے روسو خدا پرست تھا اور اس نے اپنا ایک خاص فطری مذہب بنا رکھا تھا۔ سیاست میں وہ جمہوریت پسند تھا اور فرانس کی شاہنشاہیت کے انداز سے زیادہ سے زیادہ لوگوں کا زیادہ سے (بقیہ مضمون صفحہ ۸۶ پر دیکھو)

پر اختلاف رائے کی وجہ سے کسی عدم رواداری کا اظہار نہیں کیا جاتا ہے۔ لوگ مسلمہ اور متعدد مثالوں کے ذریعہ اس امر کے ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انسانی دماغ کی جو اس وقت حالت ہے، اس کے لحاظ سے اختلاف آرا ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے حقیقت کے تمام پہلوؤں پر انصاف کے ساتھ نظر ڈالی جا سکتی ہے۔ جب کبھی بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جو کسی مسئلہ پر دنیا کے بظاہر عام اتفاق رائے سے اختلاف ظاہر کرنا چاہتے ہیں، خواہ ساری دنیا صحت ہی پر کیوں نہ ہو، تو ہمیشہ اس امر کا امکان رہتا ہے کہ مخالفین کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ضرور کہیں گے جو سننے کے قابل ہوں گی اور اگر وہ خاموش رہے تو حقیقت کو کچھ نہ کچھ نقصان ضرور ہوگا۔

لیکن اس پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ "بعض مسلّمہ اصول بالخصوص اہم اور ضروری مسائل کے متعلق ایسے ہوتے ہیں جن میں حق و باطل کی آمیزش نہیں ہوتی، مثلاً حضرت مسیح کی اخلاقی تعلیمات اس موضوع پر ایک حقیقت کلی ہیں اور اگر کوئی شخص ایسے اخلاق کی تعلیم دیتا ہے جو اس سے مختلف ہے تو وہ سرتاسر غلطی پر ہے چونکہ عملی حیثیت سے یہ مسئلہ سب سے زیادہ اہم ہے اس لئے اس عام اصول کے پرکھنے کے لئے اس سے بہتر اور کوئی مسئلہ نہیں ہو سکتا۔ لیکن قبل اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ مسیحی اخلاق کسے کہتے ہیں اور کسے نہیں، یہ طے کر لینا مناسب ہوگا کہ مسیحی اخلاق سے مراد کیا ہے۔ اگر اس سے مراد عہد نامہ جدید کے اخلاق سے ہے تو جو شخص خود اس کتاب کو پڑھ کر یہ علم رکھتا ہے، وہ یہ شاید ہی فرض کر سکے گا کہ یہ اخلاق کے کسی مکمل اصول کی حیثیت پر پیش کیا گیا تھا یا یہ اس کا مقصد تھا کہ انجیلوں میں جا بجا ان اخلاق کا ذکر آتا ہے جو اس سے قبل موجود تھے اور اس کی تمثیلیں صرف انہی معاملات کے متعلق ہیں جن میں اس

(بقیہ مضمون صفحہ ٨٥) زیادہ ظلم وستم نظر آتا تھا۔ فرانسیسی ادبیات میں بھی اسکا برا درجہ مانا جاتا ہے اور اس بنا پر بعض لوگ اسے فلسفی سے زیادہ ادیب سمجھتے ہیں لیکن اس زمانہ میں اس اصطلاح کا جو وسیع مفہوم تھا اس کے لحاظ سے روسو فلاسفہ کے زمرہ میں گنا جائیگا اور سچ تو یہ ہے کہ زمانہ کے ہاتھوں جو شہرت اور بقاء دوام اُسے ملی اور وہ ہمیشہ باقی رہیگی ۱۲۔

اخلاق کے اصلاح کی یا اس کی بجائے اس سے زیادہ وسیع اور اعلیٰ اخلاق کے پیدا کرنے کی ضرورت تھی۔ علاوہ اس کے ان تعلیمات کا لب ولہجہ اس قدر عام ہے کہ بعض وقت ان کی لفظی تاویل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے اور ان کے الفاظ میں قوانین کی صحت و تعئین کی بجائے شاعری و خطابت کی تاثیر نظر آتی ہے۔ اس سے اخلاقی اصول و مبادیات کا ایک مجموعہ تیار کرنا بغیر عہدنامہ عتیق سے اس کو ملائے ہوئے کبھی ممکن نہ ہوا اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ عہدنامہ عتیق خود ایک باقاعدہ نظام ہے لیکن اکثر حیثیتوں سے نیم متمدن اور غیر مہذب ہے اور صرف غیر مہذب ہی لوگوں کے لئے بنایا بھی گیا ہے۔ پولوس[1] جو ان تعلیمات کی یہودی مذہب و روایات کو پیش نظر رکھکر تاویل کرنے اور حضرت مسیح کے بنائے ہوتے ڈھانچہ کو اس سے پر کرنے کے سخت مخالف تھا' وہ بھی جب اپنے خیالات پیش کرتا ہے تو ان میں پہلے سے ایک اخلاق کو فرض کر لیتا ہے اور وہ اخلاق یونانیوں اور رومیوں کا ہوتا ہے اور جو نصایح اس نے عیسائیوں کو دی ہیں وہ زیادہ تر انھی اخلاق سے ایک طرح کی مطابقت ہیں یہاں تک کہ ان میں بظاہر غلامی کا جواز بھی پایا جاتا ہے۔ جس چیز کو حضرت مسیح کی اخلاقی تعلیمات کہا جاتا ہے اور اس کا بہتر نام

---

[1] پولوس یا ساؤل جیسا کہ انکا پرانا نام ہے' یہودیوں میں ایک پیغامبر گزرے ہیں جو اس وقت عیسائی مذہب کے "دوسری بانی" مانے جاتے ہیں۔ وہ پہلے عیسائی مذہب کے بڑے دشمن تھے لیکن یکبارگی ان پر الہام ہوا اور اسی وقت سے وہ اسکے نہ صرف موافق بلکہ بہت بڑے حامی و علمبردار ہوگئے۔ انہوں نے عیسائی مذہب کو یہودیت کی ایک اصلاح شدہ صورت سے نکالکر ایک جدید عالمگیر مذہب کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ کسی یہودی نے بہت خوب کہا ہے کہ حضرت مسیح نے تو یہودی مذہب کی اصلاح و توسیع کرنی چاہی لیکن پولوس نے اسے سرے سے بدل دیا۔ انہوں نے یہودیوں میں قانون (الہی) کی لفظی پرستش کو دیکھکر ایک موقع پر حضرت مسیح کے متعلق فرمایا کہ قانون ہی کی وجہ سے اس نے قانون پر جان دی تاکہ وہ خدا کے قرب میں زندگی حاصل کرے' اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح کے ارشادات میں کہاں تک وسعت و فراخی پیدا کی ہوگی۔ موجودہ مسیحی مذہب بڑی حد تک انہی کی تاویلات و توجیہات کا مجموعہ ہے۔

دینی تعلیمات ہونا چاہیئے، وہ حضرت مسیح یا ان کے حواریین کا کام نہیں ہے بلکہ وہ بہت بعد
کی چیز ہے جسے کاتھولکی عیسائیوں نے ابتدائی پانچ صدیوں کے اندر رفتہ رفتہ بنا پایا ہے اور اگرچہ
اسے کلی طور پر جدید خیال کے عیسائیوں اور پروٹسٹانٹی مذہب والوں نے اختیار نہیں کیا،
تاہم ان میں خلاف توقع بہت کم ترمیمیں کی ہیں۔ زیادہ تر انھوں نے صرف ان زوائد کو حذف
کر لینے پر اکتفا کیا ہے جو قرون وسطیٰ میں پیدا ہو گئے تھے اور جن میں ہر ایک فرقہ نے اپنی اپنی
خصوصیات و رجحانات کے مطابق اضافے کیے تھے۔ میں وہ آخری شخص ہونگا جو اس
بات سے انکار کروں کہ بنی نوع انسان پر ان اخلاقی تعلیمات اور اس کے ابتدائی معلمین
کا کوئی احسان نہیں ہے لیکن اسی کے ساتھ مجھے اس خیال کے ظاہر کرنے میں ذرا بھی تامل نہیں
کہ یہ تعلیمات اکثر اہم حیثیتوں سے ناقص اور یک رخی ہیں اور اگر ایسے خیالات و جذبات
جنھیں انھوں نے جائز نہیں رکھا ہے یورپ کی زندگی اور اخلاق کے بنانے میں مدد نہ دیتے
تو آج معاملات انسانی اپنی موجودہ حالت سے کہیں زیادہ بدتر ہوتے۔ حضرت مسیح کی
اخلاقی تعلیمات میں ایک ردعمل کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں یہ زیادہ تر بت پرستی
کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ اس کے نصب العین میں اثبات سے زیادہ نفی کا پہلو غالب ہے
اس میں فاعلی کیفیت سے زیادہ انفعالی، عظمت و شوکت سے زیادہ عجز و مسکنیت، نیکی کی
سرگرم تلاش سے زیادہ بدی سے بچنے کا خیال پایا جاتا ہے۔ اس کے نصائح میں (جیسا کہ کسی
خوب کہا ہے) "کرو" سے زیادہ "نہ کرو" کے احکام غالب ہیں۔ نفسانی خواہشات کے ڈر
سے اس نے رہبانیت کا ایک بت لا کھڑا کر دیا جس نے رفتہ رفتہ اباحت کی صورت
اختیار کر لی ہے۔ اس مذہب میں زیادہ تر ایک نیک زندگی بسر کرنے کا معیار جنت کی امید
اور دوزخ کا خوف ہے، اس لحاظ سے یہ بعض قدیم زمانہ کے مذاہب سے بھی کم درجہ پر ہے

اور یہ ہر شخص کے احساس فرائض کو اس کے ہم جنسوں کے مفاد سے علیحدہ کرکے انسانی اخلاق میں ایک خودغرضانہ نوعیت پیدا کردیتی ہے اور اگر ان سے صلاح ومشورہ کے لئے کوئی تعلق جائز رکھتی بھی ہے تو وہ بھی ایک بالکل خودغرضانہ تعلق ہوتا ہے۔ یہ مذہب تمامتر اطاعت مجہول کی تعلیم دیتا ہے اور اس میں ان تمام با اختیار قوتوں کی اطاعت فرض کی گئی ہے جو مستقل طور پر قایم پائی جائیں۔ اس میں ذرا شبہ نہیں کہ ان قوتوں کی اطاعت اس وقت فرض نہیں رہتی جب وہ ایسے امور کا حکم دیں جن کی مذہب نے ممانعت کی ہو لیکن اگر وہ خود ان کے حق میں ظلم کریں تو اس صورت میں ان کے خلاف بغاوت تو درکنار مقاومت بھی جائز نہیں۔ اور اگرچہ پرانی اچھی بت پرست قوموں کے اخلاق میں حکومت کے حقوق کو ایک غیر متناسب اہمیت دیگئی ہے جس میں افراد کی جائز آزادی پر بہت کچھ اثر پڑتا ہے لیکن خالص مسیحی اخلاق میں تو اس اہم ترین شعبہ کو تقریباً بالکل ہی نظر انداز کردیا گیا ہے۔ یہ قرآن مجید ہے نہ کہ عہدنامۂ جدید، جہاں ہم کو یہ حکم نظر آتا ہے کہ "ایک حاکم جو کسی عہدہ پر ایک ایسے شخص کو مامور کرتا ہے جب کہ اس کے حدود مملکت میں اُس سے بہتر شخص ملسکتا ہو، تو وہ خدا اور حکومت دونوں کے خلاف گناہ کا مرتکب ہوتا ہے" جمہوری حقوق کا کم وبیش جو کچھ بھی احساس جمہور کے موجودہ اخلاق میں پایا جاتا ہے، وہ عیسائیوں سے نہیں بلکہ یونانیوں اور رومیوں سے ماخوذ ہے۔ نج کی زندگی میں بھی فراخدلی، بلندخیالی، عالی ہمتی اور عزت واحترام کا تخیل جو کچھ پایا جاتا ہے، وہ ہماری تعلیم کے مذہبی عنصر سے پیدا نہیں ہوا ہے بلکہ وہ خالص انسانی جذبہ ہے جو کبھی ایک ایسے مجموعہ اخلاق سے پیدا نہیں ہوسکتا تھا جسکا اعلیٰ ترین معیار قدر

اطاعت رکھا گیا ہو۔

اس بات سے میں بھی قطعاً اسی طرح انکار کرتا ہوں جس طرح کوئی اور شخص کر سکتا ہو کہ یہ خامیاں ہر حال میں عیسائی مذہب میں خلقی ہیں، خواہ کسی پہلو سے اسے دیکھا جائے یا یہ کہ مکمل اخلاقی تعلیمات کی ضروری باتیں جو اس میں نہیں ہیں وہ اس میں کبھی نہیں آسکتیں۔ خود حضرت مسیح کی تعلیمات اور اصولوں کے متعلق تو ایسا اشارہ کرنا بھی دشوار ہو۔ میرا یقین ہو کہ حضرت مسیح کی باتیں بالکل وہی ہیں جو میں کسی شہادت کے ذریعہ سمجھ سکتا ہوں کہ ان کا مقصود تھا۔ وہ کسی ایسی شے کی نقیض نہیں جو ایک جامع اخلاق کے لئے ضروری ہو۔ ہر وہ شے جو اخلاق میں اعلیٰ اور عمدہ ہو، وہ ان میں لائی جا سکتی ہو اور اس کی زبان کو اس سے زیادہ توڑنے مروڑنے کی ضرورت نہیں پڑتی جتنا کہ ان سب نے اسے توڑا مروڑا ہے جنھوں نے اس سے کوئی بھی عملی نظام زندگی اخذ کرنے کی کوشش کی ہو۔ لیکن اس بات کے ماننے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ ان تعلیمات میں حقیقت کا صرف ایک جزو ہو اور یہی ان کا مقصود اصلی بھی تھا؛ اعلیٰ اخلاق کی بہت سی ضروری باتیں بانی عیسویت کی ان تعلیمات میں جو تحریری شکل میں ہمارے سامنے موجود ہیں کہیں نہیں بتائی گئی ہیں اور نہ ان کا بتایا جانا مقصود تھا اور عیسائی کلیسا نے جو نظام اخلاق ان تعلیمات کی بنیاد پر بنایا ہو اس میں وہ باتیں بالکل ہی نظر انداز کر دی گئی ہیں۔ چنانچہ اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ ایک بہت بڑی غلطی ہوگی اگر عیسائی مذہب میں وہ مکمل نظام زندگی تلاش کیا جائے جو اس کا بانی جاری و نافذ تو کرنا چاہتا تھا لیکن جسے وہ فراہم صرف جزوی حیثیت سے زیادہ نہ کر سکا۔ میرا یہ بھی خیال ہو کہ اس طرح اس تنگ نظریہ سے ایک عملی نقصان

پہنچ رہا ہو کہ اس اخلاقی تعلیم و تربیت کی قدر میں اس سے کمی پیدا ہوتی ہو اور جس کی
بعض اچھے نیک نیت لوگ بڑے زور شور سے حمایت کر رہے ہیں۔ مجھے بڑا اندیشہ
ہے کہ اس طرح دل و دماغ کو بالکل ہی مذہبی نوعیت پر ڈھالنے اور دنیوی پہلو کو ترک
کر دینے سے جو اب تک مسیحی اخلاق کا ایک جزو تھا اور جو کچھ تو اپنا اثر اس میں نفوذ
اور کچھ اس کا اثر اپنے اندر جذب کرتا رہا ہے، ایک نہایت پست، ادنیٰ اور غلامانہ
نوعیت کا اخلاق پیدا ہو گا اور پیدا ہو رہا ہے، جو خواہ اپنے عقیدہ کے مطابق مرضی الٰہی
پر سر تسلیم خم کر دے لیکن اس میں اعلیٰ نیکی کے تصور یا ایجاب کی کسی طرح صلاحیت
نہیں۔ میرا خیال ہے کہ اس کے علاوہ کوئی اور نظام اخلاق جو تمام تر مسیحی ذرائع
معلومات سے پیدا نہ ہوا ہو، مسیحی اخلاق کے ساتھ ساتھ ہونا چاہیئے تاکہ اس سے نوع
انسان میں اخلاقی زندگی پیدا ہو انسانی دماغ کی ایک غیر مکمل حالت میں صداقت کے مفاد
کا تقاضا یہ ہے کہ اختلاف آرا ہو اور عیسائی مذہب اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔
یہ ضروری نہیں ہے کہ اگر لوگ ان اخلاقی حقائق کو نظر انداز کرنا ترک کر دیں جو عیسائی
مذہب میں نہیں ہیں تو وہ ان حقائق کو بھی نظر انداز کرنے لگیں جو اس میں موجود ہیں۔
اس قسم کی عصبیت یا فروگزاشت اگر ہوتی ہے تو یہ بہت ہی مضر ہوتی ہے لیکن یہ ایک
ایسا نقصان ہے جس سے محفوظ رہنے کی ہم ہمیشہ توقع نہیں کر سکتے اور اسے بے شمار
منافع کا ایک صلہ سمجھنا چاہیئے۔ جزوی حقیقت جب حقیقت کامل ہونے کی مدعی ہو تو
اس کے خلاف احتجاج کرنا چاہیئے، اور ضرور کرنا چاہیئے اور اگر یہ احتجاج کرنے والے
خود بھی ردعمل کے طور پر غیر منصف ہو جائیں تو یہ یک طرفہ رویہ بھی اسی قدر قابل افسوس
ہو گا، جس قدر کہ دوسرا لیکن اس طرز عمل کو گوارا کر لینا چاہیئے۔ اگر عیسائی کفار کو اپنے

مذہب کے ساتھ انصاف برتنے کا سبق سکھائیں تو ہمیں چاہیئے کہ وہ بھی کفر کے ساتھ انصاف برتیں۔ یہ حق کی کوئی بڑی خدمت نہ ہوگی اگر اس واقعہ سے چشم پوشی کی جائے جو تمام ان لوگوں کو معلوم ہے جنھیں تاریخ ادب سے ذرا بھی واقفیت ہے اعلیٰ اور گرانبہا تعلیمات اخلاق کا ایک بہت بڑا حصہ صرف انھی لوگوں کا نہیں جو عیسائی مذہب کو نہیں جانتے تھے بلکہ زیادہ تر ان لوگوں کا ہے جو اس کو جانتے تھے اور پھر بھی ٹھکرا دیا۔

میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ ہر قسم کے خیالات اور آرا کے ظاہر کرنے کی بے روک ٹوک عام اجازت ہونے سے مذہبی یا فلسفیانہ تفرقہ بندی ختم ہو جائے گی۔ ہر وہ حقیقت جسے کچھ تنگ خیال لوگ سختی سے مانتے ہوں، وہ یقیناً اس طرح پیش کی جائے گی اور اس کی اس طرح تلقین ہوگی یا اس پر اس طرح عمل درآمد ہوگا، کہ گویا دنیا میں اس کے تقابل کی دوسری کوئی حقیقت تھی ہی نہیں یا کسی طرح ہو ہی نہیں سکتی جو اسے محدود یا مشروط کر سکے۔ مجھے اعتراف ہے کہ آرا و خیالات کے فرقہ وارانہ بننے کا میلان آزادی کے ساتھ مباحثہ کی اجازت ہو جانے سے بھی نہیں رک سکتا بلکہ اس سے اکثر اور زیادہ بڑھتا اور نشوونما پاتا ہے، اور جس حقیقت کو تسلیم کر لیا جانا چاہیئے تھا، اسے تسلیم نہیں کیا جاتا بلکہ اس بنا پر اور بھی سختی کے ساتھ مسترد کر دیا جاتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی زبان سے نکلی ہے جو مخالف کیے جاتے ہیں۔ لیکن اس تصادم آرا کا سب سے خوشگوار اثر فریقین مباحثہ پر نہیں بلکہ ان خاموش اور بے تعلق لوگوں پر پڑتا ہے جو تماشائی کی حیثیت سے اس مباحثہ سے الگ رہتے ہیں۔ اصل برائی اجزائے حقیقت کے درمیان باہمی تصادم نہیں ہے بلکہ حقیقت کے کسی ایک جزو کا خاموشی سے دبا دینا ہے۔ جب لوگوں کو حقیقت کے دونوں پہلوؤں پر سننے کیلئے

مجبور کیا جائے گا تو اس صورت میں ہمیشہ کچھ نہ کچھ امید باقی رہے گی لیکن جب انھیں مسئلہ کے صرف ایک پہلو کے سننے کا موقع دیا جائے گا تو اسی صورت میں یہ ہوتا ہے کہ غلطیاں تعصبات سے بدلجاتی ہیں اور حق باطل ہو کر اپنا اثر کھو بیٹھتا ہے۔ اور چونکہ انسان کے تمام قوار دماغی میں وہ قوت فیصلہ ہی سب سے نایاب قوت ہے جو کسی مسئلہ کے ہر دو پہلوؤں کے درمیان ایسی حالت میں صحیح فیصلہ کر سکے جبکہ اس کے سامنے اس کا صرف ایک رخ پیش کیا جاتا ہو، لہذا حقیقت کو اچھا موقع اسی نسبت سے ملتا ہے جس نسبت سے کہ ہر رائے یا خیال کو جس میں حقیقت کا کوئی بھی جزو ہو اپنا نہ صرف حامی مل جائے بلکہ حمایت بھی اسی طرح کی جائے کہ اسے سننا ہی پڑے۔

بہر حال ہم نے اب یہ تسلیم کر لیا ہے کہ نوع انسان کی دماغی و ذہنی بہبود کے لئے (جس پر کہ دوسری ہر قسم کی بہبود کا دارمدار ہے) رائے کی آزادی اور رائے کے اظہار کی آزادی چار مختلف اسباب کی بنا پر ضروری اور لازمی ہے اور جن کو ہم یہاں پر مختصراً پھر بیان کر دینا چاہتے ہیں۔

اول یہ کہ اگر کسی رائے کو جبراً رد کیا جاتا ہے تو جہاں تک یقینی طور پر علم کا تعلق ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ رائے صحیح ہو۔ اس سے انکار کرنا گویا اپنے آپ کو غیر خاطی سمجھنا ہے۔

دوسرے یہ کہ اگر وہ رائے جسے یہ جبر رد کیا گیا ہے، غلط بھی ہو تاہم ممکن ہے اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اس میں حقیقت کا کوئی جزو موجود ہو۔ اور چونکہ کسی مسئلہ پر عام یا جمہور کی رائے کبھی حقیقت کامل نہیں ہوتی ہے اس صورت میں یہ بات صرف مخالف آراء کے تصادم ہی سے ممکن ہے تاکہ حقیقت کا بقیہ جزو بھی سامنے آسکے۔

تیسرے یہ کہ مسلمہ رائے نہ صرف صحیح بلکہ حقیقت کامل بھی ہو لیکن تاوقتیکہ اس پر نہایت شدومد کے ساتھ بحث ومباحثہ ہونے کا موقع نہ دیا جائے، اس کے اکثر ماننے والے اسے بطور تعصب کے اپنے دل میں رکھیں گے اور اس کے عقلی وجوہ کا علم یا احساس ان میں مشکل ہی سے ہوگا۔ اور نہ صرف یہی بلکہ چوتھے یہ کہ خود ان عقائد وخیالات کے معنی ومفہوم کا سیرت اور اخلاق وعادات پر اثر کم ہونے کا کیا بلکہ سرے سے غائب ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ وہ عقیدہ محض زبان سے کہنے کے لئے ایک کلمہ رہ جاتا ہے جس سے نیک اثرات تو پیدا ہو نہیں سکتے البتہ (دماغوں میں) جگہ گھیر رہتی ہے اور اس کی وجہ سے عقل یا ذاتی تجربہ کی بنا پر کوئی حقیقی اور دلی عقیدہ پیدا ہونے نہیں پاتا۔

قبل اس کے کہ آزادی رائے کی بحث کو ختم کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ایک نظر ان لوگوں پر بھی ڈال لی جائے جو کہتے ہیں کہ ہر قسم کی آراء کے اظہار کی آزادی اس شرط پر دینی چاہیئے کہ طریقۂ اظہار نہایت مناسب ومعتدل ہو اور جائز مباحثہ کی حد سے گزرنے نہ پائے۔

لیکن اس قسم کے فرضی حدود کے قیام کے عدم امکان پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اگر اس کا معیار یہ ہے کہ جن لوگوں کی رایوں پر اعتراضات کئے جائیں انھیں دکھ نہ پہنچے تو میرا خیال ہے کہ جہاں اعتراض ذرا سخت اور تیز ہو وہاں یہ دکھ تو ہمیشہ پہنچ ہی جاتا ہے اور ہر وہ مخالف جو ان اعتراضات کو اس قدر سختی کے ساتھ پیش کرتا ہے کہ ان کا جواب دینا دشوار ہو جاتا ہے یا اگر اس مسئلہ پر وہ کسی قدر جوش وخروش کا اظہار کرے تو وہ انھیں ایک سخت اور غیر معتدل دشمن نظر آنے لگتا ہے۔ اگرچہ خود عملی نقطۂ نظر سے یہ ایک اہم بات ہے لیکن دراصل یہ ایک اس سے بھی زیادہ اصولی

شئے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اظہار رائے کا طریقہ خواہ وہ رائے بالکل صحیح
کیوں نہ ہو، قابل اعتراض ہو سکتا ہے اور بہت ممکن ہے کہ وہ سخت لعنت ملامت کے
قابل بھی سمجھا جائے۔ لیکن اس نوعیت کے زیادہ اہم جرائم وہ ہیں جن کا ذہن میں آنا اکثر
ناممکن ہوتا ہے الا یہ کہ اتفاق سے کوئی اس میں مبتلا ہو جائے۔ ان میں سب سے
سنگین جرائم یہ ہیں کہ فریب وہ استدلال کیا جائے، واقعات یا دلائل کو چھپایا جائے،
کسی مسئلہ کو غلط بیان کیا جائے، یا مخالف رائے کو غلط طور پر پیش کرنے کی کوشش کی
جائے۔ لیکن یہ تمام جرائم اکثر اور بعض اوقات اپنی انتہائی صورت میں نہایت نیک
نیتی کے ساتھ سرزد ہوتے ہیں اور ان کے ارتکاب کرنے والے ایسے اشخاص ہوتے
ہیں جنھیں ناواقف اور نااہل کسی طرح نہیں سمجھا جا سکتا اور اکثر لحاظ سے وہ ایسا
سمجھے جانے کے مستحق بھی نہیں۔ اس لئے یہ مشکل ہی سے ممکن ہے کہ بوجوہ معقول ان غلط
بیانیوں کو اخلاقاً مستوجب سزا قرار دیا جائے اور اس قسم کے مناظرانہ معاملات میں
قانون کا دخل تو اور بھی نہیں ہو سکتا۔ نامناسب مباحثہ سے جو عام طور پر مراد لی
جاتی ہے یعنی لعن طعن کرنا یا ذاتیات پر اتر آنا، اس قسم کے حربوں کے استعمال کو برا سمجھنا
بہت زیادہ مستحق ہمدردی ہوتا اگر یہ بلا لحاظ ہر دو فریق کے لئے انھیں ناروا کر دیا جائے
لیکن ہوتا یہ ہے کہ ان کے استعمال کو عموماً عام رائے کے مقابل میں روکا جاتا ہے غیر تسلیم شدہ رائے
کے خلاف ان کا استعمال ہی نہیں کہ عام ناپسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا بلکہ
جو شخص انھیں استعمال کرتا ہے، اس کی تعریف کی جاتی ہے کہ اس کا جوش بہت
ایمان دارانہ اور اس کا غصہ بالکل بجا ہے۔ تاہم ان حربوں کے استعمال سے جو کچھ
بھی نقصان ہوتا ہے، وہ اس صورت میں بہت زیادہ ہوتا ہے جب کہ وہ ان لوگوں

کے خلاف استعمال کئے جاتے ہیں جن کے لئے نسبتاً مدافعت کا کوئی سامان نہیں ہوتا اور جو کچھ بھی ناجائز فائدہ اس طریقہ اظہار سے ہوتا ہے وہ تقریباً کل کا کل مسلمہ رائے کو ہوتا ہے۔ اس قسم کا سب سے سنگین جرم جو کسی شریک بحث سے سرزد ہوسکتا ہے، وہ یہ ہے کہ وہ اپنے سے مخالف رائے رکھنے والوں کو برا اور بد اخلاق بتلائے۔ اس قسم کی لعنت ملامت کا نشانہ اکثر بیچارے وہ لوگ بنتے ہیں، جو کوئی غیر مقبول رائے رکھتے ہیں، اس لئے کہ وہ عموماً تعداد میں کم اور بے اثر ہوتے ہیں اور سوائے اپنے کوئی ان کے حق میں انصاف کرنے والا نہیں ہوتا لیکن اس حربے کا استعمال ان لوگوں کے لئے تو قدرتاً بند ہوتا ہے جو مروجہ رائے پر اعتراضات کرتے ہیں۔ وہ تو اسے پورے طور پر اپنے لئے استعمال کر سکتے ہیں اور اگر کر سکتے ہیں تو اس کا استعمال خود ان کے مقصد کے لئے مضر ہوتا ہے۔ عام طور پر جو رائیں عام مروجہ رایوں کے مخالف ہوتی ہیں ان کے سنے جانے کی صرف یہی صورت ہوتی ہے کہ ان کے اظہار کے لئے زبان کے اعتدال کا خاص لحاظ رکھا جائے اور غیر ضروری تشدد سے حتی الوسع احتراز کیا جائے اور اگر اس کا ذرا بھی خیال نہ رکھا گیا تو سخت نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ برعکس اس کے مروجہ خیالات کی جانب سے جو اس قدر لعن طعن کا استعمال کیا جاتا ہے اس سے قطعاً لوگ مخالف رائے کے اظہار سے رکتے ہیں اور اس رائے کے ماننے والوں کی باتیں نہیں سنتے۔ لہٰذا حق و انصاف کے خیال سے اس صورت میں تشدد آمیز الفاظ کا استعمال پہلی صورت سے زیادہ قابل انسداد ہے اور مثال کے طور پر اگر لامذہبیت اور مذہبیت کو لیا جائے تو اول الذکر پر تشدد آمیز حملوں

کا روکنا موخرالذکر سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔ بہرحال یہ ظاہر ہے کہ قانون اور حکومت کو ان میں سے کسی کے روکنے سے بھی سروکار نہیں ہے، بلکہ ہر صورت میں خود رائے کو حالات کے مطابق اپنا فیصلہ کرنا چاہیئے اور ہر اس شخص کو خواہ وہ کسی طرف ہو قابل نفرین سمجھنا چاہیئے جس کے طرز ادا سے خبث باطن، کینہ پروری، تعصب یا عدم رواداری کا اظہار ہوتا ہو۔ لیکن ان برائیوں کو اس فریق کی وجہ سے باور نہ کر لینا چاہیئے جس کی طرف کوئی شخص ہوتا ہے خواہ وہ فریق ہمارا مخالف ہی کیوں نہ ہو۔ اور جو شخص خواہ وہ خود کسی خیال کا ہو اپنے مخالفین کی رایوں کو صحیح صحیح بلا کم و کاست خاموشی اور دیانتداری کے ساتھ بیان کرتا اور سنتا ہے اور کسی رائے کو مطعون بنانے کے لئے مبالغہ نہیں کرتا نہ کسی ایسی چیز کو چھپاتا ہے جس سے اس رائے کی موافقت ہوتی یا ہوسکتی ہو تو اس کا نہایت عزت و احترام کرنا چاہیئے۔ عام مناظرے کا حقیقی اخلاقی معیار یہ ہے اور اگرچہ اس کی خلاف ورزی اکثر کی جاتی ہے تاہم مجھے اس خیال سے خوشی ہوتی ہے کہ اکثر مناظرہ کرنے والے ان اصول و قواعد کا بڑی حد تک لحاظ رکھتے ہیں اور اس سے زیادہ لوگ اس پر عمل پیرا ہونے کی صدق نیت سے کوشش کرتے ہیں۔

باب سوم

انفرادیت بہبود انسانی کا ایک ذریعہ ہے

یہ دو وجوہ ہیں جن کی بنا پر انسانوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ رائے قائم کر سکیں اور پھر اُسے بلا تامل ظاہر بھی کر سکیں اور اگر یہ آزادی نہ دی جائے یا نہ دیجانے کی صورت میں اس کے حصول کا دعویٰ بھی نہ کیا جائے تو اس کے مُضر اثرات انسان کی ذہنی اور پھر اس کے ذریعہ اخلاقی فطرت پر ان صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ آیا ان ہی وجوہ کی بنا پر انسان کو اپنی ان رایوں پر عمل کرنے کی بھی ویسی آزادی ہونا چاہیئے یا نہیں یعنی یہ کہ ان رایوں پر اس وقت تک تمام معاملات زندگی میں بلا جسمانی یا اخلاقی روک ٹوک کے عمل پیرا ہونا چاہیئے جب تک کہ ان کے بُرے نتائج اور نقصانات خود انہی کی ذات پر موقوف ہوں یہ آخری شرط تو بہرحال ضروری ہے۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہتا کہ انسان کے افعال میں بھی وہی آزادی ہونی چاہیئے جو اس کی رائے کے معاملہ میں ہوتی ہے بلکہ خود رائیں بھی پُر امن اور سکون افزا نہیں رہتیں جب وہ ایسے حالات میں ظاہر کی جائیں جن سے کسی ضرر رساں فعل کے وقوع کا امکان پیدا ہو۔ یہ خیالات کہ غلہ کے تاجر غربا کے حق میں فاقہ اور موت کا باعث ہوتے ہیں' یا یہ کہ ذاتی و شخصی مِلک رکھنا ایک

قسم کی ڈاکہ زنی ہے، اس وقت تک بے روک ٹوک ظاہر کئے جا سکتے ہیں جب تک کہ ان کا اظہار صرف اخبارات کے ذریعہ سے ہو۔ لیکن جب یہ ایک ایسے پُرجوش مجمع کے سامنے تقریر یا اشتہارات کے ذریعہ ظاہر کئے جائیں جو کسی غلہ کے تاجر کے مکان کے سامنے جمع ہو تو اس وقت وہ یقیناً قابل سزا ہو جاتے ہیں۔ کسی قسم کے افعال ہوں اگر وہ بغیر کسی معقول وجہ کے دوسروں کے لئے ضرر رساں ثابت ہوں تو انھیں اظہار ناپسندیدگی کے ذریعہ عملی مداخلت سے بھی روکا جا سکتا ہے بلکہ بعض اہم صورتوں میں اُنکا روکنا لازمی ہے۔ ایک فرد کی آزادی کو صرف اسی حد تک محدود کیا جا سکتا ہے یعنی یہ کہ وہ دوسروں کے لئے باعث تکلیف نہ ہو۔ لیکن اگر وہ دوسروں کے معاملات میں خلل انداز نہیں اور خود اپنے ہی معاملات میں اپنے رجحان و فیصلہ کے مطابق عمل کرتا ہے تو انہی وجوہ کی بنا پر جن سے کہ آزادیِ رائے لازم آتی ہے، یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اُسے اپنی رائے پر عمل پیرا ہونے کا بلا مزاحمت غیرے پورا حق حاصل ہونا چاہئے۔ انسان معصوم نہیں، اور اس کے حقائق، حقائقِ کلی نہیں ہوتے، اتفاق آرا تا وقتیکہ مخالف رایوں کے باہم پورے پورے مقابلہ و موازنہ سے پیدا نہ ہو، کوئی پسندیدہ شئے نہیں، اختلاف رائے کوئی بُری شئے نہیں بلکہ اچھی چیز ہے، تا وقتیکہ لوگ حقائق کے تمام پہلوؤں کو تسلیم کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔ یہ تمام وہ اصول ہیں جن کا انسان کے افعال پر بھی اُسی طرح اطلاق ہو سکتا ہے جس طرح وہ ان کی رایوں کے معاملہ میں صادق آتے ہیں۔ انسان چونکہ انسانِ کامل نہیں اس لئے جس طرح اختلاف آرا کا ہونا مفید ہے، اُسی طرح عملی زندگی کے نئے نئے تجربے بھی ہونے چاہئیں۔ مختلف قسم کے طبائع کو اپنے اپنے طریقہ عمل) کا پورا موقع دینا چاہئے بشرطیکہ اس سے دوسرں

کو نقصان نہ پہنچے اور جب کوئی شخص یہ معلوم کرنا چاہتا ہے کہ زندگی کے مختلف طریقوں میں کونسا طریقہ بہترین ہے تو اسے اس کو عملاً ثابت کرنا چاہیئے۔ غرض مناسب یہ ہے کہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق دوسروں سے نہ ہو انفرادیت کو اپنے اظہار کا پورا موقع دینا چاہیئے۔ جہاں چلن کا معیار شخصی سیرت نہیں بلکہ دوسرے لوگوں کے رسوم وروایات ہوتے ہیں، وہاں اس بات کے نہ ہونے سے انسانی خوشی میں ایک بہت بڑی عنصر کی کمی رہ جاتی ہے اور وہ انفرادی اور معاشرتی ترقی کے گویا ایک خاص جزو کی کمی ہوتی ہے۔

اس اصول کو قائم رکھنے میں سب سے بڑی دشواری یہ نہیں ہے کہ ایک مسلمہ مقصد کے لئے ذرائع کی طرف توجہ نہیں ہوتی بلکہ جو دقت ہے وہ یہ کہ عام طور پر خود مقصد کی طرف سے غفلت برتی جاتی ہے۔ اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ انفرادیت کا آزادانہ نشوونما بہبود انسانی کے لوازم میں سے ہے، اور یہ محض تہذیب و تمدن اور تعلیم و تربیت کے ساتھ ایک ضمنی عنصر نہیں ہے بلکہ بذات خود ان تمام چیزوں کا ایک ضروری اور لازمی جزو ہے تو پھر اس بات کا کوئی خطرہ نہیں کہ آزادی کی ناقدری کی جائیگی اور نہ اس کے اور جماعت کے اختیارات کے حدود قائم کرنے میں کوئی غیر معمولی دشواری پیش آئیگی لیکن خرابی تو یہ ہے کہ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ انفرادی آزادی میں فی نفسہ کوئی خوبی یا قابل توجہ بات نہیں ہے۔ اکثریت چونکہ لوگوں کے موجودہ طرز عمل سے مطمئن ہوتی ہے (اس لئے کہ وہی اس طرز عمل کی ذمہ دار ہوتی ہے) اس لئے وہ نہیں سمجھ سکتی کہ وہ طریقے ہر شخص کے لئے یکساں طور پر مناسب کیوں نہ ہوں اور اس سے بڑھ کر یہ کہ آزادیٔ عمل اخلاقی اور معاشرتی مصلحین کے نصب العین کا بھی کوئی جزو نہیں

ہوتی بلکہ سمجھا جاتا ہے کہ مصلحین اپنے خیال کے مطابق جن امور کو بہبود انسانی کے لئے مفید سمجھتے ہیں ان کے مقبول عام ہونے میں یہ نہ صرف ایک دشواری بلکہ بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ جرمنی سے باہر تو بہت ہی کم لوگ اس اصول کو پورے طور پر سمجھتے ہیں جو ولیم[1] فان ہمبولٹ جیسے مشہور فاضل اور ماہر سیاست نے ایک مقالہ کے اصل موضوع کی حیثیت سے پیش کیا تھا اور وہ یہ ہے کہ "انسان[2] کا مقصد یا وہ جسے عقل کے اٹل اور عالمگیر قوانین نے نہ کہ مبہم اور عارضی خواہشات نے قایم کیا ہو، یہ ہے کہ اپنے قوا کو نہایت اعلیٰ اور بہتر پیمانہ پر ترقی دے کر ایک مکمل اور مستقل کل تک پہنچایا جائے۔" لہذا وہ شے" جس کے لئے ہر انسان کو اپنی تمام کوششوں سے کام لینا چاہیئے اور جس پر خاص کر ان لوگوں کو جو اپنے ہم جنسوں پر کسی قسم کا اثر رکھنا چاہتے ہیں ہمیشہ نظر رکھنی چاہیئے وہ قوت اور نشوونما کی انفرادیت ہے" اور اس کے لئے دو چیزیں نہایت ضروری ہیں " آزادی عمل اور حالات کا تنوع" اور ان اجزا کے باہمی اشتراک سے "انفرادی قوت اور کثیر الانواع اختلاف" پیدا ہو جاتا ہے جن کی باہمی ترکیب سے " قوت

[2] حکومت کے فرائض و حدود " ترجمہ از جرمن اڈیشن مصنفہ ہیرن ولیم فان ہمبولٹ صفحہ ۱۱ تا ۱۳

---

[1] یہ جرمنی کا ایک بہت بڑا ماہر السنہ اور فاضل گزرا ہے۔ یہ ۱۷۶۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۵ء میں انتقال کیا۔ اس کی ابتدائی زندگی سیاسی رہی ہے اور اس حیثیت سے یہ ایک کافی عرصہ تک روم میں بہ حیثیت سفیر کے رہا ہے، لیکن اس سیاسی زندگی کے ساتھ بھی اس کے علمی و لسانی ذوق میں کوئی کمی نہیں ہوئی ۔ اس نے اس حالت میں بھی ۱۸۰۰ء میں جرمنی کے مشہور فلسفی شاعر گوئٹے پر ایک تنقید شائع کی جس نے اس کی شہرت میں اور اضافہ کر دیا، مگر اس کی یہ سیاسی زندگی زیادہ عرصہ قائم نہ رہی اور پروشیا کی قدامت پسند پالیسی سے اس کا نباہ نہ ہو سکا، اور اسے سیاسی زندگی سے علیحدہ ہونا پڑا۔ یہ علیحدگی اس کے حق میں بہت مفید ثابت ہوئی، اس لئے کہ اسے اپنے علمی کاموں کے لئے اور زیادہ وقت اور فرصت ہاتھ آ گئی اور اس نے آیندہ ایسی ایسی لسانی تحقیقاتیں اور فلسفیانہ باتیں شائع کیں جن سے اس کی شہرت میں چار چاند لگ گئے۔ فلسفی ہونے کے ساتھ ساتھ اس کی علمی زندگی کے تجربات نے اسے اپنے عہد کے فلاسفہ میں بہت ممتاز اور نمایاں کر دیا تھا۔

"قوتِ اجتہاد" کا نشوونما ہوتا ہے۔

خواہ لوگ فان ہمبولٹ کے جیسے اصول کے عادی نہ ہوں اور خواہ انھیں اس امر پر حیرت ہی کیوں نہ ہو کہ انفرادی آزادی کو اس قدر اہمیت کیوں دی جاتی ہے، لیکن یہ سمجھ لینا چاہئے کہ جو فرق ہو سکتا ہے وہ صرف مدارج کا فرق ہے۔ بہترین طریقہ زندگی کے متعلق کسی کا یہ خیال نہ ہوگا کہ لوگوں کو سوائے اس کے اور کچھ نہ کرنا چاہئے کہ بس آپس میں ایک دوسرے کی نقل اتارتے رہیں۔ کوئی شخص یہ نہیں کہے گا کہ لوگوں کو اپنے طرز معاشرت اور معاملات زندگی میں اپنی قوت فیصلہ اور اپنی انفرادی سیرت سے کام نہ لینا چاہئے۔ دوسری طرف یہ کہنا بھی لغو ہوگا کہ لوگوں کو اس طرح زندگی بسر کرنی چاہئے گویا ان کے وجود میں آنے سے قبل اس دنیا میں کوئی کچھ جانتا ہی نہ تھا اور تجربہ نے اب تک کچھ نہیں بتایا تھا کہ بود و باش کا ایک طریقہ دوسرے سے قابل ترجیح کیوں ہے۔ اس بات سے تو کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا کہ لوگوں کو اوائل عمر میں اس قسم کی تعلیم و تربیت دینی چاہیئے جس سے وہ انسانی تجربات کے مسلمہ نتائج کا علم حاصل کر سکیں اور ان سے فائدہ اٹھا سکیں، لیکن ہر شخص کا حق ہے اور اس کے لئے مناسب اور بہتر بھی ہے کہ جب وہ اپنے قوا رسے کے پورے نشوونما کو پہنچ جائے تو وہ ان تجربات کا استعمال اور ان کی تاویل اپنے طریقہ پر کرے۔ یہ انسان کا فرض ہے کہ وہ معلوم کرے کہ ان تجربات میں سے کتنے اس کے اپنے حالات اور اس کی اپنی سیرت کے لئے قابل استعمال ہو سکتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے رسوم و روایات ایک حد تک اس بات کی شہادت ہیں کہ ان کے تجربے نے انھیں کیا سکھایا ہے۔ وہ ایک قیاسی شہادت ہوتی ہے،

اور اس حیثیت سے مستحق احترام ہے۔ لیکن اولاً تو خود ان کا تجربہ کافی محدود ہو سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ انھوں نے اس کی صحیح تاویل نہ کی ہو، دوسرے یہ کہ انھوں نے تجربات کی تاویل بھی صحیح کی ہو لیکن یہ خود اس کے مناسب حال نہو رسم و رواج معمولی حالات اور معمولی طبائع کے لئے ہوتے ہیں اور بہت ممکن ہے کہ اس کے حالات اور اس کی طبیعت ان رسوم و روایات کے مطابق نہ ہوں تیسرے یہ کہ عادات و رسوم اگرچہ بحیثیت عادات و رسوم کے بہتر بھی ہوں اور اس کے مناسب حال بھی، تاہم محض ان عادات و رسوم پر چلنے سے اس میں وہ خصوصیات ہرگز نہ پیدا ہوں گی جو انسان کو مابہ الامتیاز شے کے طور پر عطا کی گئی ہیں، تمام انسانی قوار مثلاً قوت ادراک، قوت فیصلہ، قوت تمیز، ذہن اور اخلاقی ترجیح سے تو اسی وقت کام لیا جاتا ہے جب مختلف چیزوں میں انتخاب کرنا پڑے۔ جو شخص صرف رسم و رواج کی بنا پر کوئی فعل کرتا ہے، وہ اپنی قوت انتخاب سے کام نہیں لیتا۔ اسے بہترین شے کے انتخاب کرنے یا اس کے حاصل کرنے کی کوئی مشق و مہارت نہیں ہوتی۔ جسمانی قوار کی طرح دماغی اور اخلاقی قوار بھی کام لئے جانے سے ترقی کرتے ہیں۔ کسی فعل کو صرف اس بنا پر کرنے سے کہ دوسرے بھی ویسا کرتے ہیں اور کسی عقیدے کو صرف اس بنا پر ماننے سے کہ دوسرے بھی اسے مانتے ہیں، ان قوار کو کام میں لانے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ اگر کسی خیال یا عقیدے کے دلائل اس شخص کی عقل و فہم کے لئے اطمینان بخش نہیں ہیں تو اس کی عقل میں کوئی قوت پیدا نہیں ہو سکتی بلکہ بہت ممکن ہے کہ ایسے خیال یا عقیدہ کے ماننے سے اس میں اور ضعف پیدا ہو اور اگر کسی کام کے لئے ترغیبات خود اس کے جذبات اور طبیعت کے موافق نہیں ہیں (جہاں محبت یا دوسروں کے حقوق کا کوئی لحاظ

نہ ہو تو گویا ان کو متحرک اور باکار بنانے کی بجائے انھیں سست اور معطل رکھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

جو شخص اپنے نظام زندگی کا فیصلہ دنیا پر یا دنیا کے اس حصہ پر چھوڑ دے جس سے اس کا تعلق ہے تو اُسے بندروں کی سی نقالی کے سوا اور کسی قوت وطاقت کی ضرورت نہیں۔ جو شخص اپنے نظام زندگی کا انتخاب آپ کرتا ہے، اُسے اپنے تمام قوار سے کام لینا ہوتا ہے۔ اُسے دیکھنے کے لئے قوت مشاہدہ سے، عاقبت اندیشی کے لئے اپنی قوتِ استدلال اور قوتِ فیصلہ سے تصفیہ کی غرض سے مواد جمع کرنے کے لئے نقل و حرکت سے، خود فیصلہ کے لئے قوت تمیز سے کام لینا پڑتا ہے اور جب وہ سب کچھ طے کرے تو اسے اپنے فیصلۂ قطعی پر کاربند رہنے کے لئے عزم و استقلال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور ان اوصاف کی ضرورت اور ان کا استعمال اسی مناسبت سے ہوتا ہے جتنا بڑا وہ کام ہوتا ہے، جسے اس نے خود اپنے فیصلہ اور طبیعت کے مطابق اپنے ذمہ لیا ہے۔ ممکن ہے کہ وہ بغیر ان قوار کی مدد کے صحیح راستے پہ لگ جائے اور ہر طرح کے نقصانات سے محفوظ رہے، لیکن بحیثیت انسان کے اس کا کیا درجہ رہیگا؟ اہم بات صرف یہی نہیں کہ آدمی کرتے کیا ہیں بلکہ یہ بھی اہم ہے کہ اس کام کے کرنے والے کس قسم کے لوگ ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اپنے تمام ان کاموں میں جسے مکمل اور بہتر بنانے میں انسان مصروف ہو سب سے اہم اور مقدم خود انسان ہے۔ فرض کرو کہ مکانات کی تعمیر، غلہ کی کاشت، جنگوں کا فیصلہ، مقدمات کا تصفیہ، معابد کا قیام اور حتیٰ کہ عبادات کی ادائیگی یہ سب کام ایسی کلوں کے ذریعہ ہوتا جو انسان کی شکل میں ہوتیں تو ان کلوں کو ان اشخاص کی بجائے رکھنے میں بھی ایک بہت بڑا نقصان تھا جو اسوقت دنیا کے حصوں میں آباد ہیں اور جو یقیناً اس انسان کا

بہت ناقص نمونہ ہیں جو قدرت پیدا کر سکتی ہے اور کریگی۔

فطرتِ انسانی کوئی مشین نہیں ہے جو کسی نمونہ کے مطابق بنائی جا سکے اور جو صرف ایک ہی کام پر لگائی جا سکے بلکہ ایک درخت ہے جسے اپنے اندرونی میلانات کے مطابق ہر طرف بڑھنے اور پھیلنے کی ضرورت ہے کہ اسی سے وہ ایک زندہ شے معلوم ہوتا ہے۔

اس سے غالباً کسی کو انکار نہ ہوگا کہ لوگوں کو اپنی عقل اور سمجھ سے کام لینا چاہیے، اور سمجھ بوجھ کر رسم و رواج کی پابندی یا کبھی کبھی اس سے انحراف تک اس سے بہتر ہے کہ ان کی کورانہ اور بلا سمجھے بوجھے تقلید کی جائے۔ ایک حد تک یہ تو تسلیم کیا جاتا ہے کہ ہماری سمجھ ہماری اپنی ہونی چاہیے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ نہیں مانا جاتا کہ ہمارے میلانات و محرکات بھی اپنے ہونے چاہئیں، یا خود اپنے محرکات کا ہونا اور خواہ وہ کتنے ہی قوی کیوں نہ ہوں، کوئی بڑا خطرہ یا ڈرنے کی چیز نہیں ہیں۔ تاہم خواہشات اور محرکات انسان کامل کے لئے اسی قدر ضروری ہیں جس قدر عقائد اور پابندیاں، اور زبردست محرکات صرف اسی صورت میں خطرناک ہوتے ہیں جب کہ ان کا مناسب طور سے توازن قائم نہیں رہتا، یعنی بعض مقاصد و میلانات بڑھتے بڑھتے بہت قوی ہو جاتے ہیں اور بعض جنھیں انھی کے برابر رہنا چاہیے، کمزور اور بے کار ہو جاتے ہیں۔ لوگ برائی کرتے ہیں تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کی خواہشات قوی ہوتی ہیں بلکہ اس سبب سے کہ ان کے ضمیر کمزور ہوتے ہیں۔ قوی جذبات اور کمزور ضمیر میں قدرتاً کوئی تعلق نہیں، قدرتی تعلق تو اس کے برعکس ہوتا ہے۔ یہ کہنا کہ فلاں شخص کی خواہشات و جذبات دوسرے شخص سے مختلف اور قوی تر ہیں، اس کے صرف یہ معنی ہیں کہ اس شخص میں فطرتِ انسانی کا خام عنصر زیادہ ہے اور اس لئے اس میں غالباً برائی کرنے کی صلاحیت زیادہ ہوگی لیکن

اس سے زیادہ نیکی کرنے کی بھی ہوگی۔ قوی جذبات کا ہونا قوت عمل کا دوسرا نام ہے۔ یہ قوت بڑے کاموں میں بھی صرف کی جاسکتی ہے لیکن ایک قوی فطرت سے ایک سست اور غبی طبیعت کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ نیک کام بھی لیا جاسکتا ہے۔ جن لوگوں میں سب سے زیادہ فطری احساس ہوتا ہے، وہ ہمیشہ وہی لوگ ہوتے ہیں جن کے اکتسابی جذبات بھی قوی ہوسکتے ہیں، وہ قوی حسیات جن سے کہ شخصی محرکات زیادہ نمایاں اور مضبوط ہوتے ہیں، وہی وہ منبع بھی ہوتے ہیں جہاں سے نیکی کی زبردست خواہش اور ضبط نفس کا قوی مادہ پیدا ہوتا ہے۔ انہیں کو نشو و نما دیکر جماعت اپنا فرض بھی ادا کرتی ہے اور اپنے مفاد کی حفاظت بھی کرتی ہے، نہ کہ اس مواد کو جس سے کہ رجال وانقلاب پیدا ہوتے ہیں صرف اسلئے ٹھکرا دیتی ہے کہ وہ اس سے کام لینا نہیں جانتی ایک شخص جسکی خواہشات اور رجحانات اس کے اپنے ہوتے ہیں یعنی خود اس کی فطرت کے مظاہر ہوتے ہیں، اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک سیرت رکھتا ہے لیکن ایک دوسرا شخص جس کی خواہشات اور رجحانات اپنے نہیں ہوتے، کوئی سیرت نہیں رکھتا، یعنی اس کی سیرت کچھ اس سے زیادہ نہیں ہوتی جتنی کہ ایک دخانی انجن کی ہوتی ہے۔ اگر کسی کے محرکات خود اپنے ہونے کے علاوہ قوی بھی ہوں اور ایک مضبوط قوت ارادی کے ماتحت ہوں تو اسکی سیرت بہت پُرقوت ہوگی۔ جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ انفرادی خواہشات و رجحانات کو آزادی سے ظاہر نہ ہونے دینا چاہیئے، اس کو لازمی طور پر اس عقیدہ کا بھی ہونا پڑیگا کہ جماعت کو قوی طبائع کی کوئی ضرورت نہیں ہے یعنی کہ ایسے بہت سے اشخاص کے وجود سے جماعت کوئی بہتر نہیں ہو جاتی جو بہت زیادہ سیرت رکھتے ہوں اور قوت عمل کے ایک عام بلند معیار کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

جماعت کے بعض ابتدائی زمانوں میں یہ قوتیں اس طاقت سے بہت زیادہ رہی ہوں گی بلکہ تھیں جو جماعت کو اس وقت ان پر قابو رکھنے اور انھیں تعلیم و تربیت دینے کی غرض سے حاصل تھی۔ ایک زمانہ گزر چکا ہے جب کہ آزادی و انفرادیت کا عنصر بہت غالب تھا اور معاشرتی اصولوں کو ہمیشہ ان سے برسر پیکار رہنا پڑتا تھا اس وقت جو دشواری پیش آتی تھی وہ یہ کہ قوی جسم و دماغ رکھنے والے لوگوں کو اس بات کی ترغیب دینا پڑتی تھی کہ وہ ان قواعد کی پابندی کریں جو ان کے محرکات کو قابو میں رکھنے کے لئے بنائے جاتے تھے۔ اس دشواری کو رفع کرنے کے لئے قانون و تربیت مثل ان پاپایان روم کے جو افراد کے لئے سلاطین سے برسرپیکار رہا کرتے تھے، انسان کے کل جسم و روح پر قبضہ و اقتدار کا مطالبہ کرنے لگیں اور وہ اس کی سیرت کو قابو میں رکھنے کی غرض سے اس کی پوری زندگی پر قبضہ رکھنے کے دعوے دار بن گئے اس لئے کہ جماعت نے انھیں پابند بنانے کا اس سے بہتر اور کوئی طریقہ نہیں پایا تھا۔ لیکن جماعت اب انفرادی آزادی پر کافی طور سے غالب آگئی ہے اور فطرتِ انسانی کو جو خطرہ ہے، وہ شخصی محرکات و رجحانات کی زیادتی نہیں بلکہ کمی کا ہے۔ اُس وقت کے مقابلہ میں حالات بالکل بدل گئے ہیں، جب ان لوگوں کے جذبات جو فطری یا ذاتی حیثیت سے کوئی قوت رکھتے تھے، ہمیشہ قوانین و ضوابط کے خلاف بغاوت پر آمادہ رہا کرتے تھے۔ اور ضرورت تھی کہ ان کو قابو میں رکھا جائے، تاکہ وہ لوگ جو ان کے دسترس میں ہوں، امن و تحفظ کا کچھ تو لطف اٹھا سکیں۔ آجکل ہمارے زمانہ میں اعلیٰ سے لیکر ادنیٰ تک ہر شخص اس طرح رہتا ہے گویا انتہائی نگرانی اور مخالفانہ دیکھ بھال کی حالت میں ہو۔ نہ صرف ان معاملات میں جن کا تعلق دوسروں سے ہوتا ہے بلکہ ان تک

میں جو صرف انھی کی ذات سے متعلق ہوتے ہیں، کوئی شخص یا خاندان اپنے جی سے نہیں سوال کرتا کہ میں کس چیز کو ترجیح دوں؟ میرے مزاج اور طبیعت کے لئے کیا مناسب ہوگا؟ یا میرے بہترین اور اعلیٰ قوا کے نشو و نما اور ترقی کے لئے سب سے زیادہ ممد و معاون کون سی چیزیں ہونگی؟ بلکہ وہ یہ پوچھتے ہیں کہ ہماری حیثیت کے لئے کیا مناسب ہوگا؟ مجھ جیسی حیثیت اور بساط رکھنے والے عموماً کیا کرتے ہیں؟ یا (اس سے بھی بدتر یہ کہ) مجھ سے بڑی حیثیت اور بساط رکھنے والے لوگ کیا کرتے ہیں؟ یہ مطلب نہیں کہ وہ اپنے رجحانات پر رسم و رواج کو ترجیح دیتے ہیں بلکہ بجز رسم و رواج کے ان کا کوئی میلان ہی نہیں ہوتا۔ غرض دماغ خود بخود اس جوئے کے نیچے آجاتا ہے، حتیٰ کہ ان باتوں میں بھی جنھیں لوگ تفریح اور دلچسپی کے خیال سے کرتے ہیں، مطابقت اور یکسانی کا خیال سب سے پہلے آتا ہے۔ وہ جب کوئی چیز پسند کرتے ہیں تو ایک جماعت کثیر کے ساتھ، اور جب کبھی اپنی پسند کا استعمال بھی کرتے ہیں تو اکثر ان کاموں میں جو عام طور پر کئے جاتے ہیں۔ جدت مذاق اور تنوع عمل، یہ چیزیں ان کے ہاں بمنزلہ جرم سمجھی جاتی ہیں، چونکہ وہ اپنی فطرت کی اتباع نہیں کرتے، اس لئے وہ فطرت ہی باقی نہیں رہتی جس کی اتباع کی جائے، ان کے تمام قوائے انسانی خشک ہو کر مردہ ہو جاتے ہیں۔ ان میں اس کی صلاحیت ہی نہیں رہتی کہ ان کے اندر کوئی قوی جذبہ یا ذاتی خواہش پیدا ہو اور عام طور سے ان کی نہ کوئی اپنی ذاتی رائے ہوتی ہے نہ اپنے ذاتی جذبات ہیں۔ اب یہ بتایئے کہ طبائع انسانی کی یہ حالت پسندیدہ ہے یا ناپسندیدہ؟

کالوینی[1] مذہب کے مطابق تو یہ صورت حال پسندیدہ ہے اس کی رو سے تو

لہ

انسان کا سب سے بڑا جرم بس خودسری ہے۔ نوع انسان کی تمام خوبیوں کا انحصار اطاعت وفرمانبرداری پر ہے۔ تمہاری اپنی کوئی مرضی نہیں، تمہیں بس ایک مخصوص طریقہ کے مطابق عمل کرنا چاہیے اس کے علاوہ اور کسی دوسرے طریقے کی اجازت نہیں۔ ان کا قول ہے کہ "جو باتیں فرائض میں داخل نہیں، ان کا کرنا گناہ ہے"۔ فطرت انسانی چونکہ تمام تر شر آلود واقع ہوئی ہے، اس لئے انسان کے واسطے نجات کا بجز اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں کہ وہ اپنی اس فطرت کی بیخکنی کرے۔ جو شخص اس نظریۂ زندگی کا قایل ہو، اس کے نزدیک انسان کے کسی قوا، یا جذبات وحسیات کا فنا کرنا کوئی برا فعل نہیں۔ انسان کو سوائے اس کے اور کسی صلاحیت کی ضرورت نہیں کہ وہ خود کو خدا کی مرضی کے حوالہ کردے اور اگر وہ اپنی کسی صلاحیت کو اس مفروضہ مرضی کے علاوہ اور کسی مقصد کے لئے استعمال کرتا ہے، تو اس کے لئے بہتر ہے کہ وہ اس صلاحیت سے محروم ہی رہے۔ یہ کالوینی مذہب کا نظریہ ہے اور کسی قدر تغیر و تبدل کے ساتھ اسے اکثر دوسرے لوگ بھی مانتے ہیں جو اپنے کو اس مذہب کا پیرو نہیں سمجھتے اور یہ تغیر بھی صرف اس بات میں ہے کہ وہ خدا کی اس مرضی کی کچھ راہبانہ تعبیر کرتے ہیں اور ان کے خیال کے مطابق خدا کی مرضی یہ ہے کہ انسان اپنے بعض رجحانات کو ضرور پورا کرے لیکن اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ بطور اطاعت یعنی ان احکامات کے مطابق جو اس کو دیے گئے ہیں، اور جو اس صورت میں لازمی طور پر سب کے لئے یکساں ہیں۔

اسی قسم کی کسی نہ کسی فریب دہ صورت میں آجکل اس تنگ نظریۂ حیات اور اس جکڑی ہوئی غیر ترقی پذیر سیرت کی طرف بہت میلان پیدا ہو رہا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بہت سے لوگوں کا ایمانداری سے یہ خیال ہے کہ ان ٹھٹھرے ہوئے انسانوں کا

وجود جنھیں ابھرنے اور بڑھنے کا موقع نہیں دیا جاتا، ان کے خالق کی مرضی کے عین مطابق ہے، جس طرح سے کہ بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ درخت جب قطع وبرید کرکے درست کردیئے جاتے ہیں یا ان کو کاٹ چھانٹ کرکے ان سے جانوروں کی شکلیں بنائی جاتی ہیں، تو وہ اپنی قدرتی حالت سے زیادہ بہتر اور خوبصورت معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اگر یہ اعتقاد مذہب کا کوئی جزو ہو سکتا ہے کہ انسان کو کسی برتر اور نیک ذات نے پیدا کیا ہے، تو اسی کے ساتھ یہ عقیدہ رکھنا بھی اسی حد تک ضروری ہے کہ اس ذات نے انسان کو تمام قوا اس غرض سے عطا کئے ہیں کہ وہ ان سے کام لے اور انھیں ترقی دے نہ کہ انھیں فنا اور برباد کر ڈالے، اور وہ ذات اس بات سے خوش ہوتی ہے کہ اس کے بندے اس مقصد کو پورا کرنے میں حتی الامکان کوشش کرتے ہیں اور عقل، عمل یا لطف اندوزی کی ہر صلاحیت میں کچھ نہ کچھ اضافہ کرتے ہیں۔ کمال انسانی کی ایک اور قسم بھی ہے جو کالوینی تصور سے بالکل مختلف ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسان کو اس کی فطرت اسلئے نہیں دی گئی کہ اسے ترک کردے بلکہ دوسرے مقاصد کیلئے دی گئی ہے۔ عیسائی مذہب سے قبل لوگوں میں "اظہار خودی" کا جو اصول رائج تھا، وہ انسانی ترقی کا ویسا ہی بڑا عنصر ہے جیسا عیسائی مذہب میں "خودی کو فنا کردینے"[۵۰] کا اصول۔ انسانی ترقی کا ایک یونانی نصب العین بھی ہے جس کی آمیزش افلاطون اور عیسائی مذہب کے تخیلات میں ہے لیکن جسے یہ دونوں مٹا نہیں سکے ہیں۔ آسٹی بائیڈیز[۵۱] سے جان نوکس[۵۲] ہونا

---

۵۰ مقالات اسٹرلنگ۔ ۵۱ یہ پانچویں صدی قبل مسیح میں یونان کا ایک جنرل اور سیاسی شخص ہوا ہے
۵۲ سولھویں صدی میں یہ اسکاٹلینڈ کا ایک بہت بڑا مذہبی مصلح گزرا ہے جس نے ابتدا ہی میں پروٹسٹانی مذہب کی حمایت و تبلیغ شروع کردی تھی۔ آگے چل کر اسے اپنے ملک کی فرمانروا (دیکھو صفحہ ۱۱۱)

زیادہ بہتر ہو لیکن ان دونوں سے بہتر یہ ہے کہ آدمی پیرکلیز بنے، اور اگر آجکل کوئی شخص پیرکلیز ہو تو یہ ناممکن ہے کہ اس میں جان نوکس کی تمام خوبیاں نہ ہوں۔

شخصیت کو فنا کرکے یکسانیت پیدا کرنے سے نہیں بلکہ اس کو ان حدود کے اندر ترقی اور نشوونما دینے سے ہی جو دوسروں کے حقوق و مفاد کے لحاظ سے عاید ہوتے ہیں"

(بقیہ نوٹ صفحہ ۱۱۰)

"میری کوئن آف اسکاٹس" سے سخت مخالفت کرنی پڑی جس کا میلان کاتولیکی مذہب کی طرف تھا۔ وہ ایک کاتولیک مذہب رکھنے والے شخص سے شادی کرنا چاہتی تھی جسکی وجہ سے تمام اسکاٹلینڈ کی مذہبی قسمت کی کایا پلٹ ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ جان نوکس اس شادی کا سخت مخالف تھا اور اسکے ساتھ اسکاٹلینڈ کا ایک بہت بڑا با اثر طبقہ بھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جان نوکس کی ایک تھوڑے عرصہ کی عدم موجودگی میں ملکہ کے اس جدید شوہر کو لوگوں نے قتل کر ڈالا اور اس کی جگہ ایک کمسن بچہ کو تخت پر بٹھایا۔ نوکس کی اس ہمت و دلیری سے نہ صرف یہ ہوا کہ اسکاٹلینڈ میں پروٹسٹانی مذہب کو بہت تقویت پہنچی بلکہ اس کی ذات سے اس میں بہت سے نئے خیالات کا اضافہ بھی ہوا۔ لیکن ان حالات کی وجہ سے اس کے آخری دن بہت پریشانی میں گزرے اور اسکی آخری وصیت میں یہ الفاظ اس کے قلم سے نکلے "میں اب نہایت خوش خوش رخصت ہو رہا ہوں .... اس لئے کہ دنیا مجھ سے تنگ آگئی ہے اور میں دنیا سے۔"

[1] پانچویں صدی قبل مسیح میں ایتھنز کا ایک بہت بڑا مدبر گزرا ہے جسکی ابتدائی تعلیم اور تربیت اس عہد کے بڑے بڑے اساتذہ کی صحبت میں ہوئی۔

انسان ایک نہایت اعلیٰ اور برتر ذات ہو سکتا ہے اور جیسے افعال پر ان کے کرنے والوں کے اخلاق و عادات کا بہت کچھ اثر ہوتا ہے، اسی طرح انسانی زندگی میں بھی بہت کچھ بلندی، تنوع اور تقویت اور افکار عالیہ اور جذبات لطیفہ کے لئے بہت کافی مواد پیدا ہو جاتا ہے اور فرد کا تعلق قوم کے ساتھ اور مضبوط ہو جاتا ہے اور خود اس قوم کو اس قابل بنا دیتا ہے کہ اس کا رکن ہونا قابل صد افتخار سمجھا جائے۔ جوں جوں ایک شخص کی انفرادیت ترقی کرتی جاتی ہے، اسی قدر وہ خود اپنی ذات نیز دوسروں کے لئے مفید اور کارآمد ہوتا جاتا ہے خود اس کا وجود زندگی سے زیادہ لبریز ہوگا اور جب اجزا میں زیادہ زندگی ہو تو اس کُل میں جو ان سے مرکب ہے اور زیادہ ہو گی۔ جس قدر سختی اور مزاحمت کہ فطرت انسانی کے قوی افراد کو دوسروں کے حقوق غصب کرنے سے روکنے کے لئے ضروری ہے، اُس قدر روا رکھنا تو ناگزیر ہے، لیکن اس حالت میں بھی انسانی ترقی کی صورت میں اس کا کافی صلہ موجود ہوتا ہے۔ جن ذرائع ترقی سے فرد اس وجہ سے محروم رہتا ہے کہ اسے دوسروں کو نقصان پہنچانے کا موقع نہیں ملتا، وہ زیادہ تر دوسروں کی ترقی کو کھو کر ہی حاصل ہوتے ہیں پھر خود اسے بھی اس طرح اپنی فطرت کے معاشرتی پہلو کو نشوونما دینے کا پورا موقع ملتا ہے، اور یہ ایسے کہ اس کی فطرت کے خود غرضانہ پہلو پر قیود لگ جاتی ہیں۔ دوسروں کی خاطر انصاف و عدل کے قواعد کی پابندی دوسروں کی فائدہ رسانی کا جذبہ اور قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ لیکن اگر پابندی ایسی ہو جس میں دوسروں کا نفع نہ ہو بلکہ محض ان کی ناراضگی کا خوف ہو تو اس سے بجائے کسی ایسے نفع کے ایسی عادت پیدا ہو گی جو اس پابندی کی مزاحمت کرے گی۔ جہاں اس پابندی کو تسلیم کر لیا گیا وہاں یہ تمام فطرت کو غبی اور کند بنا دیتی ہے ہر شخص کی طبیعت کو نشوونما

کا پورا موقع دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ مختلف اشخاص کو مختلف طریقوں سے زندگی بسر کرنے کی اجازت حاصل ہو۔ جس زمانہ میں یہ اصول جس قدر زیادہ مدنظر رکھا گیا ہے، اسی قدر وہ زمانہ اپنی بعد کی آنے والی نسلوں کے لئے یادگار رہا ہے، حتیٰ کہ مطلق العنان شخصی حکومت کے برے سے برے اثرات بھی اس وقت تک پیدا نہیں ہوتے جب تک اس میں انفرادیت کے نشوونما کا پورا موقع رہتا ہے اور جو شے انفرادیت کو فنا کرتی ہے، وہ مطلق العنانی ہے، خواہ اسے کسی نام سے موسوم کیا جائے اور خواہ وہ خدا کی مرضی یا انسان کے احکام کے مطابق ہونے کی مدعی کیوں نہ ہو۔

اس قدر کہنے کے بعد کہ انفرادیت اور ترقی دونوں مرادف چیزیں ہیں اور صرف انفرادیت ہی کے نشوونما سے بہترین انسان پیدا ہوتا ہے یا ہو سکتا ہے، میں چاہتا ہوں کہ یہیں پر اپنے استدلال کو ختم کر دوں، کیونکہ انسانی معاملات کی کسی حالت کے متعلق اس سے زیادہ اور اس سے بہتر کیا کہا جا سکتا ہے کہ یہ خود انسان کو اس بہترین شکل سے قریب تر کر دیتی ہے جس کا اس کی فطرت میں امکان ہے؟ یا اس سے زیادہ برائی اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ اُسے اس سے باز رکھتی ہے؟ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ یہ خیالات ان لوگوں کو قائل کرنے کے لئے کافی نہ ہوں گے جنھیں قائل کرنے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اور نیز یہ ظاہر کر دینا بھی ضروری ہے کہ ترقی یافتہ انسان غیر ترقی یافتہ لوگوں کے لئے کس قدر مفید ہیں یعنی ان لوگوں کو جنھیں آزادی کی کوئی خواہش نہیں اور نہ اُسے حاصل کرنا چاہتے ہیں یہ بتایا جائے کہ اگر وہ دوسرے لوگوں کو بلا مزاحمت اس کا استعمال کرنے دیں تو ان کو کسی نہ کسی طریقہ سے اسکا نفع ضرور پہنچ سکتا ہے۔

بہرحال سب سے پہلی بات جو میں سمجھتا ہوں وہ یہ ہوگی کہ وہ خود بھی ان سے کچھ نہ

کچھ سیکھ لیں گے۔ کوئی شخص اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ اجتہاد انسان کے معاملات میں ایک بیش بہا عنصر ہے۔ ہمیشہ ایسے اشخاص کی ضرورت رہا کرتی ہے جو نہ صرف یہی کہ نئی نئی باتیں معلوم کریں اور یہ بتائیں کہ جو باتیں پہلے حقائق سمجھی جاتی تھیں، وہ اب حقائق نہیں رہیں بلکہ ایسے اشخاص کی بھی ضرورت ہے جو نئے نئے تجربات عمل میں لائیں اور انسانی زندگی میں زیادہ روشن طریقۂ کار اور زیادہ بہتر مذاق اور جذبات کی مثال قایم کریں۔ کوئی شخص جو اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ دنیا نے ابھی اپنے تمام طریقوں اور کاموں میں کمال حاصل نہیں کیا ہے، اس بات سے آسانی کے ساتھ انکار نہیں کرسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ یہ فائدہ ہر ایک سے یکساں نہیں پہنچ سکتا۔ تمام نوع انسان میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کے تجربات کی اگر دوسرے لوگ پیروی کریں، تو ان سے حالات ماقبل میں کوئی بہتری ہو سکے لیکن یہ چند ہستیاں وہ بے بہا موتی ہیں، جن کے بغیر انسانی زندگی کی قدر و قیمت نہیں رہتی۔ یہ صرف وہی لوگ نہیں ہیں جو اچھی اچھی باتوں کے موجد ہوتے ہیں، بلکہ یہ وہ لوگ بھی ہیں جو ان چیزوں میں جو پہلے سے ہیں، زندگی قایم رکھتے ہیں۔ اگر کوئی نئی بات کرنے کو باقی نہ ہو، تو کیا انسانی دماغ کی ضرورت سرے سے موقوف ہو جائے گی؟ کیا یہ کوئی دانشمندی ہوگی کہ وہ لوگ جو پرانی باتیں کرتے ہیں، اس بات پر غور و فکر کرنا ترک کردیں کہ وہ کیوں انھیں کرتے ہیں اور انھیں انسانوں کی بجائے حیوانوں کی طرح کرنے لگیں؟ بہتر سے بہتر عقائد اور اعمال میں یہ میلان شدت سے موجود ہوتا ہے کہ وہ محض رسمی بن جائیں اور تاوقتیکہ یکے بعد دیگرے ایسے اشخاص پیدا نہ ہوں جن کی زبردست قوت اجتہاد ان عقائد اور اعمال کے دلائل کو رسمی ہونے سے محفوظ رکھے، اس قسم کا بیجان مادہ کسی حقیقی زندہ شے کے ہلکے سے ہلکے صدمہ کا بھی تحمل نہیں کرسکتا اور کوئی وجہ نہیں کہ تہذیب و تمدن اسی طرح فنا ہو جائیں

جیسے بازنطینی سلطنت میں۔ یہ صحیح ہے کہ مجتہد اور ذکی لوگ ہمیشہ قلیل تعداد میں ہوتے ہیں لیکن ان کے وجود کو باقی رکھنے کے لیے ضرورت ہے کہ اس زمین کی ہمیشہ داشت ہوتی رہے جس میں وہ پیدا ہوتے ہیں۔ ذکاوت صرف آزادی ہی کی فضا میں زندہ رہ سکتی ہے۔ ذکی اشخاص (جیسا کہ خود لفظ سے ظاہر ہے) میں بہ نسبت اور دوسرے لوگوں کے انفرادیت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان میں اس کی صلاحیت بہت کم ہوتی ہے کہ وہ جماعت کے کسی ایسے چھوٹے سے خانہ میں بلا کسی زحمت و ضرر کے سما سکیں جنھیں وہ اس غرض سے بناتی ہے کہ افراد اپنی سیرت آپ بنانے کی زحمت سے محفوظ رہیں۔ اگر وہ کم ہمتی کی وجہ سے ان خانوں میں سے کسی ایک میں ٹھونس دیے گئے اور انھوں نے اپنے ان قوا کو نشو و نما پانے کا موقع نہ دیا جو دباؤ کے اندر رہکر بڑھ نہیں سکتے، تو جماعت کو انکی قوت خداداد سے کچھ بھی فائدہ نہ پہونچے گا۔ لیکن اگر وہ مضبوط اخلاق کے ہیں اور انہوں نے ان زنجیروں کو توڑ دیا تو وہ اس جماعت کیلئے ایک ہدف ملامت بنجاتے ہیں جو انھیں عام آدمیوں کی طرح نہ بنا سکی اور ہر شخص نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ انھیں وحشی، دیوانہ کہنے لگتا ہے۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ شکایت کرے کہ دریائے نائیگرا[1] ہالینڈ کی کسی نہر کی طرح سکون اور آہستگی کے ساتھ اپنے پاٹ کے اندر کیوں نہیں بہتا؟

---

[1] دریائے نائیگرا شمالی امریکہ میں ایک دریا ہے جو اپنے نہایت بلند اور خوبصورت آبشار کی وجہ سے نہ صرف دنیا کے تمام دریاؤں میں مشہور ہے بلکہ ہر سال ۱۰، ۱۲ لاکھ انسانوں کا تماشا گاہ بھی رہتا ہے۔ یہ ایک بہت لمبا دریا ہے جس میں صرف تھوڑا سا حصہ اس قابل ہے کہ کشتی رانی ہو سکے، باقی تمام تر حصہ میں بڑے بڑے نشیب و فراز آتے ہیں۔ ایک مقام پر اس کا پانی بلندی سے اور ایک کثیر مقدار میں گرتا ہے جسکے دیکھنے کے لیے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ برعکس اس کے ہالینڈ کی سرزمین سطح سمندر سے بہت نیچی ہے۔ یہاں مصنوعی بند نہ ہوتے تو سارا ملک تہ آب ہو جاتا۔

لہذا مجھے اس قوت خداداد کی اہمیت پر اصرار ہے اور بہت زیادہ اصرار ہے، اور ضرورت ہے کہ اس قوت کو خیال اور عمل دونوں میں نہایت آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا موقع دیا جائے۔ میں اس امر سے بخوبی واقف ہوں کہ کوئی شخص اصولاً اس سے ہرگز انکار نہ کرے گا لیکن ساتھ ہی اس کے میں اس سے بھی واقف ہوں کہ عمل میں تقریباً ہر شخص اس سے بالکل بے توجہی برتتا ہے۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ خداداد قوت ایک بہتر شے ہے اگر یہ کسی شخص کو ایک پُر جوش نظم لکھنے یا ایک عمدہ تصویر بنانے میں مدد دیتی ہے۔ لیکن صحیح معنوں میں خیال اور عمل میں قوت اجتہاد کے متعلق اگرچہ کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ یہ ایسی چیز نہیں ہے جس کی تعریف نہ کی جائے لیکن سب لوگ دل ہی دل میں یہ خیال رکھتے ہیں کہ وہ اس کے بغیر اپنا کام چلا سکتے ہیں۔ بدقسمتی سے یہ اس قدر قدرتی امر ہے کہ اس پر حیرت تک نہیں ہوتی۔ قوت اجتہاد ایک ایسی چیز ہے جس کا فائدہ غیر مجتہدانہ دماغ محسوس ہی نہیں کر سکتے۔ وہ نہیں سمجھ سکتے کہ انھیں اس سے کیا کام لینا چاہیے اور وہ بھلا سمجھ ہی کیونکر سکتے ہیں؟ اگر وہ یہ سمجھ سکتے کہ یہ ان کے کسی کام آسکتی ہے، تو یہ قوت اجتہاد ہی نہ ہوتی۔ سب سے پہلی خدمت جو قوت اجتہاد ان کے لئے انجام دے سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ ان کی آنکھوں کو کھول دے اور یہ اگر ایک بار بھی پورے طور پر ہو جائے تو پھر انھیں خود مجتہد ہونے کا موقع ملے۔ اسی اثنا میں یہ خیال کر کے کہ دنیا میں اب تک کوئی کام ایسا نہیں ہوا ہے، جسے سب سے پہلے کسی نے نکیا ہو اور دنیا میں جتنی بہتر چیزیں موجود ہیں، وہ سب قوت اجتہاد ہی کا نتیجہ ہیں، انھیں تسلیم کرنا چاہیے کہ ابھی اسے کچھ اور کرنا باقی ہے اور انھیں یقین رکھنا چاہیے کہ انھیں اس کمی کا جس قدر کم احساس ہو، اسی قدر انھیں اس کی اور ضرورت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حقیقی یا فرضی دماغی عظمت کی خواہ کسی قدر عزت سمجھی جائے یا کی جائے دنیا کا عام میلان یہی ہے کہ انسانوں میں متوسط درجہ کے لوگوں کو تفوق دیا جائے۔ قدیم زمانہ اور قرونِ وسطیٰ میں اور اس سے کچھ کم منصب[1] داری عہد سے لیکر آج تک فرد کو اپنی جگہ پر ہمیشہ قوت و استحکام حاصل رہا ہے۔ اور اگر اس میں کوئی غیر معمولی قابلیت ہوئی یا معاشرتی حیثیت سے وہ کسی بلند درجہ پر ہوا تو پھر اسے بہت زیادہ قوت و استحکام حاصل ہو جاتا تھا۔ آجکل تو افراد جماعتوں میں گم ہو گئے ہیں۔ سیاست میں یہ تو کہنا ایک معمولی سی بات ہو گئی ہے کہ اب دنیا پر رائے عامہ کی حکمرانی ہے۔ اگر کسی طاقت کو طاقت کہہ سکتے ہیں تو وہ عوام کی ہے اور حکومتوں کی کہ وہ خود کو عوام کی مرضی و میلانات کا ترجمان بنائے رہتی ہیں۔ یہ بھی زندگی کے اخلاقی اور معاشرتی مسائل میں بھی اسی قدر درست ہے، جس قدر عام معاملات میں۔ جن لوگوں کی رائیں رائے عامہ کے نام سے مشہور ہوتی ہیں، وہ ہمیشہ ایک سے لوگ نہیں ہوتے۔ امریکہ میں وہ کل کی کل گوری آبادی ہے اور انگلستان میں یہ خاص کر متوسط طبقہ کے لوگ ہیں

---

[1] یورپ کے ازمنۂ وسطیٰ میں جب شہنشاہیت بہت کمزور پڑ گئی اور شمال کی جانب سے جرمن قوموں کے حملے شروع ہوئے، تو بہت سے لوگوں نے اپنی عزیز جان کو خطرے میں دیکھکر خود کو کسی صاحبِ قوت زمیندار کے سپرد کر دیا تاکہ وہ اُس کے سایہ میں ہر طرح کے خطرات سے محفوظ رہ سکیں اور اس صلہ میں زمینداری سے متعلق جو خدمات ہوں، وہ انجام دیتا رہے۔ اس نظامِ معاشرت کو انگریزی میں 'فیوڈل سسٹم' یا اردو میں منصب داری کہتے ہیں۔ یہ نظام اپنی نوعیت کے لحاظ سے قرونِ وسطیٰ کی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتا ہے، اس میں زمیندار اور رعایا کے تعلقات ایک آقا اور زر خرید غلام سے بھی زیادہ سخت ہوتے تھے۔ کاشتکار زمین کے ساتھ بالکل وابستہ ہوتا تھا۔ اگر کسی زمیندار کے ہاتھ سے زمین نکلتی تو اس کے ساتھ اس سے متعلقہ کاشتکاران بھی دوسرے کے ہاتھ منتقل ہو جاتے تھے۔

لیکن یہ ہوتے ہیں ہمیشہ ایک جماعت کثیر یعنی اوسط درجہ کے لوگوں کی ایک متحدہ جماعت اور جو اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے وہ یہ کہ عوام اپنی رائے کلیسا یا ریاست کے عہدہ داران سے حاصل نہیں کرتے نہ بڑے بڑے رہنماؤں یا کتابوں سے۔ ان کی طرف سے غور و فکر کرنے کا کام اکثر ایسے لوگ کرتے ہیں جو زیادہ تر انھی جیسے ہوتے ہیں اور وہ اپنے خیالات تقریر یا بوقت ضرورت فوری طور پر اخبارات کے ذریعہ ظاہر کر دیتے ہیں۔ میں ان تمام باتوں کی کوئی شکایت نہیں کر رہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انسانی دماغ کی موجودہ پستی میں عام حیثیت سے کوئی چیز اس سے بہتر ممکن ہے۔ لیکن اس سے اس بات میں کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا کہ اوسط درجہ کے لوگوں کی حکومت اوسط ہی درجہ کی چیز ہے جمہور کی حکومت یا بہت سے اشراف کی حکومت، اپنے سیاسی افعال کے لحاظ سے یا ان رایوں، خاصیتوں یا نوعیت دماغ کے اعتبار سے جو وہ پیدا کرتی ہے، کبھی معمولی درجہ سے آگے بڑھی اور نہ بڑھ سکتی ہے، سوائے اس حالت کے کہ حکمراں لوگوں کی ایک کثیر جماعت نے کسی ایک یا چند اشخاص کی رائے اور اثر سے جو انھوں نے اپنے بہتر زمانوں میں ہمیشہ کیا ہے) جو ان سے بہت زیادہ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار ہوں۔ تمام معقول اور بہتر باتوں کی ابتدا ہمیشہ افراد سے ہوتی ہے اور ہونی چاہیے اور وہ بھی عموماً سب سے پہلے کسی ایک فرد سے معمولی درجہ کے آدمی کا سب سے بڑا اعزاز اور اس کی کامیابی یہ ہے کہ وہ اس ابتدا کی اتباع کرے اور یہ ظاہر کرے کہ وہ اپنے دل میں ان معقول اور عمدہ باتوں کی دل سے اتباع کر سکتا ہے اور وہ ان تک آنکھیں کھولکر کھنچ سکتا ہے۔ میں اس "رجال پرستی" کی قسم سے کسی چیز کی حمایت نہیں کر رہا ہوں جو قوی صاحب اجتہاد آدمی کی اس بات کی تعریف کرتی ہے کہ وہ دنیا کی حکومت پر بہ جبر قابض ہو گیا ہے اور اسے اپنے احکام

کی پیروی کرنے پر مجبور کر سکتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ وہ جس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے وہ یہ کہ اسے راہ بتا دینے کی آزادی ملجائے۔ دوسروں کو مجبور کرنے کا اختیار تمام قوائے انسانی کی ترقی و آزادی ہی کے منافی نہیں ہے بلکہ خود اس شخص کے لئے بھی مضر ہے۔ بہرحال معلوم یہ ہوتا ہے کہ جب معمولی درجہ کے لوگوں کی عام رائیں ہر جگہ غالب ہو گئی ہوں یا ہو رہی ہو تو اس میلان کا علاج اور ردّ یہی ہے کہ ان لوگوں کی انفرادیت اور بھی بڑھے جو خیالات کے بلند درجہ پر ہیں، بالخصوص ایسے ہی حالات میں بعض غیر معمولی افراد کو بجائے اس کے کہ روکا جائے، عوام سے جداگانہ طرز عمل اختیار کرنے کے لئے ان کی اور ہمت افزائی کرنی چاہئیے۔ دوسرے حالات میں ان کے ایسا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہے تاوقتیکہ وہ نہ صرف یہ کہ کسی جداگانہ روش پر چلیں بلکہ کوئی بہتر طرز عمل بھی اختیار کریں۔ اس زمانہ میں تو عدم اتباع کی صرف مثال قایم کر دینی یا رسم و رواج کے سامنے گھٹنے ٹیک دینے سے انکار کر دینا ہی ایک بہت بڑی خدمت ہے، اس لئے کہ رائے کا ایسا گہرا اثر ہے کہ تنوع عمل موجب لعنت و ملامت ہو گیا ہے، چنانچہ اس اثر کو توڑنے کے لئے مناسب یہی ہے کہ لوگ خبطی ہوں۔ جس زمانہ میں اور جہاں کہیں مضبوطیِ اخلاق کا وجود رہا ہے، وہاں ہمیشہ خبط بھی پایا گیا ہے اور جس جماعت میں جس قدر ذہانت، قوت دماغی اور جرأتِ اخلاقی رہی ہے، اسی قدر اس میں خبط بھی رہا ہے۔ یہ بات کہ آج کل لوگ خبطی ہونے کی بہت کم جرأت کرتے ہیں، اس زمانہ کا سب سے بڑا خطرہ ہے۔

میں یہ کہہ چکا ہوں کہ ان کاموں کے کرنے کیلئے جن کا عام رواج نہیں ہے، حتی الامکان پورا موقع دینا چاہئیے تاکہ آیندہ یہ معلوم ہو سکے کہ ان میں سے کون سے ایسے کام ہیں جو رسم و رواج بننے کی زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ لیکن آزادی عمل اور رسم

رواج سے بے نیازی صرف اس لئے قابل ہمت افزائی نہیں ہے کہ ان سے بہتر قسم کے کام اور زیادہ پسندیدہ دستور نکل سکتے ہیں، اور صرف دماغی حیثیت سے اعلیٰ قابلیت کے اشخاص ہی کو اپنی زندگی اپنے طریقہ پر بسر کرنے کا سب سے زیادہ حق نہیں ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ تمام انسان کسی ایک یا چند نمونوں پر ڈھالے جائیں۔ اگر کسی شخص میں معمولی سمجھ اور تجربہ ہو، تو اس کی اپنی زندگی بسر کرنے کا اپنا طریقہ سب سے بہتر ہے، اس وجہ سے نہیں کہ یہ بذات خود کوئی بہتر طریقہ ہے بلکہ اس سبب سے کہ اس کا اپنا طریقہ ہے۔ انسان بھیڑ بکریوں کی طرح نہیں ہیں اور بھیڑ بکریاں بھی باہم اس قدر مشابہ نہیں ہوتیں کہ ایک دوسرے سے پہچانی نہ جاسکیں۔ کسی شخص کو کوٹ یا جوتہ ہر وقت ایسا نہیں مل سکتا جو اس کو ٹھیک آئے، تاوقتیکہ وہ اس کے ناپ کے نہ بنے ہوں، یا اس کے سامنے پورا کارخانہ نہ ہو جس میں سے وہ اپنے ناپ کا چن لے، تو کیا یہ کوٹ یا جوتے کے ملنے سے بھی زیادہ آسان ہے کہ انسان کو زندگی اپنے مطابق ہمیشہ مل جائے؟ یا کیا انسان اپنے پاؤں کی مشابہت سے بھی زیادہ اپنے کل جسم اور روح کے اعتبار سے یکسانیت رکھتا ہے؟ اگر یہ صحیح ہے کہ لوگ مختلف مذاق کے ہوتے ہیں، تو بس یہی اس بات کے لئے کافی وجہ ہے کہ تمام انسانوں کو ایک سانچے میں نہ ڈھالا جائے، بلکہ مختلف اشخاص کو اپنی روحانی ترقی کے لئے مختلف حالات کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ اسی طرح ایک قسم کے اخلاقی ماحول میں بخوبی زندہ نہیں رہ سکتے جس طرح ہر قسم کے پودے ایک سی طبعی فضا اور آب و ہوا کے اندر نشو و نما نہیں پا سکتے ہیں۔ وہی چیزیں جو ایک شخص کے لئے اس کی اعلیٰ فطرت کے نشو و نما میں ممد و معاون ہوتی ہیں، وہی دوسرے کی راہ کا روڑا بن جاتی ہیں۔ ایک ہی طرز زندگی ایک شخص کے لئے مفید اور سود مند

ثابت ہوتی ہے اور اس سے اس کے عمل اور لطف اندوزی کے تمام قوا میں نظم و ترتیب رہتی ہے لیکن دوسرے کے لئے وہی طرز زندگی پاؤں کی بیڑی بن جاتی ہے جس سے اس کی تمام اندرونی زندگی معطل اور تباہ ہو جاتی ہے۔ انسان کے ذرائع خوشی اور احساسات رنج میں اس قدر اختلافات ہیں اور اس پر مختلف طبیعی اور اخلاقی قوتوں کا اس قدر اثر ہوتا ہے کہ جب تک ان کے طرز زندگی میں اسی قدر تنوع نہ ہو اُس وقت تک وہ نہ تو مسرت و خوشی میں کافی حصہ لے سکتے ہیں اور نہ وہ ذہنی، اخلاقی اور جمالی حیثیت سے اس معیار تک پہنچ سکتے ہیں، جہاں تک کہ ان کے طبائع کو پہنچنا چاہیئے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ رواداری کا دائرہ جہاں تک عام جذبات کا تعلق ہے، صرف اس مذاق اور طریقہ زندگی ہی تک وسیع کیا جائے جس پر ہزارہا اشخاص کو بہ جبر آمادہ کیا جاتا ہے؟ کہیں بھی ایسا نہیں ہے، بجز بعض خانقاہوں کے، جہاں اختلاف مذاق بالکل تسلیم نہ کیا جاتا ہو، ایک شخص بلا شرکت غیرے کشتی چلانا، سگریٹ پینا، گانا، بجانا، ورزش کرنا، تاش یا گنجفہ کھیلنا، لکھنا پڑھنا ان میں سے جس مشغلہ کو چاہے اختیار کر سکتا ہے اور جس مشغلہ کو چاہے ترک کر سکتا ہے اس لئے وہ لوگ جو ان چیزوں کو پسند کرتے ہیں اور وہ جو ناپسند کرتے ہیں، تعداد میں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان پر کسی قسم کا جبر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن وہ مرد اور اس سے زیادہ وہ عورت جن پر یہ الزام عاید ہو سکتا ہے کہ وہ ایسی باتیں کرتے ہیں "جسے دوسرا کوئی شخص نہیں کرتا" یا وہ ایسی باتیں نہیں کرتے "جسے ہر شخص کرتا ہے" انھیں لعن طعن کا ایسا نشانہ بنا لیا جاتا ہے گویا کہ انھوں نے کوئی سخت اخلاقی جرم کیا ہے۔ جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں کسی قدر اپنی مرضی کے مطابق بلا ان کی عزت پر آنچ آئے ہوئے کام کرنے کی اجازت ہو، ان کے لئے ضرورت ہے کہ کوئی خطاب رکھتے ہوں یا امتیاز یا امتیاز

رکھنے والوں میں اُن کا خیال کیا جاتا ہو۔ کسی قدر کو میں پھر دوبارہ کہنا چاہتا ہوں، اس لئے کہ جو لوگ اس آزادی سے زیادہ فائدہ اُٹھاتے ہیں، تو یہی نہیں کہ انھیں بُرا بھلا کہا جاتا ہے بلکہ اس سے بڑے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے، ان کے لئے خطرہ ہوتا ہے کہ وہ کہیں پاگلوں کے قانون کے ماتحت نہ آجائیں اور انکی تمام جائداد اور املاک ان سے لیکر ان کے اعزہ کو نہ دیدی جائے۔

آجکل کی رائے عامہ کے میلان کی ایک خاص خصوصیت ہے جو انفرادیت کے کسی نمایاں اظہار پر سخت ناپسندیدگی کے اظہار کا باعث ہوتی ہے۔ لوگوں کی عام حالت یہی نہیں ہے کہ وہ ذہنی حیثیت سے ادنی درجہ پر ہوں بلکہ اپنے میلانات اور رجحانات کے اعتبار سے بھی کم درجہ پر ہیں، ان میں کوئی زبردست ذوق یا خواہش نہیں ہوتی جو انھیں کسی غیر معمولی کام کرنے پر مائل کرے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان لوگوں کی حالت کو بھی نہیں سمجھتے جن میں یہ باتیں موجود ہوتی ہیں اور انہیں وحشی و دیوانہ سمجھتے اور ہمیشہ بہ نظر استحقار دیکھتے ہیں۔ بہرحال اس حالت کے علاوہ جو عام طور پر پائی جاتی ہے، اگر ہم یہ فرض کریں کہ اخلاق کی اصلاح کے لئے ایک زبردست تحریک شروع ہوئی ہے اور طریقہ زندگی کے یکساں بنانے اور مقررہ حدود سے آگے نہ بڑھنے پر بہت کچھ زور دیا جارہا ہے اور ایک ہی خواہی خلق کا جذبہ بھی موجود ہے جس کے لئے انسان کے اخلاقی اور امتیازی ترقی کے میدان سے بڑھکر اور کوئی شعبہ نظر نہیں آتا۔ آج کل کے ان میلانات کی بنا پر پہلے سے کہیں زیادہ اندیشہ ہے کہ لوگوں کے لئے زندگی کے عام قواعد بنا دئے جائیں اور کوشش کی جائے کہ ہر ایک اسی مقررہ معیار کے مطابق عمل کرے۔ اور یہ معیار خواہ ظاہر ہو یا مخفی یہ ہے کہ کسی چیز کی زبردست خواہش پیدا نہو۔ اس کی سیرت کا سب سے بڑا نصب العین یہ ہے کہ کوئی خاص سیرت ہی نہ ہو، اور جیسے عورتوں کا

کے پیروں کی طرح طبع انسانی کے ہر ایک پہلو کو جو ذرا بھی نمایاں نظر آتا ہو دبا کر بیکار کر دیا جائے تاکہ کوئی شخص عام انسانوں سے غیر مشابہ نظر نہ آنے لگے۔

جیسا کہ اکثر اعلیٰ نصب العین پیش نظر رکھنے کی صورت میں ہوتا ہے کہ پسندیدہ چیز کا نصف حصہ نظر انداز ہو جاتا ہے، اسی طرح پسندیدگی کے اس موجودہ معیار نے بھی صرف دوسرے نصف حصہ کا نہایت گھٹیا چربہ پیش کیا ہے۔ بجائے اس کے کہ مضبوط قوتیں ہوں جنکی قوی عقل رہنمائی کرے اور قوی جذبات ہوں جن پر ضمیر اور ارادہ کا تسلط ہو اس معیار موجودہ کا نتیجہ کمزور جذبات اور کمزور قوتیں ہیں جس میں نہ ارادہ کی قوت ہے نہ عقل و فہم کی اور جو اس وجہ سے قانون مقررہ کی ظاہری پابندی کرتے رہتے ہیں۔ کسی بڑے پیمانہ پر قوت سے کام کرنے والی سیرتیں اب محض قصہ کہانی ہو رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں اب سوائے تجارت کی قوت و طاقت کے استعمال کے لئے مشکل سے اور کوئی کام باقی رہ گیا ہے۔ البتہ اس میں جو قوت و طاقت صرف کی جاتی ہے وہ خاصی ہے۔ اس سے جو کچھ بچ رہتی ہے، وہ کسی مخصوص شغل اور دلچسپی کے کام میں خرچ ہوتی ہے جو ممکن ہے بنی نوع کیلئے کسی حد تک مفید بھی ہو لیکن وہ ہمیشہ کوئی ایک شئے ہوتی ہے اور وہ بھی عموماً چھوٹی اور معمولی ہوتی ہے۔ انگلستان کی تمام عظمت و شوکت اب اس کی اجتماعی زندگی میں باقی رہ گئی ہے، انفرادی حیثیت سے وہ بہت حقیر اور ادنیٰ درجہ پر ہے ہم اگر کسی بڑے کام کے کرنے کے اہل معلوم ہوتے ہیں تو اپنی اجتماعی زندگی کی وجہ سے، اور اس پر ہمارے اخلاقی اور مذہبی مصلحین بالکل قانع نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ کچھ اور ہی قسم کے لوگ تھے جنھوں نے انگلستان کی گزشتہ شوکت و عظمت کو قائم کیا اور اب اسکو زوال و انحطاط سے بچانے کے لئے بھی اور ہی قسم کے لوگوں کی ضرورت ہے۔

رسم ورواج کا استبداد انسانی ترقی کی راہ میں ہر جگہ حائل ہے اور یہ ہمیشہ اس خواہش کے خلاف نظر آتا ہے جو رسم ورواج سے بہتر شے پیدا کرنا چاہتی ہے اور جسے مختلف حالات کے مطابق جذبہ آزادی یا ترقی کے مختلف ناموں سے موسوم کرتے ہیں۔ ترقی کی خواہش ہمیشہ آزادی کے جذبہ کی مُرادف نہیں ہوا کرتی اس لئے کہ ترقی ایسے لوگوں میں بہ جبر بھی ممکن ہو سکتی ہے جو اس کے خواہش مند نہ ہوں، اور آزادی کا جذبہ جب تک کہ وہ ان کوششوں کے مخالف ہوتا ہے، اس وقت تک وہ مقامی اور عارضی طور پر ان مخالفین ترقی کے ساتھ رہتا ہے، لیکن ترقی کا واحد اور مستقل ذریعہ آزادی ہی ہے اس لئے کہ اس کے ساتھ ترقی کے اسی قدر مستقل مرکز ہوتے ہیں جس قدر کہ افراد کا وجود ہوتا ہے۔ بہر حال خواہ آزادی کا جذبہ ہو یا اصلاح کا، ہر دو صورتوں میں ترقی کا اصول رسم ورواج کی حکومت کے خلاف آن پڑتا ہے جس میں کم سے کم اس کے جوئے سے چھٹکارا حاصل کرنا تو بہر صورت ہوتا ہی اور ان ہی دونوں کی کشمکش میں تاریخ انسانی کی خاص دلچسپی کا مرکز ہے۔ اگر سچ پوچھئے تو دنیا کے سواد اعظم کی کوئی تاریخ نہیں ہوتی، اس لئے کہ وہاں رسم ورواج کا پورا تسلط ہوتا ہے۔ تمام مشرق کی یہی حالت ہے۔ وہاں ہر معاملہ میں رسم ورواج کا فیصلہ آخری ہوتا ہے، انصاف اور حق کے معنی یہ ہیں کہ وہ رسم ورواج کے مطابق ہوں، رسم ورواج کے استدلال کی کوئی شخص سوائے اس کے کہ وہ کوئی متبدنشہ طاقت میں چور ہو، مخالفت کرنے کی جرأت نہیں کرتا، اس کا نتیجہ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں۔ ان قوموں کے اندر کسی زمانہ میں قوت اجتہاد ضرور رہی ہوگی، یہ کہیں زمین میں سے آباد، پڑھی لکھی، علوم و فنون کی حامل تو پیدا ہوئی نہ تھیں، بلکہ یہ سب چیزیں انھوں نے خود پیدا کیں اور اس کے بعد وہ دنیا کی سب سے بڑی اور طاقت ور قومیں بنیں۔ لیکن اب انکی کیا حالت ہے؟ یہ

اب ان قبائل کی محکوم اور رعایا ہیں جن کے آباؤ اجداد اس وقت جنگلوں میں مارے مارے پھرتے تھے جب کہ ان کے بزرگ عالیشان محلات میں رہتے اور شاندار معابد میں عبادتیں کرتے تھے۔ وجہ اسکی یہ تھی کہ ان میں رسم ورواج کے تسلط کے ساتھ ساتھ آزادی اور ترقی کا جذبہ موجزن تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک قوم کچھ عرصہ تک ترقی کرتی ہے اور اس کے بعد پھر رک جاتی ہے' اور یہ کب رکتی ہے؟ اسوقت جب کہ اس میں انفرادیت باقی نہیں رہتی۔ اگر اسی قسم کی کوئی تبدیلی یورپ کی اقوام میں ہو' تو وہ بالکل اسی طرح کی نہ ہوگی' ان قوموں میں رسم ورواج کی استبدادیت جن کا انھیں بھی ہر وقت خطرہ لگا رہتا ہے' بالکل ہی جمود افزا نہیں ہے۔ ان میں یگانہ پن تو منع ہے لیکن تبدیلی ممنوع نہیں ہے بشرطیکہ سب میں ایک ساتھ تغیر پیدا ہو۔ ہم نے اپنے آباؤ اجداد کی مخصوص پوشاک تو ترک کر دی ہے' پھر بھی ہر شخص کو اپنا لباس دوسروں کی طرح رکھنا ضروری ہے لیکن فیشن ممکن ہے سال میں ایک یا دو مرتبہ بدل جائے۔ ہمیں یہ خیال ہوتا ہے کہ جب کبھی کوئی تغیر ہو۔ تو یہ تغیر کی خاطر تغیر ہو' نہ کہ کسی حسن یا آسائش کے خیال سے' اس لئے کہ حسن اور آسائش کا ایک خیال تمام دنیا میں ایک ہی ساتھ پیدا نہ ہوگا اور نہ دوسرے وقت میں ایک ساتھ مل کر اسے مسترد کر دیں گے لیکن ہم میں ترقی بھی ہے اور تغیر بھی ہم ہمیشہ آلات اور مشینوں میں نئی نئی اختراعات کرتے ہیں اور اس وقت تک ان پر قائم رہتے ہیں جب تک کہ دوسرا ان سے بہتر ایجاد نہیں کر لیتا۔ ہم سیاسیات میں' تعلیم میں حتی کہ اخلاق میں بھی ترقی کے خواہاں ہیں اگرچہ اس موخرالذکر شعبہ میں ہمارے نزدیک ترقی کا سب سے بڑا تخیل یہ ہے کہ دوسروں کو بھی ویسا ہی نیک بننے کی ترغیب دی جائے یا اس کے لئے انھیں مجبور کیا جائے' جیسے ہم خود ہیں۔ ہمیں ترقی پر اعتراض نہیں ہے بلکہ

برعکس اسکے ہم تو اپنے تمئیں یہ سمجھتے ہیں کہ ہم دنیا میں سب سے زیادہ ترقی کرنے والی قوم ہیں، وہ چیز دراصل انفرادیت ہے جس سے ہم برسرپیکار ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہم سب یکساں ہوتے تو ہم نے دنیا میں عجیب وغریب کام کئے ہوتے حالانکہ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ ایک شخص کی دوسرے شخص سے عدم مشابہت ہی سب سے پہلے اپنی اپنی جگہ پر یہ خیال دل میں پیدا کرتی ہے کہ ان میں سے ہر ایک میں کیا عیب ونقص ہے، اور دوسرے کی خوبی یا کمال کیونکر حاصل ہو سکتا ہے، یا اگر ممکن ہو تو دونوں کی اچھی باتوں کو لے کر ایک تیسری صورت کیونکر پیدا کی جا سکتی ہے جو ان دونوں سے بہتر ہو۔ ہمارے سامنے چین کی ایک عبرت انگیز مثال موجود ہے، اس قوم کے اندر بہت کافی قدرتی ذہانت اور بعض لحاظ سے عقل ودانش بھی موجود ہے، اس کا سبب یہ ہے کہ خوش قسمتی سے بہت عرصہ پہلے ان میں کچھ اچھے دستور جاری تھے جو بہت حد تک ان اشخاص کے ایجاد کردہ تھے جنھیں بڑے بڑے روشن دماغ اہل یورپ کو بھی رشی اور فلسفی کا لقب دینا پڑتا ہے۔ یہ بات بھی قابل لحاظ ہے کہ ان کے پاس ایسے اسباب موجود ہیں کہ وہ اپنی عقل وفہم کا اثر اپنی قوم کے ہر دماغ پر ڈال سکتے ہیں اور جن لوگوں نے یہ اثر زیادہ سے زیادہ قبول کیا ہے، ان کو وہ عزت اور طاقت کی مسند پر جگہ دیتے ہیں جس قوم میں یہ بات ہے اس نے یقیناً انسانی ترقی کے اسرار کو معلوم کر لیا ہے اور ضروری ہے کہ وہ تحریک عالم میں سب سے پیش پیش رہتی۔ لیکن برخلاف اس کے اب ان میں سکون اور جمود آگیا ہے اور ان کی یہ حالت ہزارہا سال سے ہے اور اگر ان میں کبھی ترقی پیدا ہو سکتی ہے تو وہ غیر ملکی لوگوں کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ انھیں اس بات میں خلاف امید کامیابی ہوئی ہے جس کے لئے انگریز مصلحین اس قدر

جانفشانی سے کام لے رہے ہیں، یعنی یہ کہ قوم کی قوم کو (عادات واطوار کے لحاظ سے) یکساں کر دیں ایک ہی قسم کے اصول و قواعد ان کے خیالات اور ان کے عادات واطوار کی رہنمائی کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہم خود اپنی آنکھوں سے سامنے دیکھ رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں رائے عامہ کا تسلط ایک غیر منظم صورت میں بالکل وہی ہے جو آج چین کے تعلیمی اور سیاسی نظام کے اندر باقاعدہ صورت میں موجود ہے اور تاوقتیکہ انفرادیت لوگوں کو اس جوئے سے نہ نکالے گی، یورپ کی حالت باوجود اپنے شاندار ماضی اور عیسائی مذہب رکھنے کے چین کی سی ہوتی جائیگی۔

لیکن کس چیز نے یورپ کو اب تک اس مصیبت سے بچایا ہے؟ کس چیز نے یورپ کی ان قوموں کو ایک ساکت اور جامد حصہ آبادی کی بجائے ایک ترقی پذیر حصہ بنایا ہے؟ یہ شئے خود ان کی کوئی اعلیٰ قابلیت نہیں ہے اور اگر ہے بھی تو وہ بطور نتیجہ کے ہے نہ کہ بحیثیت ایک علت کے، بلکہ یہ شئے ان کے اخلاق و تمدن کا حیرت انگیز اختلاف و تنوع ہے۔ افراد، جماعتیں اور قومیں سب کی سب ہمیشہ باہم ایک دوسرے سے غیر مشابہ اور غیر مماثل رہی ہیں، انھوں نے اپنے اپنے لئے مختلف راستے نکالے ہیں اور جن میں سے ہر ایک کسی نہ کسی بہتر نتیجہ پر پہنچتا ہے اور اگرچہ انھوں نے تقریباً ہر زمانہ میں ایک دوسرے کے ساتھ عدم رواداری کا ثبوت رکھا ہے اور ہر ایک نے یہ خیال کیا ہے کہ اگر دوسرے بھی اسی کے نقش قدم پر چلنے کے لئے مجبور کئے جاتے تو بہتر تھا، تاہم ان کی ان کوششوں کو شاذ ونادر ہی کبھی کوئی مستقل کامیابی نصیب ہوئی ہے بلکہ ان میں سے ہر ایک نے ان باتوں سے فائدہ اٹھایا ہے جو دوسروں نے پیش کی ہیں۔ میرے خیال میں یورپ کی ترقی اور اس کے ہر شعبہ زندگی کے

نشو ونما پانے کا سب سے بڑا سبب راہوں کا یہی اختلاف اور تنوع ہے لیکن اس وقت یورپ میں یہ خوبی کم ہونا شروع ہوگئی ہے اور صاف معلوم ہو رہا ہے کہ وہ چینیوں کی طرح تمام لوگوں میں یکسانیت اور مشابہت پیدا کرنے کی طرف قدم بڑھا رہا ہے۔ ایم۔ دو توکوئی ویلے نے اپنی سب سے اہم آخری تصنیف میں لکھا ہے کہ آج کل کے فرانسیسی باہم ایک دوسرے سے اس قدر مشابہ نظر آتے ہیں جتنے کہ گزشتہ نسل کے بھی نہیں تھے۔ یہی بات آج انگریزوں کے متعلق بھی اس سے کہیں زیادہ صحیح طور پر کہی جا سکتی ہے۔ ولہم فان ہمبولٹ کے جس مضمون کا حوالہ ابھی دیا جا چکا ہے اس میں وہ لکھتے ہیں کہ انسانی ترقی کے لئے دو چیزیں ضروری ہیں

لہ یہ انیسویں صدی میں فرانس کا ایک مشہور شخص گزرا ہے جو جولائی ۱۸۰۵ء میں پیدا ہوا۔ ابتداءً ان کا خیال قانون کا پیشہ اختیار کرنے کا تھا۔ لیکن ۱۸۳۱ء میں گورنمنٹ کی طرف سے انھیں قیدیوں اور مجرمین کے حالات کی تفتیش و تحقیقات کے لئے امریکہ جانا پڑا جہاں سے وہ دو سال کے بعد نہایت کامیاب لوٹے اور اپنی تحقیقات کی ایک نہایت بہتر اور قابل ستائش رپورٹ پیش کی، لیکن اس سے زیادہ بہتر چیز امریکہ کے اس سفر کی بدولت انھوں نے جو پیش کی وہ وہاں کے جمہوری نظام حکومت کے متعلق تھی جس سے نہ صرف ان کی عام شہرت میں اضافہ ہوا اور وہ فوراً ہی فرانس کی ایک نہایت بڑی علمی مجلس کے رکن منتخب کرلئے گئے، بلکہ انگلستان میں بھی ان کی بہت شہرت ہوئی جو اس وقت لبرل خیالات کا مرکز تھا۔ انکی آخری تصنیف جو انکی زندگی میں شائع ہوئی قدیم حکومت پر تھی، انکے علاوہ انکی بہت سی کتابیں انکے انتقال کے بعد شائع ہوئیں، اپنی زندگی کے آخری ۲۰ سال اور مرنے کے کوئی دس سال بعد تک بھی توکوویلے انگلستان اور فرانس کے مشہور ترین لوگوں میں شمار کئے جاتے تھے اور ہر دو جگہوں کی مشہور شخصیتوں سے انکے گہرے تعلقات تھے۔

ایک آزادی اور دوسرے اختلاف ماحول۔ اس لئے یہی دو شرطیں انسانوں کو باہم غیر مماثل بناتی ہیں۔ ان میں سے دوسری شرط ہمارے یہاں روز بہ روز گھٹتی جارہی ہے۔ مختلف جماعتوں اور افراد کے گرد وپیش جو حالات ہیں اور ان کے اخلاق وعادات کے بنانے میں مدد دیتے ہیں، وہ روز بہ روز ایک دوسرے میں جذب ہوتے جاتے ہیں۔ پہلے مختلف حیثیتوں اور مختلف تجارتوں اور پیشوں کے لوگ اپنی اپنی مختلف دنیا میں رہتے تھے لیکن آج کل وہ سب زیادہ تر ایک ہی قسم کے ماحول میں رہتے ہیں۔ نسبتاً دیکھا جائے تو سب لوگ ایک ہی قسم کی چیزیں پڑھتے ہیں، ایک ہی قسم کی باتیں سنتے ہیں، ایک ہی طرح کی چیزیں دیکھتے ہیں اور ایک ہی مقام پر آتے جاتے ہیں، ایک ہی قسم کی چیزوں سے ان کی امید وبیم کا تعلق ہوتا ہے، ایک ہی طرح کے حقوق اور فرائض رکھتے ہیں اور اظہار خیال کے لئے ان کے پاس ایک ہی قسم کے ذرائع ہوتے ہیں ان کی حیثیتوں میں تھوڑا بہت جو فرق اب بھی باقی رہ گیا ہے، وہ اگرچہ بہت کافی ہے لیکن پہلے کے مقابلہ میں وہ کچھ بھی نہیں ہے اور پھر بھی یکساں اور ہمجنس بنانے کا طریقہ برابر جاری ہے۔ اس زمانہ کے تمام سیاسی تغیرات اس بات میں روز بہ روز ممد ومعاون ہو رہے ہیں، اس لئے کہ ان سب کا میلان یہ ہے کہ پست کو بلند کیا جائے اور بلند کو پست۔ تعلیم جس قدر عام ہوتی جارہی ہے، اسی قدر اس میں اور اضافہ ہوتا ہے، اس لئے کہ یہ لوگوں کو مشترک اثرات کے ماتحت لے آتی ہے اور اس سے ان سب کی رسائی عام واقعات وجذبات تک ہو جاتی ہے۔ ذرائع آمد ورفت کی ترقی سے بھی اس میں امداد پہونچتی ہے، اس لئے کہ اس سے دور دست مقامات کے باشندوں کو باہم ملنے جلنے کا موقع ملتا ہے اور اس سبب سے لوگ برابر ایک جگہ سے دوسری جگہ اپنی سکونت بدلتے

رہتے ہیں۔ تجارت وصنعت کی گرم بازاری سے بھی اس شے میں ترقی ہوتی ہے، اس لئے کہ سامان معیشت سے سب کو یکساں فائدہ اٹھانے کا موقع ملتا ہے اور اس کی وجہ سے اعلیٰ سے اعلیٰ چیزوں کے حصول کا دارومدار بھی عام مقابلہ پر ہو جاتا ہے، جس سے ترقی اور عالی حوصلگی کی خواہش کسی جماعت کے ساتھ مخصوص ہونے کی بجائے، تمام جماعتوں کے لئے عام ہوتی ہے۔ لیکن ان سب سے زیادہ قوی الاثر شے جو تمام انسانوں میں ایک عام یکسانیت پیدا کر رہی ہے، وہ ہمارے ملک اور دوسرے تمام آزاد ممالک میں ریاست کے اندر رائے عامہ کا اقتدار ہے۔ جس قدر وہ معاشرتی اعزازات وامتیازات جن کی بنا پر لوگ جمہور کی رائے کو ٹھکرا دیا کرتے تھے، کم ہوتے جائیں گے، اور جس قدر جمہور کی خواہشات کے خلاف چلنے کا خیال سیاسی اشخاص کے دماغوں سے مٹتا جائے گا، اسی قدر لوگوں کی طرف سے اختلاف آراء وعادات کی تائید وحمایت بھی کم ہوتی جائیگی اور جماعت کی وہ قوت ختم ہو جائے گی جو اُس وقت ہوتی ہے جب وہ خود اکثریت کے اقتدار کی مخالف ہو اور اس لئے ان خیالات ورجحانات کی حمایت پر آمادہ جو عام رائے کے خلاف ہوں۔

ان تمام اسباب ووجوہ نے مل جلکر انفرادیت کے خلاف ایک ایسا زبردست اثر قایم کر رکھا ہے کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیوں کر اپنا وجود باقی رکھ سکتی ہے اور اس حالت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا جائے گا" تاوقتیکہ جمہور کا تعلیمیافتہ طبقہ انفرادیت کی قدر وقیمت کو محسوس نہ کرے، اور یہ نہ سمجھنے لگے کہ اختلاف کا ہونا بہرصورت اچھا ہے، خواہ اس اختلاف کا نتیجہ بہتر نہ سہی بلکہ اس کے خیال کے مطابق برا ہی کیوں نہ ہو۔ اگر انفرادیت کے فوائد کو کبھی لوگوں سے تسلیم کرانا ہے تو اس کا سب سے بہتر موقع اس وقت ہے جب کہ

اس جبری اتحاد و یکانگت پیدا کرنے میں ابھی بہت کچھ کمی باقی ہے اگر اس کے خلاف کبھی کامیابی کے ساتھ کوئی مقابلہ کیا جا سکتا ہے تو وہ اس کے غلبہ کے صرف ابتدائی دور میں ہو سکتا ہے۔ جس قدر ہماری یہ خواہش پوری ہوتی جائے گی کہ تمام دوسرے لوگ ہمارے جیسے ہو جائیں اسیقدر ہمارا یہ مطالبہ بھی بڑھتا جائے گا۔ اگر ہم اسوقت تک خاموش بیٹھے رہیں اور کوئی مزاحمت نہ کریں جب تک کہ تمام لوگوں کی زندگی "تقریباً" ایک سی نہ ہو جائے تو اس سے ذرا سا انحراف کرنا بھی ایک نہایت قبیح اور مذموم حرکت بلکہ ایک خلاف فطرت فعل سمجھا جائے گا۔ انسان جب کچھ عرصہ تک اختلاف و تباین کا عادی نہیں رہتا، تو وہ اس کا خیال بھی اپنے دل میں نہیں لا سکتا ہے۔

باب چہارم

فرد پر جماعت کے اختیارات کی حدود

اب یہ دیکھنا ہے کہ فرد کو خود اپنے اوپر جو اقتدار حاصل ہے اس کی جائز حدود کیا ہیں؟ جماعت کے اختیارات کہاں سے شروع ہوتے ہیں؟ انسانی زندگی کا کس قدر حصہ انفرادیت کے اور کس قدر جماعت کے سپرد ہونا چاہیئے؟

ان میں سے ہر ایک اگر صرف وہ لے جس کا اس سے خاص تعلق ہے، تو دونوں کو اپنا مناسب حصہ مل جائے گا۔ انفرادیت کو زندگی کا وہ حصہ ملنا چاہیئے جس میں فرد کا خاص طور سے تعلق ہوتا ہے اور یہ جماعت وہ حصہ جس میں اسکا خاص تعلق ہے۔

اگرچہ جماعت کی بنیاد کسی معاہدہ پر نہیں ہے اور گو بعض معاشرتی فرائض ثابت کرنے کیلئے ایک معاہدہ تسلیم کر لینے سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوتا، تاہم ہر شخص پر جو جماعت کے تحفظ میں رہتا ہے، اس کے عوض میں ایک صلہ واجب ہے اور اس کا جماعت کے اندر رہنا ہی اس پر یہ بات لازم کر دیتا ہے کہ اسے دوسروں کے ساتھ برتاؤ کرنے میں ایک خاص طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس طرز عمل میں سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک دوسرے کے اغراض کو نقصان نہ پہونچے یا یوں کہیئے کہ ان اغراض کو جنھیں یا تو علانیہ قانونی وضاحت یا در پردہ مفاہمت کی بنا پر حقوق سمجھنا چاہیئے دوسرے

یہ کہ ہر شخص ان کوششوں اور قربانیوں میں حصہ لے جو جماعت یا اس کے افراد کو نقصان یا ایذا رسانی سے بچانے کے لئے کرنی پڑتی ہیں۔ (اس حصہ کا تعین کسی منصفانہ اصول پر کر دینا چاہیئے) جماعت کو اس بات کا حق حاصل ہو کہ وہ ان شرائط کو بہر صورت ان اشخاص پر عاید کرے جو اس کے پورا کرنے میں کسی قسم کا تساہل کرتے ہوں۔ اور صرف یہی نہیں ہے جس کی جماعت مجاز ہے۔ ایک فرد کے افعال بغیر ان مقررہ حقوق کی خلاف ورزی کئے ہوئے بھی دوسروں کے لئے ضرر رساں یا ان کی بہبود کے لئے غیر مفید ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس صورت میں اس فعل کے مرتکب کو اگر قانون سے نہیں تو جائز طور پر رائے عامہ کے ذریعہ سزا دی جا سکتی ہے۔ جس وقت کسی شخص کے کسی فعل سے دوسروں کے حقوق کو صدمہ پہونچتا ہے اس وقت فوراً جماعت کو اس پر اپنے اختیارات استعمال کرنے کا حق ہو جاتا ہے، اور اسی وقت یہ سوال پیدا ہو جاتا ہے کہ آیا اس معاملہ میں دخل دیکر عام فلاح و بہبود کو فائدہ پہونچے گا یا نہیں۔ لیکن اس قسم کے سوال اٹھنے کا کوئی موقع نہیں اگر ایک شخص کے فعل سے اس کے سوا دوسروں کے مفاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا ہے یا تا وقتیکہ وہ خود نہ چاہیں ان پر اثر پڑنے کی کوئی وجہ نہیں ہے (بشرطیکہ وہ لوگ سن بلوغ کو پہونچ گئے ہوں اور اپنے اندر معمولی سمجھ رکھتے ہوں) ایسی تمام صورتوں میں قانونی اور معاشرتی ہر قسم کی کامل آزادی ہونی چاہیئے تاکہ وہ جو چاہے کر سکے اور اور اس کے نتائج خود ہی بھگتے۔

اس اصول کو ہم بالکل غلط سمجھیں گے اگر فرض کر لیں کہ یہ خود غرضانہ بے اعتنائی کی تعلیم دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہو کہ انسان کو تا وقتیکہ اپنے ذاتی مفاد کا سوال نہ ہو، ایک دوسرے کے فعل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور اسے ایک دوسرے کے فلاح

وبہبود سے کوئی واسطہ نہ رکھنا چاہیئے۔ بجائے کسی کمی کے اس امر کی بڑی ضرورت ہے
کہ دوسروں کی بہبود کے لئے زیادہ سے زیادہ بے غرضانہ کوشش کی جائے۔ لیکن یہ بے غرضانہ
بہی خواہی لوگوں کو اپنی فلاح پر آمادہ کرنے کے لئے تازیانہ و چھڑی کے (خواہ ان کے معانی
مجازاً لئے جائیں یا لفظاً) علاوہ دوسرے ذرائع سے بھی تو انجام پا سکتی ہے۔

میں سب سے آخری شخص ہونگا جو ذاتی خوبیوں کی قدر نہ کروں۔ وہ بلحاظ اہمیت اگر
کسی سے دوسرے درجہ پر ہیں تو بس معاشرتی خوبیوں سے۔ تعلیم کا فرض ہے کہ وہ ان دونوں
قسم کی خوبیوں کو پیدا کرے لیکن خود تعلیم ترغیب و تحریص سے بھی ہوتی ہے اور جبر و اکراہ سے
بھی۔ چنانچہ جب تعلیم کا زمانہ گزر جائے تو ذاتی خوبیاں ترغیب و تحریص ہی سے پیدا کرنی چاہئیں
انسان کا فرض ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نیک و بد کی تمیز میں مدد پہنچائے اور نیکی کے
انتخاب اور بدی سے اجتناب کرنے میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائے۔ انہیں چاہیئے کہ
ہمیشہ ایک دوسرے کو اس بات پر ابھارتے رہیں کہ وہ اپنے اعلیٰ قواء کا زیادہ سے زیادہ
استعمال کرے اور اپنے جذبات و خیالات کو احمقانہ اور ادنیٰ باتوں کی بجائے دانشمند
اور اعلیٰ افکار و مقاصد کی طرف رجوع کرے۔ لیکن کوئی شخص یا اشخاص کی جماعت کسی
دوسرے بالغ العمر شخص سے یہ کہنے کا حق نہیں رکھتی کہ وہ اپنے فائدے کے لئے اپنی زندگی
کے ساتھ جو کرنا چاہتا ہے وہ نہ کرے۔ اپنی فلاح و بہبود کا سب سے زیادہ خیال اسی کو
ہونا چاہیئے اور اگر کسی دوسرے شخص کو بہ استثنائے خاص ذاتی تعلقات کے کوئی خیال
ہو سکتا ہے تو وہ اس کے مقابلہ میں محض ادنیٰ درجہ کا ہوگا یا جو خیال جماعت اس کی
انفرادی حیثیت کی بنا پر رکھتی ہے (بہ استثنا ان افعال کے جن کا تعلق دوسروں سے
ہوتا ہے) وہ محض جزوی اور بالواسطہ ہوتا ہے، اور اپنے جذبات اور حالات کے معلوم

کرنے کا جو ذریعہ معمولی سے معمولی مرد یا عورت کے پاس ہوتا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے جو کسی دوسرے شخص کے پاس ہو سکتا ہے۔ جن معاملات کا تعلق خود فرد کی ذات سے ہے ان میں فرد کے فیصلہ یا ارادہ میں اگر جماعت دخل دیگی تو لازماً عام خیالات و مفروضات کی بنا پر جو بالکل غلط بھی ہو سکتے ہیں اور اگر صحیح بھی ہوں تو انفرادی حالتوں پر ان کے اطلاق میں جتنا صحت کا امکان ہو اتنا ہی غلطی کا بھی ہے کیونکہ جو اشخاص ان عام مفروضات کو انفرادی معاملہ پر عائد کرتے ہیں وہ اس معاملہ کی نوعیت سے بس اسی قدر واقف ہوتے ہیں جیسا کہ وہ شخص جو اسے محض باہر سے دیکھتا ہے۔

لہذا معاملات انسانی کے اس شعبہ میں انفرادیت کو عمل میں لانے کا صحیح موقع ہے۔ انسان کے ان معاملات میں جن کا تعلق ایک دوسرے سے ہو یہ ضروری ہے کہ کچھ عام قواعد کا لحاظ رکھا جائے تاکہ لوگوں کو معلوم رہے کہ انھیں دوسروں سے کیا توقع رکھنی چاہیے۔ لیکن ہر ایک شخص کے اپنے معاملات میں اس کی انفرادی آزادی کو پورا حق حاصل ہے۔ دوسرے لوگ اس کے فیصلہ میں مدد دے سکتے ہیں اور وعظ و تلقین سے اس کی قوت ارادی کو تقویت پہونچا سکتے ہیں بلکہ یہ سب کچھ اس کی مرضی کے خلاف اس کے کانوں میں ڈال سکتے ہیں لیکن آخری فیصلہ کا حق اسی کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔ اس نصیحت و انتباہ کے باوجود وہ جو غلطیاں کرے گا، وہ سب اس برائی سے کہیں کم ہوں گی جو اس طرح پیدا ہوں گی کہ دوسرے اسے اس کام کرنے پر مجبور کریں جو وہ اسکے حق میں بہتر سمجھتے ہیں۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ جو جذبات لوگ ایک شخص کا تعلق رکھتے ہیں، ان پر ذاتی محاسن و معائب کا کسی طرح کوئی اثر نہ ہونا چاہیے۔ یہ نہ ممکن ہے اور نہ بہتر۔ اگر اس میں کوئی خوبی نمایاں طور سے ایسی ہے جو اس کے بہبود کے لئے معین ہے تو وہ اس حد تک بجا طور پر

سزاوار مدح وستایش ہے۔ وہ کمال انسانی سے اسی قدر قریب تر ہے۔ اگر اس میں ان خوبیوں کی بہت کمی ہے تو اس کے برعکس جذبات پیدا ہوں گے۔ حماقت کا ایک درجہ ہوتا ہے اور پستی و انحطاط مذاق (اگرچہ یہ لفظ ذرا قابل اعتراض ضرور ہے) کا ایک درجہ ہوتا ہے جس کی وجہ سے اگرچہ یہ نہیں لازم آتا کہ جس شخص میں یہ باتیں پائی جائیں، اُسے نقصان پہونچایا جائے تاہم اس کی وجہ سے وہ جائز طور پر ناپسندیدہ اور انتہائی صورتوں میں ایک قابل نفرین شے ضرور ہو جاتا ہے۔ ناممکن ہے کہ کسی شخص کے دل میں ان صفات کے مخالف اوصاف موجود ہوں اور یہ جذبات پیدا نہ ہوں اگرچہ ایک شخص کسی کو کوئی نقصان نہ پہنچائے تاہم اس کے فعل سے ہم اس کے متعلق یہ فیصلہ ضرور کر سکتے ہیں کہ وہ ایک بے وقوف یا نیچے درجہ کا آدمی ہے اور چونکہ وہ اس قسم کے فیصلہ یا خیال سے بچنے کی کوشش کرے گا، اس لئے یہ اس کی خدمت ہوگی اگر ہم اسے اس سے پہلے ہی متنبہ کر دیں، جس طرح اور کسی ناگوار نتائج سے متنبہ کر دینا اس کی خدمت ہے۔ حقیقت میں یہ ایک بہت ہی بہتر کام ہو اگر یہ نیک فرض اس سے زیادہ آزادی سے ادا کیا جانے لگے جتنا کہ شائستگی و اخلاق کے تمام تصورات میں آج ممکن ہے اور ایک شخص گستاخ یا بد اخلاق سمجھے جانے بغیر نہایت ایمانداری کے ساتھ دوسرے کے متعلق یہ کہہ سکے کہ وہ اس کو غلط راہ پر سمجھتا ہے۔ ہمیں یہ بھی حق حاصل ہے کہ ہم دوسروں کے متعلق اپنی خراب رائے پر مختلف طریقوں سے عمل کر سکیں لیکن اس کی انفرادیت کو کوئی صدمہ پہونچا کر نہیں بلکہ اپنی شخصیت کو عامل بنا کر۔ مثلاً ہم اس پر مجبور نہیں ہیں کہ خواہی نخواہی اس کی صحبت میں جائیں ہمیں اس سے الگ رہنے کا بھی حق ہے۔ (اگرچہ اس علیحدگی کا ہر جگہ اعلان کرنے کا حق نہیں ہے) اس لیئے کہ ہمیں یہ حق حاصل ہے کہ ہم اپنے لئے بہتر سے بہتر جماعت تلاش

کریں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی تقلید یا اس سے بات چیت ان لوگوں پر جو اسکی صحبت میں رہتے ہیں، برا اثر ڈالے گی، تو ہمیں حق ہے بلکہ کبھی کبھی فرض ہو جاتا ہے کہ دوسروںکو اس سے بچنے کی ہدایت کریں۔ اختیاری نیک کاموں میں ہم مجاز ہیں کہ دوسروں کو اس پر ترجیح دیں لیکن ان امور میں جو اس کی ترقی کے لئے ضروری ہیں، ہمیں یہ حق نہیں۔ ان مختلف طریقوں سے ایک شخص دوسروں کے ہاتھ سے اپنے ان قصوروں کے بدلے بہت کچھ سختیاں اٹھا سکتا ہے جن کا تعلق براہ راست صرف اسی کی ذات سے ہے لیکن یہ سختیاں ارادتاً بطور سزا کے اس پر نہیں ڈالی جاتیں بلکہ انھیں اس کی غلطیوں کا قدرتی نتیجہ سمجھنا چاہئیے۔ ایک شخص جس کے افعال سے غصّہ، ضد اور غرور کا اظہار ہو، جو اعتدال کے ساتھ زندگی بسر نہ کر سکے، جو نقصان دہ عادات سے باز نہ رہ سکے، جو دل و دماغ کی حقیقی مسرتوں کی بجائے خواہشات نفسانی کے پورا کرنے کے پیچھے لگا رہے، اسے یہ توقع ضرور رکھنی چاہیئے کہ دوسروں کی نظروں میں اس کی وقعت کم ہو جائے گی اور اسے ان کے خوشگوار جذبات میں بہت کم حصہ ملے گا۔ لیکن اسے اس کی شکایت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے تاوقتیکہ اس نے اپنے معاشرتی تعلقات میں اپنی کسی خاص خوبی کے ذریعہ ان کی چشم عنایت کو حاصل نہیں کر لیا ہے اور ان کے الطاف و عنایات کا اپنے کو مستحق نہیں بنا لیا ہے جن پر اس کے ذاتی معائب کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔

میں جو بات اس قدر بحث کرنیکے بعد کہنی چاہتا ہوں وہ یہ کہ ایک شخص کو اسکے اس حصۂ فعل کے عوض جو خود اس کی ذات سے تعلق رکھتا ہے اور جس کا دوسروں کے مفاد پر کوئی اثر نہیں پڑتا، صرف اسی قدر سزا کا مستوجب قرار دینا چاہئیے کہ وہ اُن تکالیف کو برداشت کرے جو دوسروں کی ناموافق رائے کا لازمی نتیجہ ہیں جن افعال

سے دوسروں کو کوئی نقصان یا ضرر پہونچتا ہو، ان کے ساتھ بالکل ہی جداگانہ سلوک کرنا چاہیئے۔ دوسروں کے حقوق میں دست اندازی، لوگوں کو کسی قسم کا نقصان یا صدمہ پہنچانا جن سے اپنے حقوق کو بھی کوئی نفع پہونچتا ہو، لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں دروغ یا فریب سے کام لینا، اوروں کے مقابلہ میں ناجائز فائدہ اٹھانا، اور نہ صرف یہی بلکہ خود غرضی کی بنا پر دوسروں کو نقصان سے بچانے میں پہلوتہی کرنا، یہ تمام افعال ہیں جن پر اخلاقی حیثیت سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا جا سکتا ہے اور اہم صورتوں میں یہ اخلاق پاداش اور سزا کے مستحق بھی ہو سکتے ہیں۔ اور نہ صرف یہ افعال بلکہ وہ طبائع بھی جو ان افعال کا موجب ہوتی ہیں، اخلاقی اعتبار سے بری ہیں اور ان سے بھی اسی طرح ناپسندیدگی بلکہ سخت تنفر کا اظہار کیا جا سکتا ہے۔ بے رحمی، کینہ پروری، بدطینتی اور وہ جماعت کا سب سے دشمن اور ارذل ترین جذبہ جس کا نام حسد ہے، ریا و بدنیتی، معمولی معمولی باتوں پر چڑچڑانا؛ ادنیٰ اشتعال پر غیر ضروری خفگی کا اظہار، دوسروں پر غلبہ پانے کی خواہش، اپنے حصہ سے زیادہ غصب کرنیکی ہوس، نخوت و غرور جس سے دوسروں کی رسوائی پر خوشی ہوتی ہے، انانیت کا جذبہ جو ہر چیز سے زیادہ اپنا اور اپنے متعلقات کا خیال رکھتا ہے اور تمام مشتبہ امور کا فیصلہ اپنے حق میں کرتا ہے۔ یہ تمام اخلاقی برائیاں ہیں اور انھیں سے بری اور قابل نفرت سیرت پیدا ہوتی ہے بر خلاف ان ذاتی عیوب کے جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور جو کسی طرح اخلاقی معائب نہیں کہے جا سکتے اور وہ خواہ کسی قدر سنگین کیوں نہ ہوں، بدی اور شرارت کی حد کو نہیں پہونچتے۔ وہ خواہ کسی قدر حماقت کا ثبوت کیوں نہ ہوں، یا ان سے ذاتی شرافت یا پاسِ عزت کی خواہ کتنی ہی کمی کیوں نہ ظاہر ہوتی ہو، لیکن یہ اخلاقی ناپسندیدگی کے مورد اسی وقت ہو سکتے

ہیں جب ان سے ان فرائض کی شکست لازم آئے جو فرد پر دوسروں کے مقابلہ میں عائد ہوتے ہیں کیونکہ فرد کے لئے دوسروں کی خاطر خود اپنا خیال رکھنا بھی ضروری ہے۔ ہمارے جو فرائض اپنی ذات کے لئے ہیں وہ مدنی و جماعتی حیثیت سے اس وقت تک عائد نہیں ہوتے جب تک کہ حالات انھیں دوسروں کا حق بھی نہ بنا دیں۔ اپنی ذات کے لئے فرض سے اگر احتیاط و پیش بینی سے کچھ اور زیادہ مراد ہو تو اس کا مفہوم پاس عزت اور ترقی نفس ہوتا ہے اور ان کے لئے کوئی شخص اپنے ہمجنسوں کے سامنے جواب دہ نہیں ہوتا اس لئے کہ ان کی خاطر ان کو جواب دہ ٹھہرانا بنی نوع کے لئے نفع کا باعث نہیں۔

ایک شخص اپنے افعال سے عاقبت اندیشی یا ذاتی شرافت کا اظہار نہ کرکے اپنی طرف سے دوسروں کی رائے کو جو نقصان پہونچائے، اس میں اور دوسروں کے حقوق میں دست اندازی کرکے وہ جس لعن طعن کا مورد بنے گا، ان دونوں میں محض کوئی لفظی فرق نہیں ہے اس کی طرف سے ہمارے جذبات اور سلوک میں اس سے تو زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے کہ اس نے ہمیں کسی ایسے معاملہ میں ناخوش کیا ہے جس میں ہمیں اس کو روکنے کا حق حاصل تھا یا ایسے معاملہ میں جس میں ہم جانتے ہیں کہ ہمیں کوئی حق نہیں۔

اگر اس نے ہمیں ناراض کردیا ہے تو ہم اس سے اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرسکتے ہیں، اس سے کنارہ کشی اختیار کرسکتے ہیں، لیکن ہم اس کو کسی طرح کی ایذا یا تکلیف نہیں پہونچا سکتے۔ ہمیں یہ سوچنا چاہیئے کہ وہ اپنی غلطی کا خمیازہ بھگت رہا ہے یا آئندہ چلکر اسے بھگتنا پڑیگا۔ اگر وہ بدانتظامی کی وجہ سے اپنی زندگی خراب کررہا ہے تو ہمیں اس بنا پر اس کی زندگی کو اور زیادہ خراب نہ کرنا چاہیئے۔ بجائے اس کے کہ ہم اسے سزا دیں ہمیں اس کی سزا کی تلافی کرنی چاہیئے اور وہ اس طرح ہو سکتی ہے کہ اسے بتایا جائے کہ

وہ اپنی خرابیوں کی اصلاح یا ان کا ازالہ کیونکر کر سکتا ہے۔ وہ ہمارے لئے رحم کا باعث ہو سکتا ہے یا شاید اس سے نفرت بھی کی جا سکے لیکن وہ کسی طرح ہمارے غصہ یا ناراضگی کا مورد نہیں بن سکتا۔ ہم اسے جماعت کا دشمن نہیں سمجھ سکتے اگر ہم اس کے ساتھ اظہار تعلق کر کے اس کی بہی خواہی نہیں کر سکتے تو زیادہ سے زیادہ جو کچھ ہم کر سکتے ہیں، وہ یہ کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ لیکن اگر اس نے ان قواعد کی خلاف ورزی کی ہے جو انفرادی یا اجتماعی حیثیت سے اس کے ابنائے جنس کے تحفظ کے لئے ضروری ہیں تو اس صورت میں معاملہ بالکل دوسرا ہوگا۔ اب اس کے افعال کے نتائج بد کا اثر صرف اسی کی ذات تک محدود نہ ہوگا بلکہ دوسروں پر بھی پڑے گا اور اس صورت میں جماعت کو بہ حیثیت محافظ خلائق ہونے کے اس سے انتقام لینا چاہیئے اور اسے کافی سزا دینی چاہیئے۔ ایک صورت میں وہ بہ حیثیت مجرم کے ہمارے سامنے پیش ہوا اور ہمیں نہ صرف اس کا فیصلہ سنانا ہے بلکہ کسی نہ کسی صورت میں اس فیصلہ کو عمل میں لانا ہے دوسری صورت میں اسے کسی قسم کی تکلیف دینے کا ہمیں کوئی حق نہیں ہے سوائے اس تکلیف کے جو اسے اس وجہ سے پہنچ جائے کہ ہم خود اپنے معاملات میں اسی آزادی کو استعمال کریں جس کا حق ہم اسے اس کے معاملات میں دیتے ہیں۔

جو فرق یہاں پر ایک شخص کی زندگی کے اس حصہ میں جو خود اس کی ذات سے متعلق ہے اور اس حصہ میں جس کا تعلق دوسروں سے ہے، بتایا گیا ہے، اسے بہت سے لوگ تسلیم کرنے سے انکار کریں گے۔ لوگ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک فرد جماعت کے کسی فعل کا دوسروں کی ذات پر کوئی اثر نہ ہو؟ کوئی شخص بالکل ہی غیر متعلق وجود نہیں رکھتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک شخص اپنی ذات کو مستقل

طور سے کوئی بڑا نقصان پہنچائے اور اس نقصان کا اثر کم سے کم اس کے قریبی متعلقین پر پڑ نہ ہو گو اکثر اس کا اثر دور کے رہنے والوں تک بھی پہنچتا ہے۔ اگر وہ اپنی جائداد کو تباہ و برباد کرتا ہے تو وہ ان لوگوں کو بھی نقصان پہونچا رہا ہے جو براہِ راست یا بالواسطہ اسکے دستِ نگر ہیں اور عام طور پہ کم و بیش وہ قوم کی دولت میں بھی کمی کر رہا ہے۔ اگر وہ اپنے جسمانی یا دماغی قوا کو برباد کرتا ہے تو وہ نہ صرف ان لوگوں پر مصیبت ڈال رہا ہے جو اس کی خوشی میں کسی نہ کسی حد تک شریک ہیں، بلکہ وہ خود کو اپنے ابنائے جنس کی ان خدمات کے ناقابل بنا رہا ہے جو اس پر لازم ہیں۔ وہ غالباً ان کی محبت اور بہی خواہی کے لئے ایک بارِ گراں ہو جاتا ہے اور اگر اس قسم کے افعال عام طور سے سرزد ہونے لگیں تو مشکل کوئی اور جرم بہبود خلائق کے لئے ان سے زیادہ مضر ہو گا۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ایک شخص اگر اپنے برے افعال اور اپنی حماقتوں سے دوسروں کو براہ راست کوئی نقصان نہیں پہنچاتا ہے، پھر بھی وہ ان کے لئے ایک غلط مثال قایم کر رہا ہے اور اس بنا پر اسے اپنے کو قابو میں رکھنے کے لئے مجبور کرنا چاہئے تاکہ دوسرے لوگوں پر اسکے افعال کا برا اثر نہ پڑے یا وہ گمراہ نہ ہو جائیں۔

اور ان سب کے علاوہ اگر ان برے افعال کے نتایج صرف اسی برے اور ناعاقبت اندیش فرد تک ہی محدود رہیں تو کیا جماعت ایسے لوگوں کو آپ اپنی رہنمائی کے لئے چھوڑ دے گی جو اس کے لئے اس قدر نااہل ثابت ہوں؟ اگر بچوں اور نابالغ لوگوں کی حفاظت و نگرانی کرنا جماعت کا فرض ہے تو کیا اس کا یہ فرض نہیں کہ وہ ایسے بالغ لوگوں کی بھی حفاظت و نگرانی کرے جو آپ اپنا انتظام نہیں کر سکتے؟ اگر قمار بازی، شراب خواری، بدکاری، کاہلی، غلاظت یہ سب چیزیں مسرت و خوشی کے

لئے باعث نقصان ہیں اور ترقی کی راہ میں اسی طرح خلل انداز ہیں جس طرح اور بہت سے افعال جو قانوناً ممنوع ہیں، تو کیا وجہ ہے کہ جہاں تک قابل عمل اور جماعتی سہولت کی حدود میں رہ کر ممکن ہے، قانون ان برائیوں کے روکنے کی بھی کوشش نہیں کرتا؟ اور اگر قانون میں یہ خامی ہے کہ وہ ان باتوں کو روک نہیں سکتا، تو کیا رائے عامہ کا بھی یہ فرض نہیں ہے کہ وہ ان برائیوں کا سختی کے ساتھ محاسبہ کرے اور ان کے کرنیوالوں کو سخت سزائیں دے؟ اس معاملہ میں انفرادیت کو پابند کرنے یا جدید اور طبعزاد تجربات کے نہ کرنے کا سوال نہیں ہے۔ جن باتوں کے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے وہ وہی ہیں جن پر ابتدائے آفرینش سے آج تک تجربہ ہوتا آیا ہے اور انھیں ہمیشہ برا کہا گیا ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جنھیں تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ وہ کسی شخص کے لئے نہ مفید ہیں اور نہ مناسب۔ تجربہ کی بھی ایک مدت اور ایک حد مقرر ہونی چاہئیے، جس کے بعد اس چیز کو مسلم سمجھ لینا چاہئیے اور تمام آنے والی نسلوں کو یکے بعد دیگرے اسی ایک گڈھے میں نہ گرنے دینا چاہئیے جو ان سے اگلوں کی تباہی کا باعث ہوا ہے۔

میں پورے طور پر تسلیم کرتا ہوں کہ ایک شخص جو نقصان اپنی ذات کو پہونچاتا ہے، اس کا اثر ان لوگوں پر بھی پہونچ سکتا ہے، جو ان سے قریبی تعلق رکھتے ہیں اور ایک حد تک مجموعی حیثیت سے جماعت پر بھی ہو سکتا ہے۔ جب اس قسم کے کسی فعل سے ایک شخص کسی دوسرے شخص یا اشخاص کے مخصوص حقوق میں دست اندازی کرتا ہے تو اس صورت میں وہ اس کا ذاتی و شخصی معاملہ نہیں رہتا اور صحیح معنوں میں وہ اخلاقی لعنت و ملامت کا مستحق ہو سکتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اگر اپنی بے اعتدالی یا فضول خرچی کی وجہ سے اپنے قرضے ادا نہیں کر سکتا ہے یا ایک کنبہ کی اخلاقی ذمہ داریاں اپنے سر لیکر ان کی پرورش یا تعلیم

کا انتظام نہیں کر سکتا ہے تو وہ بلا شبہ ملامت کا مستحق ہے اور اسے بجا طور پر سزا بھی دی جا سکتی ہے لیکن اس کی وجہ اپنے کنبہ اور قرضخواہوں کے حقوق کا ادا نہ کرنا ہے، نہ کہ اس کا اسراف اور فضول خرچی۔ اگر وہ روپیہ جو ان پر خرچ کیا جانا چاہئیے تھا، اسے یہ ان پر خرچ کرنے کی بجائے کسی بہتر سے بہتر کاروبار میں بھی لگا دیتا تو اس صورت میں بھی اس کا اخلاقی جرم ویسا ہی ہوتا۔ جارج بارنول نے اپنی محبوبہ کے لئے روپے کی خاطر اپنے چچا کو جان سے مار ڈالا، لیکن اگر اس نے یہی کام اپنے تجارتی کاروبار کو چلانے کی خاطر کیا ہوتا تو اس صورت میں بھی اسے پھانسی کی سزا ملتی۔ علاوہ اس کے ایک شخص اگر اپنے برے عادات کی وجہ سے اپنے کنبہ کو تکلیف پہنچاتا ہے تو وہ اپنی بے رحمی اور بے مروتی کی وجہ سے لعنت و ملامت کا مستحق قرار پاتا ہے لیکن اسی کا وہ ان عادات کے پیدا کرنے میں بھی قرار پائیگا جو فی نفسہ بری نہ ہوں مگر ان لوگوں کے لئے تکلیف کا باعث ہوں جن کے ساتھ وہ رہتا سہتا ہے یا جن کے آرام و آسایش کا دار و مدار اس کی ذات پر ہے۔ جو شخص دوسروں کے مفاد اور جذبات کا لحاظ کرنے میں کوتاہی کرتا ہے، بشرطیکہ وہ ایسا کرنے میں کسی اہم تر فرض سے مجبور نہ ہو یا کسی جائز ذاتی ترجیح کی بنا پر ایسا نہ کرتا ہو تو وہ اپنے اس قصور کی وجہ سے اخلاقی لعن طعن کا مورد ہو سکتا ہے، لیکن اس قصور کے اسباب

لہ جارج بارنول انگلستان کا غالباً کوئی غیر معروف شخص ہے جس کا مصنف کتاب ہذا نے اس واقعہ قتل کی وجہ سے اپنی کتاب میں ذکر کیا ہے۔

کی وجہ سے نہیں اور نہ ان غلطیوں کی وجہ سے جو بالکل اس کی ذات سے متعلق ہوں اور جن کا ایک بعید نتیجہ یہ قصور ہے۔ اسی طرح ایک شخص اگر اپنے کسی محض ذاتی فعل کی وجہ سے عامۂ خلائق کا کوئی ایسا فرض ادا نہیں کرتا جو اس پر عائد ہوتا ہے تو وہ ایک جماعتی جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ ایک شخص کو صرف اس بنا پر سزا نہ دینی چاہئیے کہ اس نے شراب پی، لیکن ایک سپاہی یا پولیس والے کو جو اپنے فرائض کو ادا کر رہا ہو، شراب پینے پر ضرور سزا دینی چاہئیے۔ غرض جب کبھی کوئی مخصوص نقصان ہو رہا ہو یا نقصان ہونے کا کوئی خاص اندیشہ ہو، خواہ وہ کسی فرد کو ہو یا جماعت کو، تو اس صورت میں معاملہ آزادی کی حدود سے نکلکر اخلاق یا قانون کی حدمیں داخل ہو جاتا ہے۔

لیکن جو عارضی نقصان ایک شخص کی ذات سے جماعت کو ایک ایسے فعل کی وجہ سے پہونچتا ہو، جس سے نہ کسی عام فرائض میں کمی ہوتی ہے اور نہ اس کے سوا کسی اور ذات کو کوئی تکلیف، تو اس صورت میں یہ نقصان ایسا ہے جسے جماعت انسانی آزادی کے ایک بڑے نفع کی خاطر برداشت کر سکتی ہے۔ اگر باشعور اشخاص کو اس بنا پر سزا دیجائے کہ وہ مناسب طور پر اپنی خبرگیری نہیں کرتے ہیں، تو میں یہ خواہش کروں گا کہ انھیں خود انکی خاطر سزا دی جاسکے، نہ کہ اس حیلہ پر کہ وہ جماعت کو وہ فائدے نہیں پہونچا سکیں گے جن کے حق کی وہ مقتضی ہی نہیں۔ لیکن میں یہ نہیں مانتا کہ جماعت کے پاس اپنے کمزور افراد کو ادنیٰ معقول طرز عمل کے معیار پر لانے کا بجز اس کے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ جب وہ کوئی نامعقول حرکت کریں اس وقت وہ انھیں قانونی یا اخلاقی سزا دے۔ جماعت کو زندگی کے کل ابتدائی زمانہ میں ان پر پورا اختیار حاصل رہا ہے بچپن اور صغر سنی کا تمام زمانہ اس کے ہاتھ میں ہے جس میں وہ انھیں معقول زندگی بسر کرنے

کی تعلیم و تربیت اچھی طرح سے ہو سکتی ہے۔ موجودہ نسل آیندہ نسل کی تعلیم و تربیت اور اس کے تمام ماحول کی ذمہ دار ہے، بیشک یہ اسے عقل و دانش اور نیکی و اخلاق میں کامل نہیں بنا سکتی اس وجہ سے کہ یہ خود ان اوصاف میں بہت حد تک قاصر ہے اور انفرادی صورتوں میں اس کی بہترین کوششیں ہمیشہ کامیاب ثابت نہیں ہوتیں، لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ اس آنے والی نسل کو کم سے کم اپنے جیسا یا اپنے سے کچھ بہتر ضرور بنا سکتی ہے۔ اگر جماعت اپنے افراد کی ایک معقول تعداد کو بچوں کی طرح رکھتی ہے جن پر مآل اندیشی کے معقول محرکات کا کوئی اثر نہیں ہوتا تو اس کے نتائج کی ذمہ دار خود جماعت ہے۔ باوجود اس کے کہ سوسائٹی کے ہاتھ میں لوگوں کی تعلیم و تربیت کے تمام اختیارات ہیں، نیز یہ اختیار بھی حاصل ہے کہ جو لوگ اپنے معاملات میں خود آپ فیصلہ نہیں کر سکتے ہیں، ان کے سر وہ اپنی مسلمہ رائے تھوپے، پھر ان قدرتی سزاؤں کی مدد حاصل ہے جو لازمی طور پر ان لوگوں کو بھگتنی پڑتی ہیں جو اپنے جاننے والوں کی ناپسندیدگی یا تحقیر اپنے سر لیتے ہیں ان سب کے بعد جماعت یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ افراد کے ذاتی معاملات میں بھی اپنے احکام نافذ کرنا چاہتی ہے اور انھیں ان کی تعمیل پر مجبور کرنا چاہتی ہے، اس لئے کہ تمام اصول انصاف و مصلحت کا تقاضا یہ ہے کہ ذاتی معاملات میں فیصلہ کا حق انھی کو ہونا چاہیئے، جنھیں اس کے نتائج بھگتنے پڑیں۔ عادات و اطوار پر اثر ڈالنے کے جو بہتر ذرائع ہیں، انھیں بے کار کرنے کا اس سے بڑھ کر اور کوئی طریقہ نہیں کہ خراب ذرائع کو کام میں لایا جائے۔ جن لوگوں کو بہ جبر نیک اور محتاط بنانے کی کوشش کی جا رہی ہے، اگر ان میں کچھ بھی ایسے اوصاف موجود ہیں جن سے مضبوط اور آزاد طبائع پیدا ہوتے ہیں، تو وہ بلاشبہ اس جبر و اکراہ کے خلاف سرکشی کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ایسا شخص یہ کبھی نہیں سمجھ سکتا کہ جس طرح دوسروں کو معاملات میں نقصان پہونچانے سے

اسے روکا جاسکتا ہے اسی طرح دوسروں کو اس کے اپنے معاملہ میں بھی اختیار اور قوت حاصل ہو، اور اس قسم کے غاصبانہ اختیارات کے خلاف سر اٹھانا اور جو حکم دیا جائے اس کے بالکل مخالف عمل کرنا دلیری و ہمت کی ایک علامت سمجھی جانے لگتی ہے، جیسا کہ چارلس دوم[لہ] کے زمانہ میں پیوریٹین لوگوں کے اخلاقی عدم رواداری کے خلاف عمل کیا گیا تھا۔ بد اور آوارہ لوگوں کی مثال سے جماعت کو محفوظ رکھنے کی ضرورت پر جو کچھ کہا جاتا ہے اس بارہ میں یہ مسلّم ہے کہ خراب اور بیہودہ اخلاق کی مثال سے جماعت کو محفوظ رکھنا چاہیئے یہ صحیح ہے کہ بری مثالوں سے جماعت پر خراب اثر پڑتا ہے بالخصوص ایسی صورت میں جب کہ دوسروں کو نقصان پہونچے اور نقصان پہونچانے والے کو کوئی سزا نہ دی جائے۔ لیکن ہم اس وقت ایسے افعال سے بحث کر رہے ہیں جن سے دوسروں کی ذات کو کوئی نقصان نہیں پہونچتا لیکن سمجھا جاتا ہے کہ خود کرنے والے کو بہت نقصان پہونچیگا اور میں نہیں سمجھتا کہ جو لوگ اس کو تسلیم کرتے ہیں، یہ کیسے خیال کر سکتے ہیں کہ وہ مثال بحیثیت مجموعی بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہوگی، اس لئے کہ اس فعل سے ایک طرف اگر بری

[لہ] چارلس دوم فرانس کا ایک بادشاہ گزرا ہے جو چارلس اول کے بعد تخت حکومت پر بیٹھا۔ اس کے عہد میں عیسائیوں کا ایک نیا فرقہ پیدا ہو گیا تھا جسے اس کے مخالفین طنزاً "پاک باز" یا 'پیوریٹن' کے نام سے پکارتے تھے۔ کلیسائے روم کی بہت سی خرابیوں کو دیکھکر کچھ لوگ اس سے علیحدہ ہو گئے اور ایک نہایت سادہ، پاک اور بے آمیز طریقہ پر زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ ان کی اس علیحدگی اور اپنے عقاید و خیالات پر تشدد کی وجہ سے بعض بعض ملکوں میں ان پر بہت سختیاں کیگئیں، بالخصوص چارلس دوم کے زمانہ میں فرانس میں بھی ان پر بہت کافی مظالم کئے گئے۔

مثال قایم ہوتی ہے، تو دوسری طرف اس کے وہ برے اور تکلیف دہ نتائج بھی ظاہر ہوتے ہیں جو اگر اس پر مناسب اظہار ناپسندیدگی کیا جائے تو ہمیشہ یا اکثر اس کا لازمہ ہوتے ہیں۔

لیکن خالص ذاتی معاملہ میں جماعت کے دخل دینے کے خلاف سب سے مضبوط دلیل جو پیش کی جا سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ جب کبھی یہ مداخلت ہوتی ہے تو ہمیشہ غلط طریقہ سے اور بے محل ہوتی ہے۔ ایسے معاملات میں جو جماعتی اخلاق یا حقوق العباد سے تعلق رکھتے ہیں عام رائے یعنی اکثریت کی رائے اگرچہ بسا اوقات غلط ہوتی ہے تو اکثر اس کے صحیح ہونیکا احتمال بھی ہے، اس لئے کہ ان معاملات میں انھیں خود اپنے مفاد کا فیصلہ کرنا اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ اگر اس طرز عمل کو جائز قرار دیا گیا تو خود ان پر کیا اثر پڑے گا۔ لیکن اسی طرح کی اکثریت کی رائے بالکل ذاتی اور نجی کے معاملات میں جو اقلیت پر قانون کا حکم رکھتی ہو، اس کے غلط ہونے کا امکان بھی اسی قدر ہے، جس قدر اس کے صحیح ہونے کا۔ اس لئے کہ ان معاملات میں رائے عامہ کے معنی زیادہ سے زیادہ یہ ہیں کہ دوسروں کے نفع و نقصان کے معاملہ میں کچھ لوگوں کی رائے کیا ہے اور بعض صورتوں میں تو اس کے معنی یہ بھی نہیں ہوتے کیونکہ عام لوگ کامل بے اعتنائی کے ساتھ اپنے خیال اور یقین کے آگے ان لوگوں کی آسانی و آسایش کا کچھ بھی خیال نہیں کرتے جن کے افعال پر انھیں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کرنا ہوتا ہے۔ دنیا میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دوسروں کے ہر ایسے فعل کو جسے وہ پسند نہیں کرتے، اپنے لئے نقصان و ضرر کا باعث خیال کرتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس سے ان کے جذبات کو سخت صدمہ پہونچ رہا ہے جیسے کہ ایک متعصب شخص سے جب کہا گیا کہ تم دوسروں کے مذہبی حسیات کا خیال نہیں کرتے تو اس نے جواب دیا کہ وہ بھی تو میرے حسیات کا خیال نہیں کرتے اور اپنے قابل نفرت طریقہ عبادت یا عقیدہ پر مصر ہیں۔ لیکن ایک ایسے شخص کے جذبہ میں جو خود اپنی رائے کے لئے

ہو اور ایک دوسرے شخص کے جذبہ میں جو اس پر خفا ہے کہ دوسروں کی یہ رائے کیوں ہے، کوئی برابری نہیں کی جا سکتی۔ ان ہر دو جذبات میں ایسا ہی تعلق ہے جیسا کہ ایک چور کی اس آرزو میں کہ دوسرے کا مال کسی نہ کسی طرح میرے قبضہ میں آجائے اور ایک حقیقی مالک کی اس خواہش میں کہ اس کی دولت اسی کے پاس رہے۔ اور ایک شخص کا ذاتی مذاق، اس کی ذات کے ساتھ اسی طرح مخصوص ہوتا ہے جیسے اس کی دولت یا اس کی رائے۔

ایسے پاک وصاف جمہور کا تخیل کر لینا تو آسان ہے جو تمام غیر متعین معاملات میں افراد کو پوری آزادی اور اختیار دے اور ان سے صرف ایسے افعال سے پرہیز کرنے کے لئے کہے جنھیں تمام دنیا کے تجربات نے برا ثابت کر دیا ہو لیکن حقیقت میں ایسے جمہور کہاں ملتے ہیں جو اپنے اختیار مداخلت پر ایسی پابندی جائز رکھتے ہوں؟ یا خود جمہور کب دنیا کے عام تجربات کی پروا کرتے ہیں؟ لوگوں کے ذاتی معاملات میں دخل دیتے وقت اگر انھیں کبھی کچھ خیال آتا ہے تو یہی کہ جمہور کے مسلمہ طریق کے خلاف عمل یا احساس ایک عظیم الشان گناہ ہے۔ اور فیصلہ کا یہی معیار تھوڑے بہت پردہ کے ساتھ نوے فیصدی معلمین اخلاق اور فلاسفہ کے نزدیک مذہب اور فلسفہ کا حکم تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کی تعلیم یہ ہے کہ اکثر باتیں حق ہیں، اس لئے کہ وہ حق ہیں یعنی اس لئے کہ ہم سمجھتے ہیں کہ وہ ایسی ہی ہیں۔ ان کا قول ہے کہ ہمیں وہ قوانین زندگی جنھیں خود اپنے اوپر اور دوسرے لوگوں پر لازم کرنا ہے، خود اپنے دل و دماغ کے اندر تلاش کرنے چاہئیں۔ غریب جمہور سوائے اس کے اور کیا کر سکتے ہیں کہ ان ہدایات پر عمل کریں اور ان تعلیمات اور نیک و بد کے متعلق اگر ان کے شخصی احساس میں کم و بیش اتفاق ہو جائے تو اسی کو ساری دنیا پر لازم قرار دے دیں۔

جو خرابی یہاں بتائی گئی ہے وہ ایسی نہیں ہے جس کا وجود محض خیالی ہو اور غالباً مجھ سے

یہ توقع کی جاتی ہو کہ میں کچھ ایسی مثالیں بھی دوں گا جن سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ آجکل کے اور اس ملک کے جمہور کس قدر ناجائز طور سے اپنے خیالات و جذبات کو اخلاقی قوانین کی حیثیت دیتے ہیں۔ میں دنیا کے موجودہ اخلاقی احساسات کی غلطیوں پر کوئی مضمون نہیں لکھ رہا ہوں۔ یہ موضوع اس قدر اہم ہے کہ محض ضمنی طور پر اس پر بحث ممکن نہیں۔ تاہم چند مثالیں پیش کرنی ضروری ہیں تاکہ ان سے یہ ظاہر ہو جائے کہ جس اصول کی میں حمایت کر رہا ہوں، وہ کس قدر ضروری اور عملی اہمیت رکھنے والا ہے اور یہ کہ میں محض خیالی خرابیوں کے رفع کرنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں اور اس کی بکثرت مثالیں دیکر یہ بتانا مشکل نہیں کہ اخلاقی مداخلت کے حدود کو یہاں تک وسیع کرنے کی خواہش کہ یہ فرد کے ناقابل انکار آزادی میں مداخلت بن جائے" انسانی خواہشات میں سب سے زیادہ عام خواہش ہو۔

پہلی مثال کے طور پر اس نفرت کو لیجئے جو لوگ ان اشخاص سے کرتے ہیں جو باوجود مختلف مذہب رکھنے کے ان کے مذہبی اوامر اور بالخصوص نواہی پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ ایک بہت معمولی سی مثال لیجئے، عیسائیوں کا کوئی عقیدہ یا ان کا کوئی عمل مسلمانوں کی نفرت کو اس قدر نہیں بھڑکاتا ہے جس قدر ان کا سور کا گوشت کھانا۔ شاید ہی کوئی ایسے افعال ہوں جنھیں عیسائی یا یورپ والے اس سے زیادہ نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہوں جس قدر کہ مسلمان شکم پُری کے اس طریقہ کو دیکھتے ہیں۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اسے اپنے مذہب کے سخت خلاف سمجھتے ہیں لیکن اس فعل پر ان کے اس درجہ اظہار نفرت کی تشریح صرف اسی وجہ سے نہیں ہوتی، اس لئے کہ شراب پینا بھی تو ان کے مذہب نے منع کیا ہے اور اس کے پینے کو تمام مسلمان بُرا سمجھتے ہیں لیکن اس پر اس قدر نفرت کا اظہار نہیں کرتے۔ برعکس اس کے اس گندے جانور کے گوشت سے ان کی اس

درجہ گھن کم و بیش اس طبعی نفرت سے مشابہ ہے۔ جو اس وقت پیدا ہوتی ہے جب کسی چیز کے گندے یا غلیظ ہونے کا خیال دل میں بیٹھ جاتا ہے حتیٰ کہ وہ لوگ بھی نفرت کرنے لگتے ہیں جن کی اپنی عادات پر مشکل ہی سے صفائی کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ مذہبی نجاست کا خیال جو ہندوؤں میں اس درجہ قوی ہوتا ہے اسی کی ایک اہم مثال ہے۔ فرض کرو کہ ایک ایسے ملک میں جہاں کثرت تعداد مسلمانوں کی ہے، اگر سور کے گوشت کا کھانا بالکل روک دیا جائے اور اسلامی[1] ممالک میں یہ کوئی نئی بات نہ ہوگی، تو کیا یہ رائے عامہ کے اخلاقی اختیار کا جائز استعمال ہوگا؟ اور اگر نہیں تو کیوں نہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ یہ فعل اس اکثریت کے لیے سخت تکلیف کا باعث ہے، ان کا نہایت پختہ ایمان ہے کہ خدا نے اسے منع کیا ہے اور وہ خود اس سے نفرت کرتا ہے۔ اس قسم کی ممانعت کو مذہبی تشدد

---

[1] بمبئی کے پارسی اسکی ایک عجیب و غریب مثال ہیں۔ جب یہ جفاکش اور محنتی لوگ جو ایران کے آتش پرستوں کی اولاد سے ہیں، خلفائے اسلام کے تشدد سے اپنے آبائی ملک کو چھوڑ کر مغربی ہندوستان میں پہونچے، تو ہندو راجاؤں نے انھیں اپنے ملک میں بڑی خوشی خوشی آنے دیا، اس شرط پر کہ وہ گائے کا گوشت نہیں کھائیں گے۔ جب یہ علاقے بعد میں مسلمان فاتحوں کے زیرنگیں آئے تو ان پارسیوں نے ان سے شراب نوشی کی اجازت حاصل کرلی اس شرط پر کہ وہ سؤر کا گوشت نہیں کھائیں گے۔ وہی باتیں جو پہلے ایک حاکم کے حکم کی حیثیت سے تسلیم کی گئی تھیں، اب طبیعت ثانیہ بن گئیں اور پارسی آجتک گائے کے گوشت اور سور کے گوشت دونوں سے پرہیز کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ ان کے مذہب کا کوئی حکم نہیں ہے، لیکن ان دونوں چیزوں سے اجتناب ان کی ایک رسم سی ہو گئی ہے اور مشرق میں رسم و رواج بمنزلہ مذہب کے سمجھا جاتا ہے۔ (مصنف)

بھی نہیں کہا جا سکتا فی الاصل یہ مذہبی فعل ہو لیکن یہ مذہب کے لئے ظلم و تشدد نہیں ہو سکتا، اسلئے کہ کسی شخص کے مذہب میں اس کا کھانا فرض نہیں ہے۔ اب لے دے کے جس بنا پر اس فعل سے ناپسندیدگی کا اظہار کیا جا سکتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ افراد کے ذاتی و شخصی معاملات میں جمہور کو دخل دینے کا کوئی حق نہیں ہے۔

دور کیوں جایئے، اکثر اہل اسپین رومی کارتھولیکی طریقہ کے علاوہ کسی اور طریقہ سے عبادت کرنے کو سخت گناہ اور عتاب الٰہی کا باعث سمجھتے ہیں اور اسپین میں اس کے علاوہ اور کسی طریقۂ عبادت کی اجازت بھی نہیں ہے۔ جنوبی یورپ کے تمام لوگ ایک پادری کے شادی کر لینے کو نہ صرف ایک خلاف مذہب فعل سمجھتے ہیں، بلکہ اسے اخلاق و عصمت کے منافی اور سخت قابل نفرت خیال کرتے ہیں۔ ان کے ان مخلصانہ جذبات اور غیر کارتھولیکی لوگوں پر ان کے عاید کرنے کی کوششوں کے متعلق پروٹستانٹی مذہب والے کیا خیال کرتے ہیں؟ بہرحال لوگوں کے ایسے معاملات میں دخل دینا جن کا تعلق دوسروں کے مفاد سے کچھ بھی نہیں ہے، اگر حق بجانب ہے، تو پھر کس اصول کی بنا پر ان واقعات کو خارج کیا جا سکتا ہے؟ یا پھر ایسے لوگوں کو کون شخص الزام دے سکتا ہے جو ایسی باتوں کو روکنا چاہتے ہیں جو خدا اور انسان دونوں کی نظروں میں مذموم ہوں؟ ذاتی و شخصی برائیوں کے روکنے کی اس سے بڑھ کر اور کوئی مثال نہیں مل سکتی کہ جنھیں نہ صرف ذاتی معائب ہی سمجھا جاتا ہے بلکہ انکو فسق و فجور سمجھ کر روکا جاتا ہے، اور تا وقتیکہ ہم مذہبی تشدد کرنے والوں کی اس منطق کو تسلیم نہ کر لیں کہ ہم دوسروں پر ظلم اس وجہ سے کر سکتے ہیں کہ ہم برسر حق ہیں لیکن وہ کوئی سختی نہیں کر سکتے اس لئے کہ وہ برسر ناحق ہیں اسوقت تک ہم ایک ایسے اصول کو تسلیم کر رہے ہیں کہ جس کا اطلاق اگر ہم ہی پر ہو تو ہم اسے ایک سخت

بے انصافی سمجھیں گے۔

ان مثالوں پر ممکن ہے یہ اعتراض کیا جائے، گو وہ غیر معقول ہی سہی، کہ یہ ایسے حالات سے لی گئی ہیں جن کا ظہور ہم ہیں ناممکن ہے۔ اس ملک میں اس کا احتمال نہیں کہ رائے عامہ کسی کو گوشت وغیرہ کے کھانے سے پرہیز کرنے پر مجبور کرے۔ یا لوگوں کی عبادات کے معاملہ میں یا اپنے عقیدہ یا خواہش کے مطابق شادی کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں دخل دے۔ بہر حال انھیں جانے دیجئے اور ایک دوسری مثال لیجئے جو ایسے معاملات میں دخل دینے کی ہے جن کے خطرے سے ابھی تک ہم نکل نہیں چکے ہیں۔ جہاں کہیں پیوریٹن مذہب والوں کی خاصی قوت رہی ہے، مثلاً نیو انگلینڈ اور دولت عامہ کے زمانہ میں خود برطانیہ عظمیٰ میں، انھوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے اور خاصی کامیابی کے ساتھ کی ہے کہ ہر قسم کی عام دلچسپیوں کو اور تقریباً تمام نج کی تفریحوں کو بالخصوص ناچ گانا، کھیل تماشا، تھیٹر وغیرہ کو قطعاً بند کر دیا جائے۔ اب بھی اس ملک میں ایسے اشخاص کی ایک کثیر تعداد موجود ہے جن کے اخلاق اور مذہب کی رو سے یہ تمام تفریحات اور دل چسپیاں مذموم ہیں اور یہ لوگ زیادہ تر متوسط طبقہ میں سے ہیں جنکا اثر موجودہ معاشرتی و سیاسی زندگی پر سب سے زیادہ ہے۔ ایسی صورت میں یہ کسی طرح ناممکن نہیں ہے کہ ایسے خیالات رکھنے والوں کی کسی نہ کسی وقت میں پارلیمنٹ کے اندر اکثریت ہو جائے۔ اس صورت میں قوم کے باقی افراد ان تفریحات کو کیسا پسند کرینگے جو کالوین[1] اور میتھوڈسٹ[2]

---

[1] جان کالوین سولھویں صدی عیسوی میں سوئٹزرلینڈ کا ایک بہت بڑا عیسائی مصلح گزرا ہے۔ اسکے مذہبی خیالات وعقائد اگرچہ بہت کچھ مارٹن لوتھر اور دوسرے مصلحین سے ماخوذ ہیں لیکن اسکی قابلیت، طرز ادا اور انداز بیان نے اُسے اپنے پیشرووں سے بالکل جدا اور بعض حیثیتوں سے ممتاز کر دیا ہے۔

[2] میتھوڈسٹ، جان ویسلی کے پیرووں کو کہتے ہیں جو سولھویں صدی میں انگلستان کا ایک بہت بڑا مصلح گزرا ہے۔ اصل میں یہ لفظ پہلے اکسفورڈ کے ان طلبہ کے لئے استعمال کیا جاتا تھا جو جان ویسلی کے ساتھ ایک روحانی برادری قائم کرنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔ پھر بعد میں یہ لفظ اس کے تمام پیرووں کے لئے بولا جانے لگا۔

مذہب والوں کے اخلاقی و مذہبی جذبات پر مبنی ہوں؟ کیا خاص شدت کے ساتھ ان کی یہ دلی خواہش نہ ہوگی کہ یہ مقدس اور پاکباز لیکن دخل در معقولات کرنے والے افراد جماعت اپنے کام سے کام رکھیں؟ یہی ہر اس حکومت اور جمہور کے متعلق کہنا چاہیئے جو اس بات کی مدعی ہو کہ کسی شخص کو ایسی تفریحات میں حصہ نہ لینا چاہیئے جو ان کی رائے میں مضر ہوں۔ لیکن جس اصول کی بنا پر یہ دعویٰ کیا جاتا ہے وہ اگر تسلیم کر لیا جائے تو پھر کوئی اس بات پر اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتا کہ ملک کی اکثریت یا اور کوئی طاقت اس پر عمل نہ کرے۔ اور اگر نیو انگلینڈ[1] کے ابتدائی باشندوں جیسا مذہبی عقیدہ پھر دوبارہ زندہ ہونے میں کامیاب ہو گیا، جیسا کہ اکثر انحطاط پذیر مذاہب کے ساتھ ہوا ہے، تو ہر شخص کو یہی دولت مشترکہ کے اس تصور کو تسلیم کرنے کے لئے تیار رہنا چاہیئے جو ان کے ذہن میں تھا۔

ایک اور مثال لیجئے جس کا امکان پہلی مثال سے بھی زیادہ قوی ہے۔ ہر شخص اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ آجکل جماعت کو جمہوری نظام پر قایم کرنے کا ایک زبردست میلان نظر آتا ہے، خواہ اس کے ساتھ عام سیاسی ادارے ہوں یا نہ ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ ریاستہائے متحدہ امریکہ میں جہاں یہ میلان بہت کچھ عملی صورت اختیار کر چکا ہے، جہاں جماعت اور حکومت دونوں زیادہ سے زیادہ جمہوری نظام پر قایم ہیں، وہاں اکثریت کو یہ ناگوار ہے کہ کوئی شخص ایسے نمایشی یا قیمتی طریقہ پر رہے، جس کا مقابلہ وہ نہیں کر سکتے اور ان کا یہ جذبہ طریقۂ بود و باش کے متعلق قانون کا سا حکم رکھتا ہے اور ان ریاستہائے متحدہ کے

---

[1] نیو انگلینڈ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے شمال مغربی حصہ کا ایک مجموعی نام ہے۔ اسے امریکہ کی تاریخ میں "پیوریٹنوں کا وطن" کہتے ہیں جو تمام عیسائی فرقوں میں ایک بہت متشدد اور کٹر فرقہ ہے۔ ابتدا میں جبتک کہ یہاں کے لوگوں پر مذہبی اثر غالب رہا، اسکے تمام قوانین و انتظامات پر مذہبیت کی روح پائی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ جب تجارتی مفاد غالب آتا گیا، تو اسکے قوانین میں فرق آتا گیا۔ اور جواب دینی سے زیادہ دنیوی ہو گئے ہیں۔

اکثر حصوں میں ایک ایسے شخص کے لئے جو کثیر آمدنی رکھتا ہو، یہ ناممکن ہو کہ وہ اپنے حسب منشا جس طرح چاہے، اسے صرف کرے اور لوگ اس پر ناپسندیدگی کا اظہار نہ کریں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس قسم کے بیانات میں بہت کچھ مبالغہ بھی ہوتا ہے اور ان سے اصل واقعات کا اظہار نہیں ہوتا، لیکن جن حالات کا اظہار ہوتا ہے وہ محض کوئی خیالی یا امکانی شئے نہیں بلکہ جمہوری خیالات کا ایک ضروری نتیجہ ہے جس کے ساتھ یہ خیال بھی شامل رہتا ہے کہ وہاں کے جمہور کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہیں افراد کے طریقۂ معاشرت پر اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کر سکیں۔ اس کے بعد اگر ہم یہ فرض کرلیں کہ اشتمالیین کے خیالات کی خاص اشاعت ہو گئی ہے تو پھر اکثریت کی نظروں میں مال و جائداد کا کثیر مقدار میں رکھنا یا ایسی آمدنی پیدا کرنا جو بازو کی قوت سے حاصل نہ کی گئی ہو، مذموم قرار دیا جائے گا۔ اسی قسم کے خیالات آجکل بھی کاریگروں کی جماعت میں نہایت کثرت سے رائج ہیں اور جن لوگوں پر اس طبقہ کی رائے کا اثر ہے یعنی خود اس طبقہ کے افراد پر ان پر اس کا بہت گہرا اثر پڑ رہا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ برے کاریگروں کی جن کی کہ صنعت کی مختلف شاخوں میں اکثریت ہے، یہ رائے ہے کہ انھیں بھی اتنی ہی اجرت ملنی چاہیئے جتنی کہ اچھے کاریگروں کو ملتی ہے اور کسی شخص کو یہ اجازت نہ ہونی چاہیئے کہ وہ ہنر یا محنت سے کچھ اور کام کرکے زیادہ پیسے کمائے، جو دوسرے نہ کر سکتے ہوں۔ اور وہ اس کے لئے بہت سخت اخلاقی نگرانی رکھتے ہیں جو بعض وقت جسمانی نگرانی سے بدل جاتی ہے تاکہ کوئی کاریگر زیادہ مفید کام کرکے اور زیادہ پیسے نہ کمائے اور کوئی مالک اسے زیادہ دینے کی جرات نہ کرے۔ اگر جمہور کو لوگوں کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کا اختیار ہے، تو میں نہیں سمجھتا کہ یہ لوگ غلطی پر ہیں، یا یہ کہ کسی فرد کے مخصوص جمہور اس کے ذاتی معاملات میں اپنے ان اختیارات کو استعمال کرنے کی بنا پر قابل الزام قرار دیے

جا سکتے ہیں جو عموماً جمہور عام لوگوں پر استعمال کرتے ہیں۔

لیکن ایسے قیاسی و امکانی واقعات سے قطع نظر کر کے آجکل بھی بہت سے امور ایسے ہیں جن میں افراد کی ذاتی و شخصی آزادی غصب ہو رہی ہے اور اس سے بھی زیادہ کا آئندہ اندیشہ ہے اور اس قسم کے خیالات ظاہر کئے جا رہے ہیں کہ جمہور کو قانوناً نہ صرف ان امور کے روکنے کا پورا حق حاصل ہے، جنھیں وہ بُرا سمجھتے ہوں، بلکہ برے امور کے پتہ لگانے کی خاطر وہ بے خطا امور کو بھی روک سکتے ہیں۔

انسداد شراب نوشی کے نام پر ایک انگریزی نوآبادی اور تقریباً نصف ریاستہائے متحدہ کے لوگوں کو منشیات کے ہر قسم کے استعمال سے باستثنائے دوا ممانعت کر دی گئی ہے، کیونکہ امر واقعہ یہ ہے کہ فروخت شراب کا انسداد استعمال شراب کا بند کرنا ہے اور یہی مقصود بھی ہے۔ اور اگرچہ یہ قانون نفاذ کی عملی دشواریوں سے اکثر ریاستوں میں حتی کہ اس ریاست میں بھی جہاں کے نام پر اس کا نام رکھا گیا ہے، منسوخ ہو چکا ہے، تاہم بعض بہی خواہانِ بنی نوع اسی قسم کا ایک قانون پاس کئے جانے کی اس ملک میں بھی کوشش کر رہے ہیں۔ اس غرض کے لئے جو انجمن یا جیسا کہ وہ کہتے ہیں "اتحاد" بنایا گیا ہے، وہ اس خط و کتابت کے شائع کر دئے جانے کی وجہ سے بہت کچھ بدنام ہو چکا ہے، جو اس کے معتمد اور اس شخص کے درمیان ہوئی تھی جو انگلستان کے ان گنتی کے لوگوں میں سے ہیں جن کا خیال یہ ہے کہ ایک سیاسی شخص کی رائے ہمیشہ اصول پر مبنی ہونی چاہیئے۔ لارڈ اسٹینلی[1] نے اس خط و کتابت میں جو حصہ لیا ہے اس سے ان توقعات کو بہت تقویت ہوتی ہے جو ایسے لوگوں نے ان سے قائم

---

[1] اس نام کے متعدد اشخاص ہیں جنھیں آرتھر پنرِن اسٹینلی سب سے مشہور ہیں اور یہی غالباً یہاں پر مراد ہیں۔ (صفحہ آئندہ)

کر رکھی ہیں جو جانتے ہیں کہ جن صفات کا ثبوت لارڈ موصوف کے بعض پبلک کاموں سے ملتا ہے وہ بدنصیبی سے ان لوگوں میں بہت کمیاب ہیں جو ہماری سیاسی زندگی میں پیش پیش ہیں۔ ایسی انجمن کا جو ترجمان ہے، وہ "ایسے اصول سے اپنی سخت نفرت کا اظہار کرتا ہے جو توڑ مروڑ کر تعصب اور مذہبی تشدد کو جائز ثابت کرنے کے لئے پیش کیا جا سکے"۔ وہ کہتا ہے کہ اس قسم کے اور ہماری انجمن کے اصولوں میں "بہت بڑا اور عظیم الشان فرق ہے"۔ وہ فرماتے ہیں کہ تمام وہ معاملات جن کا تعلق خیال، رائے اور ضمیر سے ہو، میرے نزدیک قانون کی حد سے باہر ہیں اور جو معاملات اجتماعی امور، عادات اور تعلقات سے متعلق ہوں، قانون کی حدود کے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) یہ ۱۸۱۵ء میں انگلستان میں پیدا ہوئے۔ ان کی تعلیم شروع سے مذہبی طرز پر ہوئی اور اس بنا پر یہ ایک عیسائی مذہب کے اچھے فاضل بن کر چکے۔ ان کی شہرت کی ابتدا "حیات آرنلڈ" سے ہوئی جو ۱۸۴۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد سے ان کی مذہبی حلقہ میں بہت نمایاں حیثیت ہو گئی۔

ان کا تعلق شروع ہی سے اکسفورڈ یونیورسٹی سے رہا جہاں سے کہ انھوں نے تعلیم پائی اور پھر بعد میں اسی کی خدمت کے لئے انھوں نے اپنے کو وقف کر دیا۔ اس تعلیمی حلقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان میں وہ تعصب و تنگ نظری نہیں پیدا ہوئی جو عموماً کسی مذہب کے دینیات کے عالموں میں ہوا کرتی ہے، بلکہ یہ کلیسا کے ایک نہایت روشن خیال اور آزاد رائے مصلحین میں سے تھے، جن کو مختلف ملکوں کے سفر نے اور بھی چار چاند لگا دیئے تھے۔ ان کی زندگی کا بیشتر حصہ مذہبی مباحثوں اور جھگڑوں میں صرف ہوا۔ انھوں نے عیسائی مذہب پر کئی ایک کتابیں لکھیں۔ ان مباحث اور تصنیفات سے ان کا مقصد غریب طبقہ کی معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی اصلاح کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اپنی انہی خدمات کی بدولت ان کا نام آج انگلستان اور امریکہ کی تاریخ میں اس قدر روشن ہے۔

اندر ہیں اور اس باب میں اختیار تمیزی حکومت کو حاصل ہے فرد کو نہیں ہے" لیکن ایک تیسری قسم کا کوئی ذکر نہیں کیا گیا ہے جو ان دونوں سے بالکل مختلف ہے یعنی وہ افعال اور عادات جو اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی نوعیت رکھتے ہیں، اگرچہ بلاشبہ منشیات کے استعمال کا تعلق اسی قسم سے ہے۔ مانا کہ منشیات کا فروخت کرنا تجارت ہے اور تجارت ایک اجتماعی فعل ہے، لیکن جس دخل اندازی کی شکایت ہے، وہ فروخت کرنے والے کی آزادی کے ساتھ نہیں ہے، بلکہ خریدنے والے اور استعمال کرنے والے کی آزادی کے ساتھ ہے اس لئے کہ حکومت کا شراب کے حصول کو ناممکن کر دینا ایسا ہی ہے جیسا کہ اس کے پینے کو بھی منع کر دینا ہے۔ لیکن معتمد صاحب فرماتے ہیں کہ "بہ حیثیت ایک شہری کے مجھے حق ہے کہ جب کسی دوسرے کے اجتماعی فعل سے میرے اجتماعی حقوق کو صدمہ پہونچے، تو میں قانون کی چارہ جوئی کروں" اور "اجتماعی حقوق" کی تعریف انھوں نے یہ کی ہے کہ "اگر کوئی چیز میرے حقوق کو صدمہ پہونچا سکتی ہے تو منشیات کے فروخت سے یقیناً ایسا ہوتا ہے۔ اس سے جماعت میں ہمیشہ بدامنی و بدنظمی پیدا ہوتی رہتی ہے جس کی وجہ سے میرے تحفظ جان و مال کے اولین حق کو صدمہ پہونچتا ہے۔ اس سے میرے حق مساوات کو نقصان پہونچتا ہے، اس لئے کہ لوگ ایک ایسی لعنت سے نفع حاصل کرتے ہیں جس کو قایم رکھنے کے لئے محصول مجھے دینا پڑتا ہے۔ یہ میرے اخلاقی و ذہنی نشو و نما کے حق میں ایک رکاوٹ ہے، اس لئے کہ اس سے میرے راستہ میں بہت سے خطرات پیدا ہو جاتے ہیں اور اس سے جماعت کی حالت بہت خراب خستہ ہو جاتی ہے، جس سے امداد و اعانت طلب کرنے کا مجھے حق حاصل ہے۔" یہ "اجتماعی حقوق" کا ایک ایسا نظریہ پیش کیا گیا ہے، جیسا اس سے پیشتر غالباً کبھی تصریح کے ساتھ نہیں کیا گیا تھا اور اس کا مفہوم بس یہ ہے کہ ہر فرد کا اجتماعی حق ہے) کہ ہر دوسرا فرد ای

طرح عمل پیرا ہو جیسا کہ یہ خود اور جو کوئی اس میں ذرہ برابر بھی کوتاہی کرے وہ میرے اجتماعی حقوق کو صدمہ پہونچاتا ہے اور مجھے اس امر کا حق دیتا ہے کہ میں اس شکایت کو رفع کرنے کے لئے قانون سے چارہ جوئی کروں۔ اس قسم کا عجیب و غریب اصول آزادی میں ہر قسم کی مداخلت سے زیادہ خطرناک ہے آزادی میں ہر مداخلت اسکی رو سے حق بجانب قرار دیجا سکتی ہے یہ بجز اس کے اور کسی قسم کی آزادی کے حق کو تسلیم نہیں کرتا کہ اگر کوئی خاص رائے یا خیال رکھا جائے تو وہ چھپا کر اس لئے کہ میرے خیال کے مطابق جو رائے مضر ہے، وہ جہاں کسی دوسرے شخص کی زبان سے ظاہر ہوئی، وہیں میرے وہ تمام "معاشرتی حقوق" ضائع ہو گئے جو انجمن مذکور نے ابھی بتائے ہیں۔ اس نظریہ کے مطابق بنی نوع انسان کا آپس میں ایک دوسرے کی اخلاقی ذہنی بلکہ جسمانی تکمیل تک سے ایک خاص تعلق ہے، اور اس تکمیل کی تعریف ہر شخص پر چھوڑ دی گئی ہے کہ وہ اپنے معیار کے مطابق جیسا کہ چاہے اس کا تعین کرے۔

جہاں پر افراد کی جائز آزادی میں بیجا مداخلت کی ایک اور ضروری مثال بھی پیش کر دینا چاہتا ہوں جس کا نہ صرف اندیشہ ہے بلکہ جس پر ایک عرصہ سے عمل بھی ہوتا آرہا ہے، اس سے میری مراد اتوار کے دن چھٹی کے قانون سے ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک ضروریات زندگی اجازت دیں، ہفتہ میں روزانہ کے معمولی کاموں سے ایک دن پرہیز کرنا اگرچہ مذہبًا سوائے یہودیوں کے اور کسی پر فرض نہیں تاہم بہت مفید اور نفع بخش ہے۔ اور چونکہ اس رسم پر بلا سب کام کرنے والوں کی رضامندی کے عمل نہیں ہو سکتا، اور اگر کچھ آدمی اسدن کام کریں تو دوسروں کو بھی اس کی ضرورت پڑے، اس لئے مناسب اور صحیح یہ ہے کہ قانون تمام لوگوں سے اس رسم پر عمل کرانے کی ذمہ داری اپنے سر لے اور ایک مخصوص دن تمام بڑے بڑے کاروبار بند کرا دے۔ لیکن اس اصول کی وجہ سے

جس کی بنا اس امر پر ہے کہ ہر شخص کے اس چھٹی منانے نہ منانے سے دوسروں کا براہ راست تعلق ہے، یہ لازم نہیں آتا کہ اس دن وہ مشاغل بھی بند کر دئے جائیں جو ہم خود اپنی مرضی سے اختیار کرتے ہیں یا جن میں ہم اپنا چھٹی کا وقت صرف کرنا مناسب سمجھتے ہیں اور نہ یہ قانونی پابندی تفریحات کے روکنے میں کسی طرح قرین انصاف ہو سکتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک شخص کی تفریح دوسروں کے لئے دن بھر کا کام ہے لیکن ایک جماعت کثیر کی خوشی یا مفید تفریح ایک جماعت قلیل کی محنت و مشقت کے ہم پلہ ہے بشرطیکہ یہ جماعت قلیل اس کو خوشی سے اختیار کرے اور خوشی سے چھوڑ سکے۔ مزدوروں کا یہ خیال بالکل صحیح ہے کہ اگر سب لوگ اتوار کو کام کرنے لگیں تو سات دن کا کام صرف چھ روز کی اجرت میں کرنا پڑے گا، لیکن اگر کاروبار کا بیشتر حصہ بند رہے تو وہ قلیل جماعت جو دوسروں کی تفریح کے لئے کام کرتی رہتی ہے نسبتاً زیادہ کمائے گی اور اگر وہ آرام کو اجرت پر ترجیح دیں، تو کوئی انھیں ان کاموں کے لئے مجبور بھی نہیں کر سکتا۔ اور اگر اس کے علاوہ کوئی علاج درکار ہو تو وہ اس طرح ممکن ہو کہ ان مخصوص لوگوں کے لئے ہفتہ میں کوئی اور دن چھٹی کا مقرر کیا جائے۔ لہذا اتوار کے دن تفریحات کو روکنے کی اگر کوئی وجوہ ہو سکتی ہیں تو وہ صرف یہ کہ مذہباً ایسا کرنا ہے اور اس بنا پر اگر قانون بنایا جاتا ہے تو اسکے خلاف جتنی سختی سے احتجاج کیا جائے کم ہے۔

آیا اس کے ثابت کرنے کی ضرورت ہے کہ جماعت یا اس کے کسی عمال کو بارگاہ خداوندی سے یہ حکم ملا ہے کہ وہ اس جرم کا بدلہ لیں جو ان کے خیال میں قادر مطلق کے خلاف تو ہے لیکن اس سے بنی نوع کو کوئی نقصان نہیں پہونچا ہے۔ یہی خیال کہ ایک شخص کا فرض ہے کہ وہ دوسرے کو مذہبی بنائے، گزشتہ زمانہ کی تمام مذہبی سختیوں اور مظالم کا سب سے بڑا باعث رہا ہے اور اگر اسے تسلیم کر لیا جائے تو یہ سب باتیں بھی قرین انصاف ہو جائیں گی۔ اتوار کے

دن ریلوے سفر کو روکنے، عجائب خانہ کو بند کرنے اور اسی طرح کی متعدد بار جو کوششیں کی گئی ہیں، ان سے اگرچہ قدیم زمانہ کے مظالم کرنے والوں کی سختی، سنگدلی اور بے رحمی نہیں ظاہر ہوتی، تاہم ان حرکات سے جس ذہنیت کا اظہار ہو رہا ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو ان کے مذہب کے مطابق عمل کرنے دینا نہیں چاہتے، اس لئے کہ ان باتوں کی ان کے اپنے مذہب نے اجازت نہیں دی ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ خدا اس منکر کے افعال کو یہی نہیں کہ ناپسند کرتا ہو بلکہ ان کا عقیدہ ہے کہ اگر انھوں نے اس کو اس کے حال پر چھوڑ دیا تو وہ خود ان کو بھی بلا بازپرس کئے نہ چھوڑے گا۔

انفرادی آزادی کو نقصان پہونچانے کی ان مثالوں کے علاوہ سخت اور تشدد آمیز زبان (استعمال کئے جانے) کی مثال دینے سے میں باز نہیں رہ سکتا جو اکثر ہمارے ہاں کے اخبارات مارمونی[1] مذہب کے متعلق لکھتے ہوئے استعمال کرتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس خلاف توقع اور عبرت انگیز واقعہ پر بہت کچھ کہا جا سکتا ہے کہ آج اخبار، ریل اور تار کے زمانہ میں ایک نئی وحی نازل ہوئی ہے اور اس کی بنا پر ایک مذہب قایم کر دیا گیا ہے جو سرتاسر ریاکاری اور فریب کا نمونہ ہے اور جس کے بانی میں ایسے غیر معمولی اوصاف بھی تو نہیں کہ جن سے اس نئے مذہب کا کچھ اقتدار قایم رہ سکے، پھر بھی ہزاروں، لاکھوں

---

[1] یہ ایک مذہبی فرقہ تھا جو انیسویں صدی کے ربع میں امرکیہ کی ایک ریاست نیویارک میں قائم ہوا تھا۔ اس کے عقاید میں ایک سب سے بڑا عقیدہ تعدد ازدواج کا تھا جسکی وجہ سے یورپ اور امرکیہ دونو براعظموں میں اس فرقہ کے ماننے والوں پر بہت سختیاں ہوئیں حتی کہ انھیں ان کے وطن سے بھی خارج کر دیا گیا جسکو تمام خس و خاشاک سے پاک کرکے انھوں نے خود بسایا تھا۔

آدمی اس کے ماننے والے ہیں اور اسے ایک سوسائٹی کا سنگِ بنیاد بنایا گیا ہے۔ لیکن یہاں جس چیز سے ہمیں تعلق ہے، وہ یہ کہ دوسرے اور بہتر مذاہب کی طرح اس مذہب میں بھی لوگوں نے اپنی جانیں قربان کی ہیں، اس مذہب کے نبی اور بانی کو بھی عوام کی ایک جماعت نے اس کی تعلیمات کی وجہ سے شہید کر ڈالا، اور اس کے دوسرے پیروانِ مذہب بھی اسی تشدد کے قربان ہوئے۔ انھیں سب کو ان کے ملک سے جلا وطن کیا گیا اور اب جب کہ وہ ایک غیر آباد، ویران جگہ میں بھیج دیے گئے ہیں، ہمارے ہاں بہت لوگ اب بھی ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ (اگر دقت نہ ہو تو) ایک فوج بھیجی جائے جو انھیں دوسرے لوگوں کی رائے پر عمل کرنے کے لئے مجبور کرے۔ اس مارمونی مذہب کے عقائد میں سب سے زیادہ اشتعال انگیز جو چیز ہے، اور جس کی وجہ سے لوگ مذہبی رواداری کے عام حدود ترک کرتے ہیں وہ تعددِ ازدواج کی اجازت ہے، جو اگرچہ مسلمانوں، ہندوؤں اور چینیوں کے لئے جائز ہے لیکن اگر ایسے لوگ اس پر عمل کریں جو انگریزی زبان بولتے ہیں اور کسی نہ کسی صورت میں عیسائی مذہب رکھنے کے مدعی ہیں تو اس سے نفرت و عداوت کی ایسی آگ بھڑک اٹھتی ہے کہ بجھائے نہیں بجھتی۔ لیکن مارمونی مذہب کے اصول سے جتنی مجھے نفرت ہے اتنی شاید ہی کسی اور کو ہو، جس کی منجملہ اور وجوہ کے ایک سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ یہ اصول آزادی کے بالکل منافی پڑتا ہے۔ ان کا یہ اصول قوم کے نصف حصہ کو تو زنجیروں میں جکڑ دیتا ہے اور باقی نصف کو فریقِ ثانی کے حقوق ادا کرنے کی ذمہ داری سے بالکل آزاد کر دیتا ہے۔ تاہم یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ تعلق عورتوں کی طرف سے جنھیں اس سے نقصان پہنچتا ہے اسی طرح بالکل خود اختیاری ہوتا ہے جس طرح شادی کے اور طریقے ہو سکتے ہیں اور یہ بات خواہ کتنی ہی حیرت انگیز کیوں نہ معلوم ہو لیکن عورتیں سمجھتی ہیں کہ بہت سی بیویوں میں سے ایک ہونا

بہتر ہے، بہ نسبت اس کے کہ سرے سے کسی کی بیوی ہی نہ ہوا جائے۔ اس کی وجہ دنیا کے عام خیالات اور رسوم ہیں جو عورت کو سکھاتے ہیں کہ اس کے لئے بس شادی ہی ایک ضروری چیز ہے۔ دوسرے ممالک سے اس قسم کے تعلقات کو تسلیم کرنے کی درخواست نہیں کی جاتی ہے اور نہ ان سے یہ کہا جاتا ہے کہ وہ مارمونی رایوں کی خاطر اپنے باشندوں کے کسی حصہ کو اپنے قوانین کی پابندیوں سے آزاد کر دیں۔ لیکن جب انھوں نے اپنے مخالفین کے جذبات کا اس سے زیادہ لحاظ کیا ہے، جتنا ان سے مطالبہ کیا جا سکتا ہے، جب انھوں نے ان ممالک کو بالکل چھوڑ دیا ہے، جہاں ان کے اصول تسلیم نہیں کئے گئے اور دنیا کے ایک ایسے گوشہ میں جا بسے ہیں، جسے انھوں نے پہلی بار انسان کے رہنے کے قابل بنایا، تو پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ انھیں کن اصولوں کے ماتحت وہاں رہنے نہیں دیا جاتا ہے، خواہ وہ وہاں جس قانون کے ماتحت چاہیں رہیں بشرطیکہ وہ دوسری قوموں کے ساتھ کوئی جارحانہ کارروائی نہ کریں اور جو لوگ ان کے طریقہ کو پسند نہ کریں، ان کو چلے جانے کی پوری آزادی دیں۔ ابھی حال میں ایک مصنف نے جو بعض اعتبار سے خاصی حیثیت رکھتے ہیں ان کے خلاف "جنگ صلیبی" نہیں بلکہ "جنگ تہذیب" کی تجویز کی ہے، تاکہ تعدد ازدواج کی اس خلاف تہذیب رسم کو مٹایا جا سکے۔ مجھے بھی یہ رسم ایسی ہی نظر آتی ہے لیکن میں نہیں سمجھتا کہ کسی قوم کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ دوسری قوم کو بجبر و اکراہ مہذب اور متمدن بنائے تاوقتیکہ وہ لوگ جنھیں برے قوانین سے نقصان پہونچتا ہو، دوسری قوموں سے امداد کا مطالبہ نہ کریں۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایسے لوگوں کو جو ان سے بالکل غیر متعلق ہوں، اس میں دخل دینے کا کوئی حق حاصل ہے اور وہ یہ مطالبہ کسی طرح بھی کر سکتے ہیں کہ وہ صورت حالات جس سے تمام متعلقین مطمئن معلوم ہوتے ہوں، صرف اس وجہ سے بدل دیجائے

کہ وہ ان کے نزدیک بری ہے جو ہزاروں میل دور رہتے ہیں اور جنھیں اس سے کوئی واسطہ اور تعلق نہیں ہے وہ اگر چاہیں تو اس کے خلاف وعظ و نصیحت کے لئے اپنے مبلغین بھیج سکتے ہیں اور اپنے لوگوں میں اس قسم کے عقائد اور اصول کی ترویج کو جائز طریقہ سے روک سکتے ہیں (لیکن اُن کے مبلغین کی زبان بند کرنا جائز طریقہ نہیں ہے) ایک زمانہ تھا جب کہ دنیا میں وحشت و بربریت کا دور دورہ تھا لیکن تہذیب و تمدن نے پھر بھی ان کی جگہ لے لی آج جب بربریت اچھی طرح دب چکی ہے تو یہ اندیشہ کرنا فضول ہے کہ وحشت و بربریت کا زمانہ پھر نہ لوٹ آئے اور تہذیب و تمدن کو مغلوب کرے۔ جو تمدن کہ اپنے مغلوب دشمن سے اس طرح شکست کھا جائے، وہ پہلے ہی اس قدر کھوکھلا ہو چکا ہو گا کہ یہ تمام اپنے بڑے سے بڑے پروہتوں اور معلموں کے سنبھالے سنبھل سکے گا نہ کسی اور کے۔ اگر ایسا ہی ہے تو ایسا تمدن جس قدر جلد ختم ہو جائے، بہتر ہے۔ یہ روز بروز بد سے بدتر ہو جائے گا تاوقتیکہ (مغربی سلطنت کی طرح) کوئی مضبوط اور زبردست بربریت تباہ کر کے پھر دوبارہ زندہ نہ کر دے۔

باب پنجم

مثالیں

جن اصول و مبادیات کا ان صفحات میں ذکر کیا گیا ہے، انھیں قبل اس کے کہ گونہ کامیابی کے ساتھ حکومت اور اخلاق کے مختلف شعبوں پر منطبق کیا جا سکے، ضرورت ہے کہ تفصیلات پر بحث کرنے کے لیے ان کو زیادہ عام طور پر پورا پورا اساس تسلیم کر لیا جائے۔ میں چند فروعی مسائل جو اس موقع پر بیان کرنا چاہتا ہوں، ان سے میری غرض ان مبادیات کی تشریح و توضیح کرنا ہے، نہ یہ کہ ان کا پورا پورا انطباق منظور ہے۔ میں یہاں ان اصولوں کی تطبیق کی تفصیل نہیں کرنا چاہتا بلکہ اس تطبیق کے چند نمونے پیش کرنا چاہتا ہوں، ان سے ان دو اصولوں کے جو باہم ملکر اس مقالہ کا خاص موضوع ہیں، معانی اور حدود نہایت وضاحت کے ساتھ ظاہر ہو جائیں گے اور جہاں یہ فیصلہ کرنا دشوار ہو کہ ان دونوں میں سے یہاں کونسا اصول منطبق ہوتا ہے، وہاں ان کے درمیان حد فاصل قایم کرنے میں مدد ملے گی۔

ان اصولوں میں سے پہلا یہ ہے کہ افراد اپنے اُن افعال کے لئے سوسائٹی کے سامنے کسی طرح جواب دہ نہیں ہیں، جن کا تعلق سوائے ان کے اور کسی سے نہ ہو۔ پند و نصیحت تعلیم و تلقین، ترغیب و تحریص، اجتناب و مقاطعہ (اگر اپنے مفاد کے خیال سے وہ اسے ضروری سمجھیں) یہی وہ ذرائع ہیں جن سے سوسائٹی ان کے افعال سے اپنی ناپسندیدگی

یا نفرت کا اظہار کر سکتی ہو۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ افراد اپنے ایسے افعال کے لئے جو دوسروں کے مفاد سے مضر ہیں، سوسائٹی کے سامنے جواب دہ ہیں اور وہ ان افعال پر معاشرتی یا قانونی سزا دے سکتی ہے، اگر اس کے نزدیک ان میں سے کوئی طریقہ سزا اس کے تحفظ کے لئے ضروری ہو۔

اولاً تو یہ کسی طرح نہ سمجھنا چاہیئے کہ چونکہ دوسروں کے مفاد کو نقصان پہونچنے یا اس کے امکان کی بنا پر سوسائٹی کو دخل دینے کا حق حاصل ہے، اس لئے وہ ہر ایسی صورت میں دخل دے سکتی ہے، اور یہ دخل دینا حق بجانب ہے۔ بہت سے ایسے معاملات ہیں جن میں ایک شخص کے جائز فعل سے دوسروں کو لازماً اور اسلئے جائز طور پر نقصان یا صدمہ پہونچتا ہے، یا دوسرے کسی ایسے فائدہ سے محروم ہو جاتے ہیں جس سے مستفید ہونے کی انھیں جائز توقع ہوتی ہے۔ افراد میں اس قسم کا تخالفِ مفاد اکثر بعض خراب معاشرتی رسموں سے ہوتا ہے، اور جب تک یہ رسمیں ہیں یہ تخالف بھی رہے گا اور کچھ نہ کچھ تخالف تو ہر معاشرتی نظام میں باقی رہے گا۔ جو شخص مقابلہ کے امتحان میں یا ایک ایسے پیشہ میں کامیاب ہو جاتا ہے جس کے لئے بہت سے لوگ کوششیں کرتے ہیں، یا کسی ایسی چیز میں جس کے لئے دو آدمی کوشش کر رہے ہوں، ایک کو دوسرے پر ترجیح دیجاتی ہے تو ان تمام صورتوں میں ایک شخص لازمی طور سے دوسروں کے نقصان اور ان کی ناکامی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ لیکن تمام لوگ تسلیم کرتے ہیں کہ اس قسم کا مقابلہ و موازنہ عام بہبودِ انسانی کے لئے مفید ہے اور لوگوں کو اس قسم کے نتائج کا لحاظ کئے بغیر سعی و کوشش کرنی چاہیئے۔ دوسرے الفاظ میں سوسائٹی ناکام مقابلہ کرنے والوں کا قانونی یا اخلاقی کسی قسم کا کوئی حق تسلیم نہیں کرتی ہے کہ وہ اس قسم کے نقصانات کی تلافی یا ان سے محفوظ رہنے کا کوئی مطالبہ کر سکیں، اور صرف

اسی صورت میں مداخلت کو جائز سمجھتی ہے جب کہ کامیابی کے لئے ایسے ذرائع اختیار کئے جائیں جو عام مفاد کے خلاف ہوں یعنی دھوکہ یا فریب اور جبر یا اکراہ۔

ایک دوسری مثال لیجیے۔ تجارت ایک معاشرتی کام ہے، جو شخص کسی قسم کی چیز بیچتا ہے وہ دوسروں کے مفاد (پیداوار اس طرح) گویا عام سوسائٹی کے مفاد پر اثر ڈالتا ہے اور اس طرح اس کا یہ فعل اصولاً سوسائٹی کے اختیارات کے اندر آجاتا ہے۔ چنانچہ ایک وقت تھا جب کہ بعض اہم حالات میں حکومت کا یہ فرض خیال کیا جاتا تھا کہ وہ اشیاء کی قیمت مقرر کرے اور مصنوعات کے بنانے کے طریقے خود تجویز کرے لیکن ایک عرصہ کی کشمکش کے بعد اب یہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ ارزانی اور خوبیٔ اشیاء کا دار ومدار صرف اس پر ہے کہ ان کے بنانے والوں اور فروخت کرنے والوں کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جائے اور خریدنے والوں کو بھی ویسی ہی آزادی ہو کہ وہ جہاں سے چاہیں، اپنے لئے چیزیں خرید سکیں۔ اسی کا نام "آزاد تجارت" ہے، جس کی بنیاد اس سے بالکل مختلف گو ویسے ہی مضبوط اصولوں پر قائم ہے، جو انفرادی آزادی کے لئے اس مقالہ میں بیان کئے گئے ہیں۔ تجارت یا تجارت کی غرض سے صنعت پر جو پابندیاں عاید کی جاتی ہیں، وہ حقیقت میں رکاوٹیں ہیں اور تمام رکاوٹیں بہ حیثیت رکاوٹ ایک طرح کی برائی ہیں، لیکن یہ رکاوٹیں اعمال کے جس حصہ پر عاید ہوتی ہیں، وہ وہی ہیں جو سوسائٹی کے حدود و اختیارات کے اندر ہیں اور وہ نامناسب اس وجہ سے ہیں کہ ان سے حقیقت میں وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا جو ان سے حاصل کرنا مقصود ہے۔ چونکہ "آزاد تجارت" کے نظریہ میں انفرادی آزادی کا اصول شامل نہیں ہے، اس لئے اکثر ان معاملات میں بھی جو اس نظریے سے پیدا ہوتے ہیں، اس کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، مثلاً یہ کہ آمیزش کے

معاملہ میں اس فریب دہی کو روکنے کے لئے جمہور کو کس قدر اختیار ہے، یا یہ کہ مزدوروں کی صحت و صفائی اور تحفظ و سلامتی کا انتظام کرنا آجروں پر کہاں تک فرض ہے؟ ان معاملات میں آزادی کا سوال صرف اسی حد تک ہے کہ ان پر قابو رکھنے کی بجائے ان کو آزاد چھوڑ دینا زیادہ بہتر ہے لیکن اصولاً اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان اغراض کے لئے ان پر پابندیاں عاید کرنا قانوناً بالکل جائز ہے۔ لیکن ساتھ ہی تجارت میں مداخلت کرنے کے بہت سے ایسے معاملات بھی ہیں جن میں آزادی کا سوال خاص طور سے پیدا ہوتا ہے، مثلاً مین[1] لا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، چین میں افیون کی درآمد کو روکنا، سمیات کے فروخت پر قیود لگانا، غرض ان تمام معاملات میں اس دخل اندازی کا مقصد یہ ہے کہ ان چیزوں کا دستیاب ہونا ناممکن یا دشوار ہو جائے۔ یہ مداخلت اس بنا پر قابل اعتراض ہے کہ اس سے بنانے والے یا بیچنے والے کی آزادی کو صدمہ نہیں پہونچتا، بلکہ خریدنے والے کی آزادی کو نقصان پہونچتا ہے۔

ان میں سے ایک یعنی سمیات کی فروخت کی مثال سے ایک نیا سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ پولیس کے اختیارات کے مناسب حدود کیا ہیں؟ جرم یا حادثہ کے انسداد کی غرض سے ایک شخص کی آزادی کو کہاں تک کم کیا جا سکتا ہے؟ یہ حکومت

[1] مین ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست ہے جو شمال و مشرق کی جانب بالکل آخری ریاست ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اسکے قوانین ہیں اور جنہیں بھی بالخصوص مسکرات سے متعلق قوانین ہیں۔ یوں تو امریکہ بھر میں شراب کا استعمال اور اسکی خرید و فروخت قانوناً ممنوع قرار دیدی گئی ہے اور انہیں بھی مین سب سے پہلی ریاست تھی جس نے ۱۸۴۶ء میں سب سے پہلے اس کی خرید و فروخت کو قانوناً بالکل ممنوع قرار دیا لیکن یہ سختی زیادہ عرصہ باقی نہیں رہی اور ۱۸۵۱ء میں اس قانون میں ایک ترمیم کی گئی جسکی رو سے اسکا استعمال دواؤں وغیرہ کے لئے مستثنیٰ قرار دیا گیا۔ اور اس ترمیم کے مطابق ان ضروریات کے لئے شراب کا حصول بیکہ بعد دیگرے متعدد حکام کے ذریعہ سے ہو سکتا ہے لیکن عام جذبات قانون کی اس سختی کا ساتھ نہ دیسکے اور عام لوگ برابر اسکی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں جسکی وجہ سے ایک بہت مضبوط تحریک اس قانون کو منسوخ کرنے کے لئے ریاست میں کام کر رہی ہے اور ریاست کے سنجیدہ طبقہ کا یہ خیال ہے کہ قانون کی اس سختی سے بجائے فائدہ کے الٹا نقصان ہوا دیکھو حاشیہ صفحہ ۱۶۷ م

کا ایک مسلّمہ فرض ہے کہ وہ ارتکاب جرم سے قبل اس کے انسداد کی مناسب تدابیر اختیار کرے اور ارتکاب جرم کے بعد اس کی گرفت کرے اور اس پر سزا دے۔ بہرحال حکومت کا یہ اول الذکر فرض آزادی کے حق میں موخر الذکر فرض سے زیادہ خطرناک ہے کیونکہ انسان کی کوئی جائز سے جائز آزادیِ فعل بھی مشکل سے ایسی ہوگی جس سے کسی نہ کسی جرم کا امکان ظاہر نہ کیا جا سکے۔ چنانچہ اگر کوئی سرکاری افسر یا عام آدمی کسی شخص کو جرم کی تیاری کرتے ہوئے دیکھے تو اس پر یہ لازم نہیں کہ وہ اس وقت تک خاموش کھڑا دیکھا کرے جب تک کہ جرم کا ارتکاب نہ ہو جائے بلکہ وہ اسے فوراً روک سکتا ہے۔ اگر سمیات بجز جان لینے کے اور کسی کام کے لئے خریدی یا استعمال نہ کی جائیں تو البتہ ان کے بنانے اور فروخت کرنے کا روکنا مناسب ہو سکتا تھا۔ ان کی ضرورت نہ صرف ایسے کاموں میں ہو سکتی ہے جن سے کوئی نقصان نہ ہو بلکہ وہ بہت مفید اغراض کے لئے بھی استعمال ہو سکتے ہیں اور ایسا کسی طرح نہیں ہو سکتا کہ ایک غرض کے لئے قیود عائد کی جائیں اور دوسرے پر ان کا کوئی اثر نہ ہو۔ علاوہ اس کے ایک اور مثال لیجئے۔ حادثے کو روکنا سرکاری افسران کا ایک مناسب فرض ہے۔ اگر کوئی سرکاری افسر یا عام آدمی ایک شخص کو ایک ایسے پل پر سے گزرتا ہوا دیکھے جو غیر محفوظ ہو اور اس کو اس خطرے سے آگاہ کرنے کا موقع نہ ہو تو وہ اس کو ہاتھ پکڑ کر بلا اس کی آزادی کو کوئی حقیقی نقصان پہونچائے وہاں سے واپس لا سکتا ہے، اس لئے کہ آزادی کی ضرورت ان افعال میں ہوتی ہے جو ایک شخص کرنا چاہے اور ظاہر ہے کہ وہ دریا میں گرنے کی کبھی نہیں خواہش کرے گا۔ تاہم جب نقصان کا کوئی یقین نہ ہو بلکہ صرف اندیشہ ہو تو اس شخص سے بہتر کوئی اور اس کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتا ہے جو اس خطرہ میں پڑنے کو تیار ہو۔ لہذا اس صورت میں (بشرطیکہ وہ بچہ یا دیوانہ نہ ہو یا جوش و

محویت کی حالت میں نہ ہو جس میں وہ اپنی قوت فکریہ کو استعمال نہ کر سکتا ہو) اُسے صرف خطرہ سے آگاہ کر دینا چاہیئے نہ یہ کہ زبردستی اُس کو روکا جائے۔ اسی قسم کے خیالات ایسے مسائل میں جیسے فروخت سمیات کا معاملہ ہوا، اگر ملحوظ رکھے جائیں تو ہمیں اس مسئلہ کے طے کرنے میں بہت آسانی ہو گی کہ کون سے قوانین اس کے منافی ہیں اور کون سے نہیں۔ اس قسم کی کوئی تدبیر مثلاً زہر کے ساتھ کوئی چٹ لگا دی جائے جس سے لوگوں کو معلوم ہو سکے کہ اس میں زہر ہے، اگر اختیار کیجائے تو اس سے شخصی آزادی کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ خریدنے والا یہ کبھی نہ چاہے گا کہ وہ نہ جانے کہ اس کے ہاتھ میں جو چیز ہے وہ زہریلا اثر رکھتی ہے۔ لیکن اگر ہر صورت میں طبی سند مطلوب ہو تو اس میں نہ صرف یہ کہ مفت میں پیسے خرچ ہوتے ہیں بلکہ بعض وقت شے مطلوبہ کا حصول جائز کاموں کے لئے ناممکن بھی ہو جاتا ہے۔ اس کی بہترین صورت کہ ارتکاب جرم بھی نہ ہو اور افراد کی آزادی کو بھی صدمہ نہ پہنچے، یہ ہے کہ بنتھیم کے الفاظ میں "پہلے سے شہادت مہیا کر لی جائے"۔ اس طریقہ سے ہر ایک شخص واقف ہے جو ہمیشہ معاہدوں میں برتا جاتا ہے۔ یہ عام طور سے ہوتا ہے اور درست بھی ہے کہ جب کوئی معاہدہ ہو جاتا ہے تو قانون اس کے نفاذ کے لئے صرف یہ چاہتا ہے کہ معاہدے کے وقت چند ضابطہ کی کارروائیاں مثلاً دستخط اور گواہوں کی شہادتیں وغیرہ قلمبند کر لی گئی ہوں تاکہ بعد میں اگر کوئی معاملہ اُٹھے تو یہ ثابت کیا جا سکے کہ واقعتہً اس قسم کا معاہدہ ہوا اور اس وقت کوئی ایسے اسباب نہ تھے جن سے یہ معاہدہ قانوناً ناجائز قرار دیا جا سکے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جعلی معاہدے بہ مشکل ہوتے ہیں یا ایسے حالات کے اندر نہیں ہوتے جو اگر معلوم ہو جائیں تو قانون انھیں ناجائز قرار دیدے۔ اسی قسم کی تدابیر ان اشیاء کے فروخت

میں بھی اختیار کرنی چاہئیں جن سے ارتکاب جرم کا احتمال ہو۔ مثلاً فروخت کرنے والا بیچنے کا ٹھیک ٹھیک وقت خریدنے والے کا نام اور پتہ اس چیز کی صحیح قسم اور مقدار یہ سب ایک رجسٹر میں درج کرے اور خریدنے والے سے یہ بھی دریافت کرے کہ وہ کس غرض سے اسے خرید رہا ہے اور اس کا جواب بھی لکھ لے۔ اگر کوئی طبی نسخہ نہ ہو تو ایک تیسرے شخص کی شہادت بھی قلمبند کر لی جائے تاکہ بعد میں اگر یہ معلوم ہو جائے کہ شے مطلوبہ ناجائز کام کے لئے استعمال کی گئی ہے تو بایع کو قائل کیا جا سکے۔ اس قسم کے قواعد اور قانون سے اصل شے کے حاصل کرنے میں تو عموماً کوئی زیادہ رکاوٹ نہ ہوگی لیکن یہ بہت مشکل ہو جائے گا کہ اسے بیجا استعمال کیا جائے اور پتہ نہ چلے۔

جماعت کو بہ طور حفظ ماتقدم کے انسداد جرائم کا جو حق حاصل ہے اس سے ہمارے اس اصول کی ایک بین حد مقرر ہو جاتی کہ ایک بالکل ہی ذاتی فعل میں انسداد یا سزا کے خیال سے مداخلت نہیں کیجا سکتی۔ مثلاً عام حالات میں شراب پینے پر قانونی مداخلت کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ لیکن ایسی صورت میں میں اسے بالکل جائز سمجھوں گا کہ اگر ایک شخص نے شراب پی کر کوئی جرم کیا ہو تو اسے اس مرتبہ قانونی حدود کے اندر رکھنا چاہیئے اور یہ حدود اسکی ذات تک محدود ہوں اگر اس نے بعد میں شراب پی تو وہ سزا کا مستحق ہوگا اور اگر اس حالت میں بھی اسنے کوئی جرم کیا تو وہ سزا اور سخت ہونی چاہئے جس شخص کیلئے شراب کا پینا دوسروں کے نقصان کا باعث ہو اس صورت میں اس کا یہ فعل دوسروں کے خلاف ایک جرم ہوگا اسیطرح کاہلی بھی تاوقتیکہ وہ شخص لوگوں سے کوئی امداد نہ پاتا ہو یا اس سے کوئی نقض عہد نہ ہوا اسوقت تک انصاف کی رو سے اسکے جرم پر کوئی سزا نہیں دیجا سکتی ہے لیکن اگر کاہلی یا اور کسی دوسری غیر ضروری وجہ سے

وہ دوسروں کے ان فرائض کو ادا نہیں کر رہا ہے مثلاً وہ بال بچوں کی پرورش میں غفلت برتتا ہے تو ان صورتوں میں اگر کوئی اور ذرائع نہ ہوں، اس فرض کے ادا کرنے کیلئے اس سے جبریہ محنت لینا کوئی ظلم نہ ہوگا۔

علاوہ اس کے بہت سے افعال ایسے ہیں جو اگر براہ راست صرف فاعل کے حق میں ضرر رساں ہوں تو انھیں قانوناً ممنوع قرار نہیں دینا چاہیے لیکن وہی اگر عام طور سے کئے جائیں تو ان سے نیک اخلاق کو نقصان پہنچتا ہے اور اس طرح چونکہ وہ ان جرائم کے حدود میں آجاتے ہیں جن کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے لہذا انھیں بجا طور پر ممنوع قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس قسم میں وہ جرائم داخل ہیں جو اخلاق و تہذیب کے منافی ہوں جس پر زیادہ بحث کرنا غیر ضروری ہے اور زیادہ تر اس وجہ سے کہ ان کا تعلق ہمارے مضمون سے محض بالواسطہ ہے اور بہت سے افعال تو ایسے ہوتے ہیں جو بذات خود خراب نہیں ہوتے نہ خراب سمجھے جاتے ہیں لیکن ان کا منظر عام پر کیا جانا قابل اعتراض ہوتا ہے۔

ایک اور سوال بھی ہے جس کا جواب انہی اصولوں کے ماتحت جو اوپر بیان کئے گئے ہیں تلاش کرنا چاہیئے۔ ایسے ذاتی معاملات میں جو قابل الزام تو ہوں لیکن جن پر انفرادی آزادی کی وجہ سے کوئی روک ٹوک یا سزا نہیں ہو سکتی لیکن یہ کہ اس کا خمیازہ براہ راست خود فاعل ہی کو بھگتنا پڑے گا تو پھر ایسی صورت میں جس کے لئے فاعل کو پوری آزادی حاصل ہے کیا دوسرے لوگوں کو بھی صلاح و مشورہ دینے یا ترغیب و تحریص کی ویسی ہی آزادی ہو سکتی ہے؟ یہ سوال دقت سے خالی نہیں ہے۔ ایک شخص جو دوسروں کو ایک فعل کے کرنے کا مشورہ دیتا ہے اس کا یہ فعل ایک خالص ذاتی فعل نہیں ہے کسی شخص کو رائے و مشورہ دینا یا ترغیب و تحریص ایک اجتماعی فعل ہے اور اس بنا پر اسے منجملہ ان دوسرے افعال کے جن کا اثر دوسروں پر جا کر پڑتا ہے، جماعت کے حدود و اختیارات کے اندر سمجھا جاسکتا۔

ہے۔ لیکن ذرا سا غور کرنے سے یہ خیال فوراً رفع ہو سکتا ہے اور یہ دکھایا جا سکتا ہے کہ اگرچہ یہ فعل انفرادی آزادی کی تعریف کے اندر نہیں آتا ہے تاہم انفرادی آزادی کے جو دلائل ہیں وہ اس پر پورے پورے صادق آتے ہیں۔ اگر لوگوں کو اپنے ذاتی معاملات میں خود اپنی ذمہ داری کے اوپر اپنے حسب منشا کام کرنے کی اجازت دی جاتی ہے تو اسی طرح انھیں آپس میں صلاح و مشورہ، تبادلۂ خیالات و آرا، کی بھی اجازت دیجانی چاہیئے جس فعل کے خود کرنے کی اجازت دی جائے، اس کے متعلق رائے و مشورہ دینے کی بھی اجازت دیجانی چاہیئے۔ یہ سوال صرف اس صورت میں مشکوک ہو جاتا ہے جب کہ ترغیب دینے والا اپنے صلاح و مشورہ سے کوئی ذاتی نفع اور فائدہ اٹھانا چاہتا ہو، یا جب کہ وہ اس چیز کو اپنے مالی نفع یا روزی کا ذریعہ بنائے جسکو جماعت اور ریاست دونوں برا خیال کرتی ہوں۔ اس وقت حقیقت میں ایک نئی پیچیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ ایسے اشخاص کی جماعتوں کا وجود ہے جن کا مفاد بہبود عامہ کے خلاف ہے اور جن کا طریقۂ معاشرت اس بہبود کی نفی کرتا ہے۔ اس میں مداخلت ہونی چاہیئے یا نہیں؟ مثال کے طور پر لیجیے، زناکاری و قماربازی کو قطعی گوارا کیا جا سکتا ہے لیکن کیا ایک شخص کو آزادی ہونی چاہیئے کہ وہ دلالہ ہو یا قمارخانہ قائم کرے؟ یہ باتیں ان مسائل میں سے ہیں جو دونوں اصولوں کے ٹھیک سرحد پر واقع ہیں اور فوراً یہ نہیں معلوم ہو سکتا ہے کہ ان مسائل کا ان دونوں میں سے کس سے صحیح تعلق ہے۔ دونوں طرف دلائل مل سکتے ہیں۔ روا داری برتے جانے کی جانب سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی فعل کو بہ طور پیشہ کے اختیار کرنا اور اس کے ذریعہ سے روزی یا نفع کمانا اس چیز کو جرم نہیں بنا سکتا جو بصورت دیگر بالکل جائز ہوتی، وہ فعل یا تو ہمیشہ جائز سمجھا جانا چاہیئے یا ہمیشہ ممنوع قرار پا جانا چاہیئے جن اصولوں کی ہم اب تک

مدافعت کرتے آئے ہیں وہ اگر صحیح ہیں تو جماعت کو بہ حیثیت جماعت کے ایسے فعل کو ہرگز ناجائز قرار نہیں دینا چاہیئے جس کا تعلق صرف ایک فرد کی ذات سے ہو۔ جماعت بس سمجھا بجھا سکتی ہے۔ ایک شخص کو ترغیب و تحریص کی ویسی ہی آزادی ہونی چاہئے جیسی دوسرے شخص کو باز رکھنے اور منع کرنے کی۔ اس کے برخلاف یہ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ جمہور ریاست کو سختی یا سزا کی غرض سے یہ فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں ہے کہ فلاں فعل جس کا اثر صرف شخص منفرد کی ذات پر پڑتا ہے' اچھا ہے یا برا، تاہم وہ فعل اگر برا ہے تو وہ یہ سمجھنے میں بالکل حق بجانب ہیں کہ یہ کم از کم ایک متنازعہ فیہ مسئلہ ضرور ہے' اور وہ ایسے اشخاص کے صلاح و مشورہ کے اثر کو دور کرنے میں غلط نہیں ہو سکتے ہیں جو بے غرض نہیں ہیں اور جن کا اس مسئلہ کے ایک پہلو میں براہ راست کوئی نہ کوئی فائدہ ضرور ہے اور یہی وہ پہلو ہے جسے ریاست غلط سمجھتی ہے اور جس سے وہ لوگ بالاعلان ذاتی اغراض کی بنا پر دلچسپی رکھتے ہیں۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس میں نہ کوئی حرج ہے اور نہ کوئی نقصان، اگر لوگ اپنا انتخاب خواہ دانشمندانہ ہو یا احمقانہ' اپنی خواہش کے مطابق خود کریں" اور ان لوگوں کی ترغیب و تحریص سے بچے رہیں جو صرف اپنے اغراض کیلئے ایسا کرتے ہیں۔ چنانچہ ناجائز کھیلوں کے متعلق جو قوانین ہیں وہ اگرچہ ناقابل مدافعت ہیں یعنی اگرچہ تمام لوگوں کو اپنے یا دوسروں کے مکانوں میں جوا کھیلنے کی پوری آزادی ہونی چاہیئے یا ایسی عمارتوں میں جو ان کے خاص چندوں سے بنی ہوں اور ان میں صرف وہی لوگ یا ان کے دوست احباب ہی جا سکتے ہوں لیکن عام قمار خانوں کی ہرگز اجازت نہ ہونی چاہیئے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ امتناعی کوششیں کبھی پورے طور پر کامیاب نہیں ہوتی ہیں اور پولیس کے ہاتھ میں تشدد کا خواہ کتنا ہی اختیار دیدیا جائے' پھر بھی قمار خانے کسی نہ

کسی بہانے سے ضرور ہی قائم کیے جائیں گے لیکن کم سے کم انھیں اس پر ضرور مجبور کیا جاسکتا ہے کہ وہ جوا ایک حد تک چھپا کر اور مخفی طریقہ سے کھیلیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجز ان کے جو انھیں تلاش کریں، کسی اور کو ان کا کچھ پتہ نہیں رہتا، اور اس سے زیادہ جماعت کو اپنا مقصود بھی نہ بنانا چاہیئے۔ یہ دلائل بہت قوی ہیں۔ میں یہ فیصلہ کرنے کی جرأت نہ کرونگا کہ آیا یہ دلایل اس اخلاقی بے ضابطگی کو حق بجانب ٹھہرانے کے لئے کافی ہیں یا نہیں، کہ ساتھی کو تو سزا دیجائے اور اصل شخص کو چھوڑ دیا جائے (اور جسے چھوڑ دینا چاہیئے) دلالہ پر تو جرمانہ یا سزا کی جائے لیکن زناکار کو کچھ نہیں، اسی طرح قمار خانہ کے مالک پر تو قانونی گرفت ہو لیکن جوا کھیلنے والے سے کوئی بازپرس نہ ہو۔ اسی طرح خرید و فروخت کے کیا عام معاملات میں بھی دخل اندازی کیجاسکتی ہے؟ تقریبًا ہر چیز جو خریدی اور فروخت کی جاتی ہے اس کا استعمال حد تجاوز سے زیادہ ہوسکتا ہے اور اس زیادتی میں فروخت کرنے والوں کا مالی نفع بھی ہے لیکن اس پر مین[1] لا جیسے قوانین کی بنیاد نہیں رکھی جاسکتی

---

[1] مین ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست ہے جو شمال و مشرق کی جانب بالکل آخری ریاست ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت اس کے قوانین ہیں اور جن میں بھی بالخصوص نشیات سے متعلق قوانین ہیں۔ یوں تو امریکہ بھر میں شراب کا استعمال اور اس کی خرید و فروخت قانونًا ممنوع قرار دیگئی ہے اور اس میں بھی مین سب سے پہلی ریاست تھی جس نے ۱۸۴۶ء میں سب سے پہلے اس کی خرید و فروخت کو قانونًا بالکل ممنوع قرار دیا لیکن یہ سختی زیادہ عرصہ باقی نہیں رہی اور ۱۸۵۱ء میں اس قانون میں ایک ترمیم کی گئی جس کی رو سے اس کا استعمال دواؤں وغیرہ کے لیے مستثنیٰ قرار دیا گیا اور اس ترمیم کے مطابق ان ضروریات کے لئے شراب کا حصول یکے بعد دیگرے مقررہ حکام کے ذریعہ سے ہوسکتا ہے، لیکن عام جذبات قانون کی اس سختی کا ساتھ نہ دے سکے اور عام لوگ برابر اس کی خلاف ورزی کرتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے ایک بہت مضبوط تحریک اس قانون کو مسترد کرنے کے لئے ریاست میں کام کر رہی ہے اور ریاست کے سنجیدہ طبقہ کا یہ خیال ہے کہ قانون کی اس سختی سے بجائے فائدہ کے اور الٹا نقصان ہے،

ہے۔اس لئے کہ منشیات کی تجارت کرنے والے اگرچہ انکے بیجا استعمال میں ان کا تعلق ہے، پھر بھی ان کے جائز استعمال کے لئے ان کا ہونا لازمی بھی ہے۔ بہر حال شراب نوشی کی کثرت میں ان تاجروں کا تعلق واقعتہً نا جائز ہے اور اس بنا پر ریاست کا ان پر قیود عاید کرنا اور ضمانتیں لینا بالکل جائز ہے جیحز اس صورت کے اور ہر حالت میں جایز آزادی کا خون کرنا ہوگا۔

ایک اور سوال یہ ہے کہ آیا ریاست باوجود اس کے کہ وہ ایک فعل کی اجازت دیتی ہے، تاہم یہ سمجھتی ہے کہ یہ فاعل کے مفاد کے خلاف ہوگا تو اس صورت میں وہ بالواسطہ اس فعل کو روک سکتی ہے یا نہیں، مثلاً آیا اسکو شراب کی قیمت اور گراں کردینی چاہیئے یا شراب خانوں کی تعداد محدود کر کے اس کے حصول میں مزید دقت ڈالدینی چاہیئے، دیگر عملی سوالات کی طرح اس سوال میں پورے طور سے فرق و امتیاز کرنے کی ضرورت ہے منشیات پر صرف اس غرض سے محصول لگانے میں کہ ان کا ملنا دشوار ہوجائے، اور ان کے قطعی انسداد میں صرف درجے کا فرق ہے اور اگر یہ جائز ہو تو وہ بھی جائز ہوسکتا ہے۔ قیمت میں ہر اضافہ اس شخص کے لئے ممانعت کے مرادف ہے جسکی آمدنی اس قیمت کی متحمل نہ ہو اور جن کی آمدنی اس کی کفیل ہوسکتی ہے، ان کے لئے یہ ایک تاوان ہے۔ ریاست اور افراد کے قانونی اور اخلاقی فرائض ادا کرنے کے بعد یہ ان کا ذاتی معاملہ رہ جاتا ہے کہ وہ جس قسم کے تعیشات کا انتخاب چاہیں کریں۔ اس قسم کے خیالات سے بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوگا کہ خاص آمدنی کی غرض سے اگر محصول لگایا گیا تو بہت بُرا کیا گیا، لیکن یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ریاست کو آمدنی کی غرض سے محصول لگانا قطعی ضروری ہے، بہت سے ملکوں میں یہ ضروری ہے کہ محصول کا ایک معتدبہ حصہ بالواسطہ رکھا جائے

لہذا ریاست بعض چیزوں کے استعمال پر تاوان لگائے بغیر نہیں رہ سکتی ہے اور یہ تاوان بعض لوگوں کے لئے ممانعت کا مرادف ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ محصول کے لگانے میں یہ خیال رکھے کہ لوگ زیادہ سے زیادہ آسانی سے کس چیز کو ترک کر سکتے ہیں اور ان ہی چیزوں کا انتخاب کرے جن کا استعمال ایک مقررہ مقدار سے زیادہ سخت مضر ہو۔ لہذا منشیات پر اس حد تک محصول لگانا جس سے ریاست کو زیادہ سے زیادہ آمدنی ہو نہ صرف جائز بلکہ پسندیدہ بھی ہے۔

مخصوص اشخاص کو ان اشیا کے فروخت کا کم و بیش بلا شرکت حق دینے کا جو سوال ہے اس کا جواب اُس مقصد کے لحاظ سے جس کے ماتحت یہ قید لگائی جائے مختلف ہو سکتا ہے۔ ان تمام جگہوں پر جہاں لوگ جمع ہوتے ہیں اور بالخصوص ایسے مقامات پر پولیس کے حفاظت و نگرانی کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے کہ اکثر جرائم کا انہی جگہوں پر آغاز ہوتا ہے۔ لہذا یہ بالکل مناسب ہے کہ ان اشیا کے فروخت کا حق (بالخصوص ایسی صورت میں جبکہ وہ چیزیں وہیں استعمال کی جائیں) صرف ایسے ہی اشخاص کو دیا جائے جن کے چال چلن سے پوری واقفیت ہو یا جنکی کوئی تصدیق ہو چکی ہو یا شراب کی دوکانوں کے کھولنے اور بند کرنے کے متعلق ایسے قواعد بنائے جائیں جو لوگوں کے تحفظ و نگرانی کے لئے ضروری ہوں اور اگر مالک شراب خانہ کی نااہلیت یا استعانت کی وجہ سے کئی بار نقض امن ہوا یا یہ جگہ قانون کے خلاف جرائم کی تیاری اور سازش کی آماجگاہ بن جائے تو ان سے فروخت کا اجازت نامہ واپس لے لیا جائے۔ اس سے زیادہ اور کوئی قید عاید کرنا میرے خیال میں اصولاً درست نہیں۔ شراب اور (بیئر) کی دوکانوں کی تعداد

کی تعداد محدود کر دینی تا کہ انکے ملنے میں آسانی ہو یا انکی طرف میلان ہونیکا کم سے کم موقع ملے، اس سے نہ صرف یہی کہ چند افراد کی وجہ سے جو اس سہولت کا بیجا استعمال کرتے بہت سے لوگ دشواری میں مبتلا ہونگے بلکہ یہ صرف ایک ایسی جماعت کیلئے مناسب ہے جس میں مزدور پیشہ جماعت کے ساتھ بچوں یا وحشیوں کا سا برتاؤ کیا جاتا ہے، اور انہیں اجتناب کی تعلیم دی جاتی ہے تا کہ وہ آئندہ چل کر آزادی کے جملہ حقوق کے اہل بن سکیں۔ یہ ہرگز ایسا اصول نہیں ہے جس کے ماتحت کسی آزاد ملک میں بھی مزدور پیشہ جماعت کے اوپر حکومت کی جاتی ہو۔ اور کوئی شخص جو آزادی کی صحیح قدر کرتا ہو اس طرز عمل سے اپنی موافقت کا اظہار نہ کرے گا۔ یہ طریقہ صرف اسی صورت میں جائز ہو سکتا تھا جب کہ آزادی کی تعلیم و تربیت دینے کی تمام کوششیں صرف کر لی گئی ہوں۔ اور یہ بالکل ثابت ہو جائے کہ وہ صرف بچوں ہی کی طرح سلوک کئے جانے کے قابل ہیں۔ اس دوسری صورت کا صرف ذکر کر دینا ہی اس خیال کی لغویت ظاہر کر دینے کے لئے کافی ہے کہ کبھی بھی کسی ایسی صورت میں یہ کوشش کی گئی ہے جس کے متعلق یہاں غور کرنے کی ضرورت ہو۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے اس ملک کے تمام ادارے تضاد و تخالف کا ایک مجموعہ ہیں اسی لئے ہمارے یہاں ایسی باتیں رواج پذیر ہیں جو شخصی یا پدری نظام حکومت سے تعلق رکھتی ہیں، لیکن دوسری طرف ہمارے اداروں کی عام آزادی اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان اختیارات کو اس حد تک عمل میں لایا جائے کہ پابندیاں واقعی اخلاقی تعلیم و تربیت کا اثر رکھیں۔

اس مقالہ کے شروع میں یہ بتایا گیا کہ اگر ایسے معاملات میں جنکا تعلق صرف فاعل کی ذات سے ہو اس کو آزادی کا پورا حق حاصل ہے تو اسی طرح اگر چند افراد بھی باہم مل کر ایسا معاہدہ کر لیں جس کا تعلق صرف انہی کی ذات سے ہو اور دوسروں پر اس کا کوئی اثر نہ پڑتا ہو، تو انھیں بھی بحیثیت مجموعی اس کا پورا حق حاصل ہونا چاہیئے۔ اس مسئلہ میں اس وقت تک کوئی دشواری ——

نہیں پیدا ہوتی ہے جب تک کہ خود ان لوگوں کی خواہش میں کوئی تغیر نہیں پیدا ہوتا لیکن چونکہ خواہشات میں تغیر ہوتا رہتا ہے اس لئے اکثر ضرورت ہوتی ہے کہ ان معاملات میں بھی جن کا تعلق صرف انہی سے ہوتا ہے آپس میں معاہدہ کر لیا جائے۔ اور جب معاہدہ ہو جائے تو مناسب یہی ہے کہ عام طور پر اس کی پابندی بھی کی جائے، پھر بھی غالباً ہر ایک ملک کے قوانین میں اس اصول کے کچھ مستثنیات ملیں گے، یہی نہیں کہ لوگوں پر ایسے معاہدوں کی پابندی فرض نہیں ہے جس سے کسی تیسرے فریق کے حقوق کو صدمہ پہنچتا ہو بلکہ بعض وقت معاہدوں کو توڑنے کے لئے یہ وجہ بھی کافی سمجھی جاتی ہے کہ یہ خود ان کے حق میں مضر ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرض کیجئے کہ اس ملک میں یا دوسرے متمدن ممالک میں اگر کوئی ایسا معاہدہ کیا جائے جس سے ایک شخص اپنے کو دوسرونکے ہاتھ بطور غلام کے فروخت کر دے یا کسی دوسرے کو اسکا اختیار دیدے تو ایسا معاہدہ بالکل کالعدم سمجھا جائیگا اور نہ قانون کی رو سے قابل نفاذ قرار پائے گا نہ رائے عامہ کی رو سے۔ اپنی زندگی اس طرح بالارادہ دوسروں کے سپرد کرنے پر جو رکاوٹ اور قید عاید کی گئی ہے اسکی وجہ ظاہر ہے اور اس انتہائی مثال میں اور بھی زیادہ روشن ہے۔ ایک شخص کے ذاتی معاملات میں تا وقتیکہ دوسروں پر اسکا کوئی اثر نہ ہو مداخلت نہ کرنیکی تو وجہ ہی صرف اسکی شخصی آزادی کا خیال ہے۔ اسکی مرضی اور اس کا انتخاب اس بات کی شہادت ہیں کہ جو کچھ وہ انتخاب کرتا ہے، وہ اسکو پسندیدہ ہے یا کم سے کم گوارا ہے اور بحیثیت مجموعی اسکا نفع اسی میں ہے کہ اسے اپنی خواہش پورا کرنے کا پورا موقع دیا جائے۔ لیکن اپنے کو غلام بنا کر دوسرونکے ہاتھ بیچ دینے سے وہ خود اپنی آزادی سے ہاتھ دھوتا ہے، اور بس اس ایک مرتبہ اپنی آزادی کو استعمال کر کے وہ آئندہ ہمیشہ کے لئے اس حق سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ خود اس مقصد کو فوت کر دیتا ہے جس کی بنا پر اجازت دی گئی تھی کہ اپنے ساتھ جو چاہے وہ کرے۔ اسکی آزادی ختم ہو گئی بلکہ اب سے وہ ایک ایسی حالت میں ہے جس میں رہنا نہ رہنا اب اس کی مرضی

سے باہر ہے۔ اصول آزادی کا ہرگز یہ منشا نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کو آزاد نہ رہنے کی بھی آزادی دیجائے۔ اپنی آزادی سے دست بردار ہو سکنے کا نام آزادی نہیں ہے۔ یہ دلائل جو اس صورت میں اس قدر قوی نظر آرہے ہیں اپنے اطلاق کے لحاظ سے حقیقت میں اور زیادہ وسیع ہیں لیکن ضروریات زندگی کا تقاضا یہ ہے کہ کہیں نہ کہیں انکی کوئی حد بھی ہونی چاہیئے۔ اگرچہ یہ نہیں کہ ہم اپنی آزادی سے ہاتھ ہی دھو بیٹھیں، بلکہ ہمیں چاہیئے کہ اس پر مختلف حدود و قیود کو مان لیں۔ چنانچہ جس اصول کا یہ تقاضا ہے کہ ان تمام معاملات میں جنکا تعلق خود فاعل کی ذات سے ہو، کامل آزادی ہونی چاہیئے، اس کا یہ بھی تقاضا ہے کہ ایسے معاہدوں میں جنکا تعلق کسی تیسرے فریق سے نہیں متعاہدین جب چاہیں ایک دوسرے کو معاہدے کی پابندی سے بری کر سکتے ہیں، اگر ایسی کوئی رضا کارانہ شرط نہ ہو جب بھی بجز روپیہ پیسہ کے لین دین کے مشکل سے کوئی ایسے معاہدے یا اقرارنامے ہونگے جن کے متعلق یہ کہا جا سکے کہ ان سے علیحدگی کا کسی صورت میں اختیار نہ ہونا چاہیئے۔ بیرن ولہم فان ہمبولٹ جنکے قابلانہ مقالہ کا کچھ اقتباس میں پہلے دے چکا ہوں، نہایت زوروں کے ساتھ فرماتے ہیں کہ ایسے معاہدے جن میں ذاتی تعلقات یا خدمات کا ذکر ہو، انکی پابندی قانوناً بھی ایک مقررہ میعاد سے زیادہ ہونی چاہیئے اور شادی جو اس قسم کے معاہدوں میں سب سے زیادہ اہم ہے اور جس کا مقصد ہی فوت ہو جاتا ہے اگر فریقین کے تعلقات خوشگوار نہ ہوں، اسکے ختم کرنے کے لئے تو اس سے زیادہ ضرورت نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی فریق بھی اس معاہدے کے انقطاع کا اعلان کر دے۔ یہ موضوع اس قدر اہم اور اس درجہ پیچیدہ ہے کہ ضمنی طور سے اس پر بحث نہیں کی جا سکتی لہذا میں اس کا ذکر صرف اسی قدر کرونگا جتنا کہ تشریح و تمثیل کے لئے ضروری ہے۔ اگر بیرن ہمبولٹ اپنے مضمون کے اختصار و تعمیم کی وجہ سے بغیر دعووں پر پورے طور سے بحث کئے ہوئے نتیجہ کا ذکر کر دیتے تو بلا شبہ وہ یہ تسلیم کرتے کہ یہ مسئلہ اس قدر معمولی دلائل سے طے نہیں ہو سکتا جب ایک شخص خواہ صاف و صحیح وعدوں

سے یا اپنے طرزِ عمل سے دوسرے کو یہ اعتبار دلا دیتا ہے کہ وہ ایک خاص طریقہ سے برتاؤ کرے گا یعنی وہ بہت سی توقعات اور آرزوئیں وابستہ کر رکھے اور اس پر اپنی زندگی کے ایک حصہ کا مدار بھی رکھے تو اس وقت اس شخص کے لئے اخلاقی ذمہ داریوں کا ایک نیا باب کھل جاتا ہے جنہیں ممکن ہے کہ خارج کیا جا سکے لیکن انھیں نظر انداز کسی طرح نہیں کیا جا سکتا اور اس کے علاوہ اگر دونوں متعاہد فریقین کے تعلقات کا اثر دوسروں پر بھی پڑتا ہو، اگر اس سے فریق ثالث کو کوئی خاص زحمت ہوتی ہو، یا مثلاً شادی کی صورت میں اس سے ایک تیسری جماعت کا وجود عمل میں آگیا ہو، تو ان تمام صورتوں میں متعاہدین پر فریق ثالث کی طرف سے نئی ذمہ داریاں عاید ہو جاتی ہیں جن کے پورا کرنے یا پورا کرنے کے طریقہ کا دار و مدار بہت کچھ متعاہدین کے اس معاہدے کے قائم رکھنے یا توڑ دینے پر ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا اور نہ میں اسے تسلیم کر سکتا ہوں کہ ان ذمہ داریوں کی بنا پر اس معاہدے کا بہر صورت پورا کرنا بھی ضروری ہے لیکن ہاں اس مسئلہ میں وہ ایک اہم جزو ضرور ہیں۔ اور اگرچہ جیسا کہ فان ہمبولٹ کا خیال ہے اس معاہدے سے برائت حاصل کرنے کی قانونی آزادی میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور میرا بھی یہی خیال ہے کہ اس سے کچھ زیادہ فرق نہ پڑنا چاہیے، تاہم اخلاقی آزادی کے معاملہ میں اس سے بہت کچھ فرق پڑتا ہے۔ قبل اس کے کہ ایک شخص ایسا قدم اٹھائے جس سے دوسروں کے اہم مفاد پر اس درجہ اثر پڑتا ہو، اس کا فرض ہے کہ وہ ان تمام صورتوں کو پیش نظر رکھے اور اگر وہ ان مفاد کا مناسب خیال نہیں رکھتا ہے تو اس غلطی کا وہ اخلاقاً ذمہ دار ہے۔ میں نے یہ چند خیالات سرسری طور پر عام اصول آزادی کو بہتر طریقہ پر سمجھانے کے لئے ظاہر کئے ہیں نہ اس لئے کہ اس خاص مسئلہ پر ان کی چنداں ضرورت تھی جس پر عموماً اس طرح بحث کیجاتی ہے گویا بچوں ہی کا مفاد سب کچھ ہے اور بڑوں کے مفاد اس کے سامنے ہیچ ہیں۔

میں بیان کر چکا ہوں کہ کوئی مسلمہ عام اصول موجود نہ ہونے کی وجہ سے اکثر آزادی ایسے

موقعوں پر دیجاتی ہے جہاں دینی چاہیئے اور ایسے موقعوں پر نہیں دیجاتی جہاں دی جانی چاہیئے۔ آجکل جدید دنیائے مغرب میں ایک معاملہ میں آزادی کا جذبہ نہایت قوی صورت میں موجود ہے جہاں میرے خیال میں اسے بالکل نہ ہونا چاہیئے۔ ایک شخص کو اپنے معاملات میں بالکل آزادی ہونی چاہئے لیکن دوسرے کی جانب سے اور یہ سمجھکر کہ اسکے معاملات اپنے معاملات ہیں، کوئی فعل کرنے میں اُسے وہ آزادی نہ ہونی چاہیئے۔ ریاست اگر ایک طرف ہر شخص کی آزادی کا اسکے اپنے معاملہ میں پورا پورا لحاظ رکھتی ہے، تو دوسری طرف اسکا یہ بھی فرض ہے کہ وہ اس شخص کے ان اختیارات پر بھی نظر رکھے جو اس نے دوسرونکے متعلق کسی شخص کو دے رکھے ہیں یہ فرض خاندانی تعلقات کے معاملہ میں تقریبًا بالکل ہی نظرانداز کردیا جاتا ہے، حالانکہ یہ ایک ایسا معاملہ ہے جو مسرتِ انسانی پر براہ راست اثر ڈالنے میں تمام دیگر معاملات کی مجموعی حیثیت سے زیادہ اہم ہے۔ شوہروں کو بیویوں پر جو مستبدانہ اختیارات حاصل ہیں، ان کی تفصیل کی یہاں ضرورت نہیں اس لیے کہ اس بدی کا علاج بس اس سے ہوجائے گا کہ عورتوں کو بھی وہی حقوق دیئے جائیں، انھیں بھی قانون کا تحفظ اسی طرح حاصل ہو جیسے اور سب کو۔ اس چیز کو تفصیل سے بیان نہ کرنیکی ایک اور وجہ یہ بھی ہے کہ اس ظلم کے حامی آزادی کی بنا پر ایسا نہیں کرتے ہیں بلکہ اپنے کو کھلم کھلا قوت واختیار کے علمبردار کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ بچوں کے معاملہ میں تو آزادی کا غلط تخیل ریاست کے اپنے فرایض ادا کرنے میں بہت بڑی رکاوٹ کا باعث ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ اپنی اولاد کو اپنے جسم کا استعارتًا نہیں بلکہ لفظًا ایک حصہ مانتے ہیں جب ہی تو اولاد کے اوپر اسکو جو اختیارات کلی وبلاشرکت غیرے حاصل ہیں، ان میں ذراسی قانونی مداخلت ہو تو رائے عامہ اسکی سخت مخالف ہوجاتی ہے، حتیٰ کہ اگر خود اپنی آزادی میں مداخلت ہو تو بھی شاید اتنی مخالفت نہ کیجائے تحکم کے مقابلہ میں آزادی کی قدر عوام الناس کے نزدیک اس قدر کم ہے امثال کے طور پر تعلیم ہی کے مسئلہ کو لیجئے لیا یہ تقریبًا ایک اصول موضوعہ نہیں ہے کہ ریاست اپنے ہر شہری کو جو اسکے حدود کے اندر پیدا ہوا ہو، ایک

مقررہ معیار تک تعلیم دلائے؟ لیکن کون شخص ایسا ہے جو اس حقیقت کو تسلیم کرنے یا علانیہ بیان کرنے میں ڈرتا ہو مشکل ہی سے کوئی شخص اس حقیقت سے انکار کریگا کہ والدین کا یہ ایک مقدس ترین فرض نہیں ہے (یا قانون اور رسم کی موجودہ حالت میں والد کا) کہ ایک انسانی ہستی کو دنیا میں لانیکے بعد ایسی تعلیم دیں جس سے وہ زندگی میں دوسروں کے حقوق اور اپنے فرائض بجالانیکے قابل ہوسکے لیکن اگرچہ باتفاق رائے کہا جاتا ہے کہ یہ باپ کا فرض ہے تاہم اس ملک میں مشکل سے کوئی شخص یہ سننا گوارا کریگا کہ اسے اس فرض کے ادا کرنے پر مجبور کیا جائے بجائے اسکے کہ اس سے بچے کو تعلیم دلانے کیلئے کسی کوشش یا قربانی کا مطالبہ کیا جائے جب اسکے لئے مفت تعلیم کا کوئی انتظام کیا جاتا ہے تو اسے قبول کرنا یا نہ کرنا اسکی مرضی پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ابتک بھی تسلیم نہیں کیا جاتا کہ ایک بچہ کا پیدا کرنا بغیر اس بات کا کافی انتظام کئے ہوئے کہ اسکے جسم کیلئے نہ صرف غذا ضروری ہے بلکہ اسکے دماغ کیلئے تعلیم و تربیت کی بھی ضرورت ہے، ایک بہت بڑا اخلاقی جرم ہے اور یہ نہ صرف جماعت کے خلاف بلکہ اس بدنصیب بچہ کے خلاف بھی ہے اور اگر باپ اس فرض کو ادا نہیں کرتا تو ریاست کو چاہئے کہ اس فرض کو ادا کرے اور جہاں تک ہوسکے باپ کے خرچ سے ادا کرائے۔

اگر ایک مرتبہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ریاست کا یہ فرض ہے کہ وہ سب لوگوں کو تعلیم دلائے تو پھر ان تمام دشواریوں کا خاتمہ ہوجائے کہ ریاست کو کس قسم کی اور کس طرح تعلیم دلانی چاہیئے، اسی کی وجہ سے یہ مسئلہ اس وقت مختلف فرقوں اور جماعتوں کے لئے ایک میدان کارزار بن گیا ہے اور اسی بحث و تمحیص میں بہت سا وقت اور محنت جو اصل تعلیم میں صرف ہونا چاہئے تھا اب تعلیم کے متعلق جھگڑے میں صرف ہو رہا ہے۔ اگر حکومت یہ ارادہ کرلے کہ ہر بچہ کیلئے اچھی تعلیم ضروری ہے تو پھر اس کو یہ زحمت گوارا نہ کرنی پڑیگی کہ وہ اسکو فراہم بھی کرے۔ اسکے بعد والدین پر یہ منحصر ہوگا کہ وہ جہاں اور جیسی تعلیم اپنے بچہ کو چاہیں دلائیں اور حکومت صرف غریب طبقہ کے بچوں کی فیس یا ایسے لوگوں کے کل اخراجات تعلیم ادا کردیا کرے جن کیلئے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ ریاست کی تعلیم پر جو معقول اعتراضات کئے جاتے ہیں انکا اطلاق ہرگز اس پر نہیں ہوتا کہ ریاست تعلیم کو جبری قرار دیدے بلکہ اس تعلیم پر ہوتا ہے جو ریاست کی ہدایت و

نگرانی کے مطابق ہو۔ اور ان دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ قوم کی تعلیم کا کل یا بیشتر حصہ ریاست کے ہاتھ میں ہونا میں اسے اسی قدر برا سمجھتا ہوں جس قدر کوئی اور شخص۔ اخلاق و سیرت کی جداگانہ نوعیت اور خیالات و طریقۂ عمل کی انفرادی حیثیت کے متعلق جو کچھ کہا جا چکا ہے، اس میں یہ بات بھی شامل ہے اور اسی قدر ناقابل بیان اہمیت کے ساتھ شامل ہے کہ تعلیم میں بھی تنوع ہونا ضروری ہے۔ ریاست کے زیر اثر ایک عام تعلیمی انتظام ہونے کے معنی ہیں کہ تمام لوگوں کو ایک سانچے میں ڈھالا جائے چونکہ یہ سانچہ حکومت کی غالب قوت کی مرضی کے مطابق ہوگا خواہ وہ قوت ایک واحد حکمران شخص کی ہو یا مذہبی پیروہتوں کی جماعت کی، یا امرا و اشراف کی یا خود موجودہ نسل کی اکثریت کی یہ تعلیم جس قدر کامیاب ہوگی اسی قدر اس کا اثر دماغ پر ایک مطلق العنان حکومت کا سا ہوگا، جو قدرتاً رفتہ رفتہ جسم پر بھی مسلط ہوتا جائیگا۔ اگر بالفرض حکومت کے زیر اثر کوئی تعلیمی انتظام ہو بھی، تو اسے منجملہ اور تجربات کے محض ایک تجربہ کی حیثیت سے ہونا چاہیئے جو بطور مثال اور نمونے کے قایم کیا جائے تاکہ اور دوسرے نظامات تعلیم کو ایک مقررہ معیار پر قائم رکھے۔ اگر فی الحقیقت جماعت اس درجہ تنزل کی حالت میں ہو کہ وہ اپنے لئے تعلیم گاہوں کا کوئی معقول انتظام نہ کرسکتی ہو یا کرنا نہ چاہتی ہو اور اگر حکومت خود اپنے ذمہ اس کام کو لینے پر آمادہ ہو تو اس وقت وہ بدرجۂ مجبوری کم درجہ کی برائی کی حیثیت سے اسکولوں اور یونیورسٹیوں کے کام کو اسی طرح اپنے ذمہ لے سکتی ہے جس طرح ملک کو، اگر ملک میں شخصی حوصلہ مندی نہ ہو اور لوگ صنعت کے بڑے بڑے کارخانوں کی ذمہ داری اپنے سر نہ لے سکیں تو حکومت مشترکہ سرمایہ کے کارخانوں کا انتظام کرسکتی ہے لیکن عام طور سے ملک میں اگر ایسے لوگوں کی تعداد موجود ہو جو حکومت کی نگرانی میں تعلیم کا انتظام کرسکتے ہیں تو وہی اشخاص اتنی اچھی تعلیم کا انتظام اپنے طور پر بھی کرسکتے ہیں بشرطیکہ انکو اپنے معاوضہ کا یقین اس طرح ہو جائے کہ ریاست تعلیم کو قانوناً لازمی قرار دیدے اور جو لوگ اس تعلیم کے مصارف نہ برداشت کرسکتے ہوں انکو حکومت کی طرف سے امداد ملے۔

اس قانون کے نافذ کرنیکا بہترین ذریعہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا ہے کہ تمام بچوں کا اوائل عمر میں عام امتحان لیا جائے۔ ایک عمر ایسی مقرر کر دی جائے جب کہ ہر بچہ کا (خواہ وہ لڑکا ہو یا لڑکی) یہ امتحان لیا جائے کہ آیا وہ پڑھ سکتا ہے یا نہیں۔ اگر وہ نہیں پڑھ سکتا تو اس کے باپ پر تا وقتیکہ وہ کوئی عذر نہ پیش کرے جرمانہ کرنا چاہیئے، جو اگر ضرورت ہو تو اسکی محنت سے وصول کیا جائے اور بچہ کو باپ کے خرچ سے مدرسہ میں داخل کر دینا چاہیے۔ یہ امتحان ہر سال ہونا چاہیئے اور اس میں کچھ نہ کچھ مضامین رفتہ رفتہ بڑھانے چاہئیں تاکہ عام معلومات کی کم سے کم استعداد کا حاصل کرنا اور اس سے زیادہ اس کا قائم رکھنا سب پر لازمی ہو جائے۔ اس مقررہ استعداد سے زیادہ کے تمام مضامین میں اختیاری امتحانات ہونے چاہئیں جن میں ایک مقررہ معیار تک پہنچنے کے بعد وہ سند کے مستحق ہو سکیں۔ اس غرض سے کہ ریاست ان ذرائع سے لوگوں کے خیالات اور رایوں پر کوئی ناجائز اثر نہ ڈالے، بہتر ہے کہ اعلی جماعتوں کے امتحانات پاس کرنے کیلئے جتنی معلومات ضروری ہے وہ (زبانوں وغیرہ سے قطع نظر کر کے جو حصول علم کے ذرائع ہیں) علوم صحیحہ تک محدود ہو۔ مذہب ریاست یا ان جیسے اور دوسرے متنازعہ فیہ مضامین میں رایوں کی صحت یا عدم صحت کے متعلق نہ ہونا چاہیے بلکہ صرف واقعات کے متعلق کہ فلاں فلاں مصنف یا جماعت یا فرقہ کا یہ خیال ہے اور ان وجوہ کی بنا پر ہے۔ اس طریقہ سے آئندہ جو نسل آئیگی وہ تمام متنازعہ فیہ مسائل میں ہماری موجودہ نسل سے کچھ بری نہ رہیگی۔ ان کی تعلیم و تربیت آجکل کی طرح یا تو پیروان کلیسا کے طریقہ پر ہو گی یا غیر مقلدوں کے طرز پر۔ ریاست کو صرف اسکی فکر ہو گی کہ یہ لوگ پڑھے لکھے پیروان کلیسا اور پڑھے لکھے غیر مقلد ہوں۔ اگر بچوں کے والدین یہ چاہتے ہیں کہ انکے بچے ان مدارس میں جہاں اور چیزیں پڑھائی جاتی ہیں دینیات بھی پڑھیں تو اس میں کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ متنازعہ فیہ مسائل کے متعلق لوگوں کی رایوں پر اثر ڈالنے کی ریاست کیطرف سے جو کوششیں کیجائیں سب ناجائز ہیں البتہ وہ اسکی جانچ اور تصدیق کرنیکی مجاز ہے کہ فلاں شخص ایسا علم رکھتا ہے کہ کسی خاص مسئلہ میں اسکی رائے غور سے سنی جائے۔ ایک فلسفہ کا طالبعلم لوک اور کانٹ دونوں کی نظریات میں امتحان

دیکھتا ہو خواہ وہ ان دونوں میں سے کسی کے نظریے کو پسند کرتا ہو یا دونوں کو ناپسند کرتا ہو۔ اسی طرح ایک دہریہ کا امتحان تعلیمات مسیحی کے متعلق لے جانے پر بھی کوئی معقول اعتراض نہیں ہو سکتا، بشرطیکہ اس سے یہ نہ توقع کی جائے کہ وہ ان پر عقیدہ بھی رکھتا ہو گا۔ بہرحال اعلیٰ علوم کے امتحانات میرے خیال میں بالکل اختیاری ہونے چاہئیں۔ اگر حکومت کے ہاتھ میں یہ اختیار دے دیا جائے کہ وہ لوگوں کو قابلیت کے بہانے سے مختلف پیشوں کے اختیار کرنے سے روک دے، حتیٰ کہ معلمی کے پیشہ کو اختیار کرنے کی بھی اجازت نہ دے تو یہ اختیار دینا گویا ایک بہت خطرناک حربہ دینا ہے، اور میں اس امر میں ولہم فان ہمبالٹ سے بالکل متفق ہوں کہ تمام ان لوگوں کو جو امتحانات میں شریک ہو کر کامیاب ہوتے ہیں ڈگریاں و سرٹیفکیٹ دینے چاہئیں لیکن جن لوگوں کے پاس یہ اسناد ہوں انھیں دوسروں پر اس سے زیادہ فوقیت نہ ہونی چاہیئے کہ رائے عامہ کے نزدیک ان اسناد کی حقیقی و قدرتی ہی نسبت سے ان لوگوں کی قدر کی جائے۔

صرف تعلیم ہی کا معاملہ نہیں ہے جس میں آزادی کے غلط مفہوم سے والدین کی اخلاقی ذمہ داریاں تسلیم نہیں کی جاتی ہیں اور قانونی ذمہ داریاں ان پر عاید نہیں ہونے پاتی ہیں حالانکہ اول الذکر کے لئے ہمیشہ اور ثانی الذکر کے لئے اکثر قوی سے قوی وجوہ موجود ہوتے ہیں۔ خود ایک ہستی کا وجود میں لانا ہی حیات انسانی کے بڑے سے بڑے ذمہ دارانہ افعال میں سے ہے۔ اس ذمہ داری کا اپنے سر لینا یعنی ایک ذات کو زندگی بخشنا جو لعنت بھی ہو سکتی ہے اور برکت بھی، اس ذات کے خلاف بہت بڑا جرم ہو گا تاوقتیکہ کم سے کم اسے خوشگوار زندگی بسر کرنے کا موقع حاصل نہ ہو۔ اور ایک ایسے ملک میں جہاں حد سے زیادہ آبادی ہو جانے کا اندیشہ ہو، بہت تھوڑی سی تعداد سے زیادہ بچے پیدا کرنا اور اس کی وجہ سے لوگوں کے ذرائع معاش کو کم کر دینا

ان لوگوں کے خلاف ایک بہت بڑا جرم کرنا ہے جو اپنی محنت کی اجرت پر زندگی بسر کرتے ہیں یورپ کے اکثر ملکوں میں شادی کے متعلق یہ قوانین ہیں کہ فریقین اس وقت تک شادی نہیں کر سکتے ہیں جب تک کہ وہ یہ نہ ثابت کر دیں کہ وہ ایک کنبہ کی پرورش اچھی طرح کر سکتے ہیں یہ قوانین ریاست کے جائز اختیارات سے کسی طرح خارج نہیں ہیں اور اس قسم کے قوانین خواہ قرین مصلحت ہوں یا نہ ہوں (یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو بالکل ہی مقامی حالات اور خیالات پر مبنی ہے) وہ اس لحاظ سے قابل اعتراض ہرگز نہیں ہیں کہ ان سے انفرادی آزادی پر کوئی اثر پڑتا ہو۔ ان قوانین کا عاید کرنا ریاست کی طرف سے ایسی مداخلت ہے جو ایک مضر حرکت کو روکنے کے لئے کی جاتی ہے، اور یہ تشنے دوسروں کے لئے ایسی نقصان دہ ہے کہ اس صورت میں بھی نفرت اور حقارت کا اظہار کرنا چاہیے جب کہ قانونی سزا دینا مصلحت کے مطابق نہ سمجھا جائے۔ تاہم آجکل آزادی کے متعلق جو خیالات ہیں وہ ایسے معاملات میں جن کا تعلق محض فاعل ہی کی ذات سے ہوتا ہے اس قدر آسانی سے انفرادی آزادی میں مداخلت منظور کر لیتے ہیں، لیکن ہر ایسی کوشش کی مخالفت کرتے ہیں جو ان کی ان خواہشات کو روکنے کے لئے کی جائے جن سے کہ ان کی اولاد کی زندگی تلخ ہو جاتی ہے اور دوسرے سلجھے والوں کو بھی طرح طرح کی مصیبتوں کا سامنا ہوتا ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف تو لوگ آزادی کی اتنی حیرت انگیز قدر کرتے ہیں اور دوسری طرف اتنی حیرت انگیز بےقدری تو ہمارا یہ خیال کرنا کچھ بے جا نہیں ہے کہ ایک شخص کو دوسروں کو نقصان پہنچانے کا تو ناگزیر حق ہے لیکن اسے اس کا کوئی حق نہیں ہے کہ وہ کسی کو بغیر نقصان پہنچائے ہوئے اپنے کو خوش رکھ سکے۔

میں نے حکومت کی مداخلت کو محدود کرنے کے متعلق بہت سے سوالات آخر کے لئے رکھ چھوڑے تھے۔ ان مسائل کا ہمارے اس مقالہ کے موضوع بحث سے قریبی تعلق ضرور ہے

لیکن اصل میں وہ اس دائرے سے خارج ہیں۔ ان مسائل میں انفرادی آزادی کے خلاف حکومت کی مداخلت کا معاملہ نہیں ہے۔ یہاں اس کا سوال نہیں کہ افراد کے افعال پر پابندیاں کیوں عاید کی جاتی ہیں بلکہ یہ ہے کہ انھیں مدد کیوں نہیں دی جاتی؟ دیکھنا یہ ہے کہ آیا حکومت کو افراد کے فائدے کے لئے خود کچھ کرنا یا کرانا چاہیئے یا خود انھی کے اوپر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ انفراداً یا باہم ملکر جو کچھ چاہیں کریں۔

حکومت کی طرف سے اس قسم کی مداخلت پر جب کہ انفرادی آزادی کو کوئی صدمہ نہ پہنچتا ہو، جو اعتراض کئے جاتے ہیں، ان کی تین قسمیں ہو سکتی ہیں:۔

پہلا اعتراض یہ ہے کہ جب کسی کام کو افراد زیادہ بہتر طریقہ پر کر سکتے ہیں تو حکومت کو اس میں مداخلت نہ کرنی چاہیئے۔ عام اصول تو یہ ہے کہ جن لوگوں سے کسی کام کا تعلق ہو وہی اسے کر سکتے ہیں یا یہ بتا سکتے ہیں کہ اسے کون کرے اور کیونکر کرے۔ اس اصول کی بنا پر وہ تمام مداخلتیں جو کبھی مجالس مقننہ یا حکام سرکاری کی طرف سے عام صنعتی کاروبار میں ہوتی تھیں، ناجائز قرار پاتی ہیں۔ لیکن معاملے کے اس پہلو پر ماہرین علم الاقتصاد بہت کافی روشنی ڈال چکے ہیں، نیز اس کا اس مقالہ کے اصل موضوع سے کوئی خاص تعلق بھی نہیں ہے۔

دوسرا اعتراض ہمارے موضوع سے بہت کچھ متعلق ہے۔ بہت سے معاملات ایسے ہیں جن کا انصرام اگرچہ افراد عام طور سے اس قدر خوبی کے ساتھ نہ کر سکتے ہوں، جیسا کہ عمال حکومت کر سکتے ہیں، تاہم یہ مناسب خیال کیا جاتا ہے کہ انھیں حکومت کی بجائے وہی لوگ انجام دیں تاکہ اس طریقہ سے ان کی دماغی تعلیم و تربیت ہو، ان کے قوائے عملی میں قوت و استحکام پہونچے، وہ اپنے قوت فیصلہ سے کام لینا سیکھیں اور ان مسائل سے انھیں کافی واقفیت ہو جن سے

انھیں سابقہ پڑتا رہتا ہے زیادہ تر اسی اصول کی بنا پر غیر سیاسی مقدمات کے فیصلے میں جوری سے مدد لی جاتی ہے، اسی کی بنا پر مقامی اور بلدی آزاد پبلک ادارے، لوگوں کی اپنی کاروباری صنعتی انجمنیں، اور رفاہ عام کی مجالس قائم ہیں ۔ ان مسائل کا انفرادی آزادی سے براہِ راست تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ترقی اور نشو و نما سے متعلق ہیں ۔ ان کے ذکر کا موقع وہ ہوگا جہاں قومی تعلیم کی بحث کی جائے ۔ حقیقت میں یہ ایک شہری کی تربیت اور ایک آزاد قوم کی سیاسی تعلیم کے عملی مسائل ہیں کہ اسکے افراد کو ذاتی اور خاندانی خود غرضیوں کے تنگ دائرہ سے نکالکر مشترکہ مفاد کے سمجھنے اور مشترکہ معاملات کے انتظام کرنے کا خوگر بنایا جائے اور ان میں یہ عادت ڈالی جائے کہ وہ عام یا تقریباً عام مفاد کے خیال کو پیش نظر رکھیں اور ان مقاصد کی بنا پر زندگی بسر کریں جو انھیں ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کی بجائے انھیں باہم متفق و متحد کرتے ہوں ۔ ان عادات اور اختیارات کے بغیر کوئی آزاد دستور اساسی نہ چل سکتا ہے اور نہ باقی رہ سکتا ہے جیسا کہ اکثر ان ملکوں کی عارضی سیاسی آزادی سے ثابت ہوتا ہے جہاں لوگوں کو مقامی طور پر آزادی نہیں حاصل ہوتی مذکورہ بالا دلائل سے ثابت ہے کہ مقامی افراد یا جماعتوں کا اپنے مقامی کاروبار کا اپنا آپ انتظام کرنا اور ان لوگوں کا ملکر اپنے روپیے سے صنعت و حرفت کے بڑے بڑے کاروبار کا چلانا کس قدر مفید ہے اور انفرادی ترقی اور طریق عمل کے تنوع کی جو برکات اس مقالے میں تفصیل سے بیان کی جا چکی ہیں ان سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے ۔ حکومت کے کام سب جگہ یکساں ہوتے ہیں ۔ برعکس اس کے افراد یا آزاد جماعتوں کو مختلف تجربات اور گوناگوں حالات و واقعات سے سابقہ پڑتا ہے ۔ ریاست جو کوئی مفید کام اس بارے میں کر سکتی ہے وہ یہ ہے کہ مختلف تجربات سے اسے جو نتائج حاصل ہوں، انھیں وہ یکجا کرتی رہے اور برابر ملک میں پھیلاتی رہے ۔ اس کا کام یہ ہے کہ وہ ہر تجربہ کرنے والے کو امداد دیتی رہے کہ وہ دوسروں کے

تجربات سے فائدہ اٹھائے، نہ یہ کہ وہ بجز اپنے اور کسی کو تجربہ کرنے کی اجازت ہی نہ دے۔

تیسری اور سب سے زبردست وجہ حکومت کی دست اندازی کو محدود کرنے کی یہ ہے کہ اس طریقے سے اس کے اختیارات میں غیر ضروری اضافہ ہوتا جائے گا جو نہایت برا ہے حکومت کے ہاتھ میں اس وقت جتنے کام ہیں ان میں اور مزید اضافہ کرنا اسے اور بھی زیادہ لوگوں کے خوف اور امید کا مرجع بنا دے گا اور پبلک کے سرگرم اور حوصلہ مند لوگوں کو حکومت کی یا اس جماعت کی جو حکومت حاصل کرنے والی ہے، چاپلوسی کرنے پر مجبور کرے گا۔ اگر سڑکیں، ریل، بنیک، بیمہ کے دفاتر، بڑی بڑی انجمنہائے سرمایہ مشترکہ، یونیورسٹیاں، خیرات خانے غرض یہ سب چیزیں حکومت کی شاخیں ہوں، نیز میونسپلٹیاں، مقامی بورڈ اور ان کی جملہ متعلقات مرکزی حکومت کے محکمے بن جائیں، اگر ان تمام اداروں کے ملازم حکومت کی طرف سے مقرر ہوں اور ان کو تنخواہیں حکومت کی طرف سے دی جائیں اور وہ اپنی ہر ترقی کے لئے حکومت کے دست نگر ہوں تو اس صورت میں اخبارات کی آزادی یا قانون ساز جماعتوں کے شرطی نظام سے کچھ کام نہ چلے گا اور ہمارے ملک بلکہ ایسے ہر ملک میں آزادی کا نام ہی نام رہ جائے گا، اور حکومت کا نظام جس قدر بہتر اور عمدہ ہوگا، اور اس کے لئے لائق اور تجربہ کار اشخاص منتخب کرنے میں جتنا اہتمام کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ نقصان ہوگا۔ انگلستان میں ایک عرصے سے یہ تجویز ہو رہی ہے کہ سول سروس کی ملازمتوں کے لئے ایک مقابلہ کا امتحان ہوا کرے تاکہ اس طریقے سے ذہین سے ذہین اور لائق سے لائق اشخاص دستیاب ہو سکیں، اور اس تجویز کی موافقت و مخالفت میں اب تک بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ مخالفین کے دلائل میں سے سب سے قوی دلیل جس پر وہ سب سے زیادہ زور دیتے ہیں، یہ ہے کہ حکومت کی مستقل ملازمت روپیہ اور عزت دونوں حیثیتوں سے بہترین اشخاص کے لئے کچھ بہت

زیادہ کشش نہیں رکھتی اور انھیں آزاد پیشوں یا کمپنیوں وغیرہ کی ملازمتوں کی طرف ہمیشہ زیادہ رغبت ہوگی۔ ہمیں تعجب نہ ہوتا اگر یہ دلیل اس تجویز کے موافقین کی طرف سے اس قوی اعتراض کے جواب میں پیش کی جاتی جو ان پر ہوا کرتا ہے۔ مخالفین کی جانب سے پیش کیا جانا سخت موجب حیرت ہے۔ جس چیز کی وجہ سے اس اسکیم پر اعتراض کیا جاتا ہے، وہی اصل میں اس کی حفاظت کی تدبیر ہے۔ اگر واقعی یہ ممکن ہو کہ ملک کے تمام بہترین دماغ سرکاری ملازمت کے دام میں لائے جاسکیں تو یہ ایک ایسی تجویز ہوگی جس سے لوگ جتنا اندیشہ کریں وہ کم ہے۔ اگر سوسائٹی کا ہر وہ کاروبار جس میں منظم کوشش یا وسعت نظر کی ضرورت ہو حکومت کے ہاتھوں میں ہو، اور اگر تمام سرکاری دفاتر میں قابل سے قابل اشخاص بھرے ہوں، تو ملک کے تمام بہترین، وسیع النظر اور تجربہ کار دماغ دفتری حکومت کے بڑے دائرے میں بہت جمع ہو جائیں گے اور بقیہ جماعت ہر بات میں ان کی دست نگر ہوگی۔ آبادی کی کثیر تعداد تو اپنے تمام معاملات میں ان چند افراد سے حکم اور ہدایت کی متوقع رہے گی اور لائق اور حوصلہ مند اشخاص اپنے ذاتی تفوق و ترقی کے امیدوار ہوں گے۔ اس دفتری حکومت کے دائرہ میں داخل ہونا اور جب داخل ہو گئے تو اس میں ترقی اور عروج کی کوشش کرنا ہی لوگوں کی سب سے بڑی آرزو اور خواہش ہوگی۔ ایسی صورت میں صرف یہی نہیں کہ باہر کے لوگ عدم تجربہ کی وجہ سے اس دفتری حکومت کے طرزِ عمل پر اعتراض نہ کرسکیں گے بلکہ اگر آزاد سیاسی اداروں کے معمولی طریق عمل سے اتفاقاً کوئی ایسا شخص برسرِ اقتدار بھی ہو جس کا میلان اصلاح و ترقی کی طرف ہے تو وہ کوئی ایسی اصلاح نہیں کرسکتا ہے جو اس دفتری جماعت کے مفاد کے خلاف ہو۔ یہی افسوسناک حالت سلطنت روس کی بھی ہے جیسا کہ ان لوگوں کے بیانات سے پتہ چلتا ہے جنھیں اس کے

دیکھنے کا کافی موقع ملا ہے۔ خود زار روس بھی اس دفتری جماعت کے آگے لاچار اور بے بس ہے۔ وہ ان میں سے جس شخص کو چاہے، سائبیریا بھیج سکتا ہے لیکن وہ ان کے بغیر یا ان کی مرضی کے خلاف کبھی حکومت نہیں کر سکتا ہے۔ انھیں اس کے ہر فیصلے کو مسترد کر دینے کا خاموش حق حاصل ہے اور وہ اس طرح کہ اس فیصلے پر عمل نہ کریں۔ ان ملکوں میں جو زیادہ متمدن ہوتے ہیں اور جن میں انقلاب کا مادّہ کافی ہوتا ہے اگر لوگ اس کے عادی ہوں کہ ہر کام کے انجام پانے کی ریاست سے توقع کریں یا کم سے کم بغیر ریاست کی اجازت اور ہدایت کے کوئی کام نہ کرتے ہوں تو وہ قدرتاً تمام خرابیوں کا ذمہ دار ریاست کو ٹھہراتے ہیں اور جب ان کا پیمانۂ صبر لبریز ہو جاتا ہے تو وہ حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور انقلاب برپا کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد کوئی شخص خواہ اسے قوم کی طرف سے جائز اختیار دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو، وہ تخت نشین ہو جاتا ہے، دفتری حکومت کے نام احکامات جاری کرنے لگتا ہے اور سارے کام جیسے پہلے چلتے تھے اسی طرح چلا کرتے ہیں۔ وہ دفتری جماعت جوں کی توں رہتی ہے اور کوئی اور شخص ان کی جگہ لینے کا اہل نہیں ہوتا۔

جو قوم اپنے معاملات کا انتظام آپ کرنے کی عادی ہوتی ہے، وہاں صورت حال بالکل ہی مختلف نظر آتی ہے۔ فرانس میں جہاں آبادی کا ایک کثیر حصّہ فوجی کام کا تجربہ رکھتا ہے جس میں سے بہت سے لوگ چھوٹے افسروں کا کام کئے ہوئے ہوتے ہیں، وہاں ہر فساد اور بغاوت کے موقع پر کچھ لوگ ایسے ضرور نکل آتے ہیں جو لوگوں کی رہنمائی کر سکیں اور وقت پر کوئی معقول راہ عمل نکال سکیں۔ فوجی معاملات میں جو حالت فرانسیسیوں کی ہے، وہی امریکہ کے لوگوں کی تمام ملکی معاملات میں ہے۔ اگر ان کے ملک میں کوئی حکومت نہ ~~رہے~~ تو ان کی ہر ایک جماعت حکومت قائم کر سکے گی اور اسے یا اور کسی پبلک کام کو نہایت خوبی اور

نظم و تربیت کے ساتھ چلائے گی۔ ایسا ہی ہر ایک آزاد قوم کو ہونا چاہیئے اور جو قوم یہ کر سکتی ہے وہ آزاد بھی ضرور ہو سکتی ہے۔ وہ کبھی کسی شخص یا جماعت کی اس بنا پر غلام نہیں بن سکتی کہ یہ شخص یا یہ جماعت مرکزی حکومت کی عنان اپنے ہاتھ میں لینے اور اسے سنبھالنے کی قابلیت رکھتی ہے۔ ایسے لوگوں سے کوئی دفتری حکومت نہ تو ان کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرا سکتی ہے اور نہ سختی کا برتاؤ کر سکتی ہے۔ لیکن جہاں ہر کام دفتری جماعت کے ذریعے انجام پاتا ہو وہاں کوئی ایسا کام کبھی نہیں چل سکتا جس کی وہ جماعت مخالف ہو۔ ایسے ملکوں کا نظام دستوری یہ ہوتا ہے کہ قوم کے تجربہ کار اور عملی قابلیت رکھنے والوں کی ایک منظم جماعت کو دوسروں پر حکومت کرنے کی تربیت دی جائے اور جس قدر یہ نظام مکمل اور دوسروں کو اپنی طرف کھینچنے اور اپنے حسب منشا بنانے میں کامیاب ہوتا ہے اسی قدر ساری قوم کی بیڑیاں مضبوط ہوتی جاتی ہیں جن میں خود یہ دفتری جماعت بھی شامل ہے۔ اس لئے کہ حکمران جماعت بھی اس انتظام اور ضابطے کی اسی قدر غلام ہے جتنے محکوم اپنے حکمرانوں کے ہوتے ہیں۔ چین کا ایک مانڈرین وہاں کے مطلق العنان نظام حکومت کے ہاتھ میں ویسا ہی کٹھ پتلی ہے جیسا معمولی سے معمولی کھیت جوتنے والا۔ جیسوٹ کی جماعت کا ہر رکن اپنی جماعت کا حقیر غلام ہوتا ہے اگرچہ خود اس جماعت کا قیام اس کے ارکان کی مجموعی قوت اور اہمیت کے لئے ہے۔

اس کے علاوہ یہ امر بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے کہ ملک کے بہترین دل و دماغ کو حکمران جماعت کے اندر جذب کر لینا دیر سویر خود اس جماعت کی ذہنی زندگی اور ترقی کے لئے ہلاکت کا باعث ہوگا۔ وہ چونکہ باہم ایک رشتے میں بندھے ہوں گے اور ایک نظام کے ماتحت کام کریں گے جو سب نظاموں کی طرح بندھے ٹکے اصولوں کا پابند ہوگا اس لئے

ان کے لئے ہمیشہ اندیشہ ہے کہ کہیں وہ کولھو کے بیل بن کے نہ رہ جائیں یا اگر وہ کبھی اس چکّر سے نکلے بھی، تو اندیشہ ہے کہ وہ بے سمجھے بوجھے کوئی مہمل تجویز نہ لے بیٹھیں جو ان کے کسی سربرآوردہ رکن کے دماغ میں آگئی ہو اگر اس جماعت کے ان رجحانات کی جو بظاہر متضاد معلوم ہوتے ہیں لیکن اصل میں ایک دوسرے سے قریبی تعلق رکھتے ہیں کوئی روک ہو سکتی ہے، اگر اس کی قابلیت کو کوئی چیز بلند معیار پر قایم رکھ سکتی ہے تو وہ یہی ہے کہ اس جماعت کے باہر اتنے ہی قابل لوگ اس کی نگرانی اور نکتہ چینی کے لئے موجود ہوں۔ لہذا ایسے ذرائع کا ہونا ضروری ہے کہ حکومت کے اثر سے آزاد رہ کر ایسے قابل لوگ پیدا کئے جا سکیں اور انھیں تعلیم اور تجربات حاصل کرنے کا موقع دیا جا سکے تاکہ وہ اہم عملی مسائل کے متعلق صحیح رائے قایم کر سکیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے یہاں قابل اور ماہر کارکن مستقل طور پر موجود رہیں، خصوصًا ایسے لوگ جو اصلاحات کرنے کی قابلیت اور انھیں قبول کرنے کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے ہاں کی دفتری حکومت کے ارکان مکتب کے ملاؤں کی طرح نہ بن جائیں تو ہمیں اس کا انتظام کرنا چاہئیے کہ یہ دفتری جماعت کل ایسے کاموں پر قابض نہ ہو جائے جن سے ان قوائے ذہنی کی تربیت ہوتی ہے جو حکومت کے لئے درکار ہیں۔

وہ نقطہ معلوم کرنا جہاں سے یہ خرابیاں جو انسانی آزادی و ترقی کے لئے اس قدر مضر ہیں، پیدا ہونا شروع ہوتی ہیں یا جہاں پہنچ کر وہ ان فوائد پر غالب آجاتی ہیں جو حکومت اور ارباب حکومت کی مصلحانہ مداخلت سے حاصل ہوتے ہیں، مرکزی طاقت اور حکومت سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا مگر ساتھ ہی خیال رکھنا

کہ اس کے مشاغل حد سے زیادہ نہ بڑھنے پائیں، یہ فن حکمرانی کا ایک نہایت دشوار اور پیچیدہ مسئلہ ہے۔ یہ بڑی حد تک ایک فروعی مسئلہ ہے جس میں بہت سی مختلف باتیں مدنظر رکھنا ضروری ہیں اور کوئی قطعی اور دوامی قاعدہ مقرر نہیں کیا جا سکتا لیکن میرا خیال ہے کہ وہ عملی اصول جس پر ہماری سلامتی منحصر ہے، وہ نصب العین جو ہمارے پیش نظر رہنا چاہیے اور وہ معیار جس پر ہر تدبیر کو جانچنا چاہیے، یہ ہے کہ اختیارات کی اس حد تک زیادہ سے زیادہ تقسیم و تفریق ہونی چاہیے جہاں تک کہ حسن و خوبی میں خرابی نہ پیدا ہو لیکن معلومات جہاں تک ممکن ہو ایک مرکز پر جمع کی جائیں اور وہیں سے ان کی تقسیم ہو۔ چنانچہ میونسپل انتظامات میں جیسا کہ نیو انگلینڈ میں ہے، وہ کام جو خود اہل غرض پر نہیں چھوڑے جا سکتے چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر کے مقامی عمال کے سپرد کر دئے جانا چاہئیں۔ لیکن علاوہ مقامی معاملات کے ہر صیغے کی نگرانی کے لئے ایک مرکزی محکمہ بھی ہونا چاہیے جو عام نظم حکومت کی ایک شاخ ہو۔ اس محکمے کے سپرد یہ کام ہونا چاہیے کہ کسی خاص صیغے میں مختلف مقامات کی کارروائیوں کا مشاہدہ کرے، بیرونی ممالک کے طرز عمل سے مقابلہ کرے اور سیاسیات مدن کے عام اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر قسم کی معلومات اور تجربات کو ایک مرکز پر جمع کرے۔ اس مرکزی محکمہ کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ سب کچھ جو ہو رہا ہو معلوم کر سکے اور اس کا خاص فرض یہ ہونا چاہیے کہ ایک جگہ سے وہ جو معلومات حاصل کرے، اسے دوسرے مقامات تک پہونچائے اپنے اس بلند مرتبہ اور وسیع نقطۂ نظر کی بنا پر وہ چونکہ ادنیٰ تعصبات اور تنگ خیالات سے پاک ہوگا، اس لئے اس کے مشوروں اور اس کی رایوں میں قدرتاً بہت زیادہ وزن ہوگا لیکن بحیثیت ایک مستقل ارادہ کے میرے خیال میں اس کے اصلی خیالات

صرف یہیں تک محدود رہنے چاہئیں کہ وہ مقامی عمال کو ان قوانین کی پابندی کے لئے مجبور کرسکے جو ان کی ہدایت کے لئے بنائے گئے ہیں۔ باقی تمام معاملات کو جن میں عام قاعدے موجود نہ ہوں، خود ان لوگوں کی قوت فیصلہ پر چھوڑ دینا چاہیئے جس کے لئے وہ اپنے انتخاب کنندگان کے سامنے جواب دہ ہونگے۔ قواعد کی خلاف ورزی کے لئے انھیں قانون کے آگے جواب دہ ہونا چاہیئے اور ان قواعد کے بنانے کا اختیار مجلس مقننہ کو ہونا چاہیئے۔ مرکزی محکمہ صرف ان قواعد کے نفاذ کا نگراں ہو اور اگر ان پر پورے طور سے عمل نہ ہوتا ہو تو وہ حسب موقع یا تو عدالت سے اپیل کریگا کہ قانون کا نفاذ کرائے یا حلقہائے انتخاب سے درخواست کرے کہ وہ ان افسران کو برخاست کردیں جنھوں نے قوانین پر ان کے اصل منشا کے مطابق عمل نہیں کیا۔ عام اصول کے لحاظ سے مجلس قانون غربا بھی سارے ملک میں محصول امداد غربا کے منتظمین پر اسی قسم کی نگرانی رکھتی ہے۔ اس سے زیادہ اختیارات مجلس جو استعمال کرتی ہے وہ اس خاص معاملہ میں نہ صرف مقامی بدنظمی کو دور کرنے کے لئے بلکہ پوری جماعت کی خاطر ضروری اور مناسب ہیں، اس لئے کہ کسی جگہ کے لوگوں کو یہ اخلاقی حق نہیں کہ وہ اپنی بدانتظامی سے اپنے علاقہ کو غربت و فلاکت کا مرکز بنالیں جسکا اثر لازمی طور پر دوسری جگھوں پر پڑتا ہے اور پوری مزدور پیشہ جماعت کی اخلاقی اور جسمانی حالت کو خراب کردیتا ہے۔ اس مجلس کو جزوی قوانین بنانے اور انتظامی امور میں جبر کرنے کا اختیار (جس کا استعمال قوم کے باعث بہت کم کیا جاتا ہے) اگرچہ ایک عام قومی مسئلہ میں بالکل درست ہے لیکن خالص مقامی معاملات میں بالکل نامناسب ہوگا۔ حکومت کے تمام شعبوں میں ہر جگہ کے لئے اطلاع اور ہدایت کا ایک مرکزی محکمہ کا ہونا اسی قدر مفید ہے۔ ہر حکومت کو ایسے اختیارات جو انفرادی آزادی اور ترقی میں بجائے رکاوٹ

پیدا کرنیکے مدد معاون ہوں جتنے زیادہ دیئے جائیں مناسب ہے۔ اصل نقصان اسوقت سے شروع ہوتا ہے جب حکومت افراد اور جماعتوں کے اختیارات اور جدوجہد کو کام میں لانیکی بجائے خود اپنے اختیارات سے کام لینے لگتی ہے، اور اکثر کاموں میں بجائے انھیں اطلاع یا ہدایت اور بعض موقعوں پر تنبیہ کرنے کے انھیں پابندیوں اور سختیوں کی زنجیروں میں جکڑ دیتی ہے یا انھیں کان پکڑ کر علیحدہ کر دیتی ہے اور خود ہی ان کا کام کر ڈالتی ہے۔ ریاست کی قدر و قیمت بہ حیثیت مجموعی اسکے افراد سے ہوتی ہے اور ایک ریاست جو ذراسی انتظامی خوبی پیدا ہونے کی خاطر جو کام کرتے کرتے خود ہی آجاتی ہے افراد کی دماغی ترقی اور وسعت کے مفاد کو نظرانداز کر دیتی ہے، ایک ریاست جو اپنے باشندوں کو دبا کر بونے بنا دیتی ہے تاکہ وہ اس کے ہاتھوں میں اطاعت شعار آلۂ کار بنے رہیں خواہ اس کی نیت نیک ہی کیوں نہ ہو، ایک دن یہ دیکھے گی کہ چھوٹے آدمیوں سے کوئی بڑا کام نہیں ہو سکتا ہے اور اس مشین کی تکمیل سے جس کے لئے اس نے سب کچھ قربان کیا ہے، وہ کوئی خاص فائدہ نہیں اٹھا سکتی ہے، اسلئے کہ اس نے اس مشین کو سہولت سے چلانے کی خاطر قوت حیات ہی کو فنا کر دیا ہے۔

بالخیر

مطبع جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی